بھارتی توپوں کا نشانہ بے علاقوں کی چشم کشا سیاحت

اُردو ڈائجسٹ

نومبر 2014ء

مسعود اوزل

دنیائے فٹ بال کا مشہور کھلاڑی

اچھی شہرت کے
سابق بیوروکریٹ
پی ٹی آئی
کی کور کمیٹی کے اہم رکن
تسنیم نورانی
کے تجربات' مشاہدات اور تصورات
کی ایک سحر انگیز داستان

گلوٹین آپ کا دشمن تو نہیں
دانہ گندم میں مخفی بیماری کا حیران کن انکشاف

فاطمہؓ کے لعل
نواسے رسول ﷺ کی زندگی کے سبق آموز واقعات

موسم جب ظالم بن جائیں
موسمیاتی تبدیلیوں سے انسان کی جان و مال خطرے میں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ کا قرآن

گناہوں کی معافی کے لیے دعا

اے ہمارے پروردگار اگر ہم سے بھول چوک ہو جائے تو تو ہمیں نہ پکڑنا۔ اے ہمارے پروردگار ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈالنا جیسا ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا۔ اے ہمارے پروردگار ہم سے وہ بوجھ نہ اٹھوانا جس کی ہم میں طاقت نہیں اور ہمارے گناہوں سے درگزر فرما اور ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم فرما تو ہی ہمارا مالک ہے اور ہم کو کافروں پر غلبہ عطا فرماO (سورۃ بقرۃ:2-286)

اے ہمارے رب ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو ہمیں نہیں بخشے گا اور ہم پر رحم نہیں کرے گا تو ہم تباہ ہو جائیں گے۔O (حضرت آدمؑ کی دعا)

رسولﷺ کا فرمان

گناہوں سے پناہ کے لیے دعا

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ یہ دعا پڑھا کرتے تھے:
"(اے میرے معبود) میں پناہ مانگتا ہوں تیرے عزت و جلال کی۔ کوئی عبادت کے لائق نہیں سوائے تیرے، جسے کبھی موت نہیں آئے گی جبکہ جن و انس سب کو موت آئے گی۔"

(بخاری کتاب 97: باب 7: مسلم کتاب الذکر۔ باب 18)

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ یہ دعا مانگا کرتے تھے۔ "اے میرے مالک! بخش دے میری خطا، میری نادانی اور میری وہ زیادتی جو میں نے خود اپنے تمام معاملات میں کی ہے جس کو تو مجھ سے زیادہ جانتا ہے۔ اے اللہ! میری غلطیاں، میرا قصد گناہ اور میری نادانی اور میری حماقت سب معاف فرما دے۔ (میں اقرار کرتا ہوں کہ) یہ سب باتیں مجھ میں ہیں۔ اے اللہ! میرے تمام اگلے اور پچھلے، پوشیدہ اور ظاہر گناہ معاف فرما دے۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔"

(بخاری کتاب 80: باب 60: مسلم کتاب الذکر۔ باب 18)

اُردو ڈائجسٹ

نومبر 2014ء
محرم الحرام 1436ھ
جلد نمبر 54 شمارہ نمبر 11

urdudigest.com www.urdudigest.pk

صدرِ مجلس: ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی
مدیرِ اعلیٰ: الطاف حسن قریشی
ایگزیکٹو ایڈیٹر: طیب اعجاز قریشی
اسسٹنٹ ایڈیٹر: سید عاصم محمود
سب ایڈیٹر: غلام سجاد
مجلس تحریر: حافظ فرخ حسن، نوید اسلام صدیقی، سلمیٰ اعوان
مہتمم طباعت: فاروق اعجاز قریشی
انچارج کمیونیکیشن: اکاؤنٹ کامران قریشی
پروف خواں: خالد محی الدین
کمپوزر: اشرف سکندر

مارکیٹنگ

ڈائریکٹر: ذکی اعجاز قریشی 0300-8460093

اشتہارات

advertisement@urdu-digest.com
منیجر ایڈورٹائزمنٹ: محمد سلیمان احمد 0300-4116792
لاہور: ندیم حامد — گوجرانوالہ: احسان اللہ بٹ
اسلام آباد: محمد سلیم — کراچی: شاذ یہ قمر 0345-2558848

سالانہ خریداری

560 روپے کی بچت کے ساتھ

subscription@urdu-digest.com — خریداری کے لیے رابطہ
119/21 کمرشیل ٹاؤن سمن آباد، لاہور — فون 92 42 37589957
پاکستان 1560 کے بجائے 1000 روپے میں اُردو ڈائجسٹ گھر بیٹھے حاصل کیجیے
بیرونِ ملک 60 امریکی ڈالر
اندرون و بیرونِ ملک کے خریدار اپنی رقم بذریعہ بینک ڈرافٹ درج ذیل اکاؤنٹ نمبر پر ارسال کریں

URDU DIGEST Current A/C No. 600380
Bank of Punjab (Samanabad, Lahore.)
Branch Code No. 110

ادارتی آفس

اپنی تحریریں اس پتے پر بھیجیں

325, G-III جوہر ٹاؤن، لاہور
فون نمبر: +92-42-35290738 • فیکس: +92-42-35290731
ای میل: editor@urdu-digest.com

قیمت 100 روپے

طابع و ناشر: ... 21، ... سے چھپوا کر ... سے شائع کیا

ایگزیکٹو ایڈیٹر نوٹ

ہم اکثر جنوبی کوریا کی معاشی ترقی کی مثال دیتے رہتے ہیں۔ کم لوگ جانتے ہیں کہ یہ ملک تعلیم کے میدان میں بھی سپرپاور بن چکا۔ مستند سروے بتاتے ہیں کہ تعلیمی معیار میں پندرہ سالہ کوریائی نوجوان امریکی نوجوان سے کہیں بہتر ہے۔ میدان تعلیم کی دوسری بڑی سپرطاقتیں چین، سنگاپور، ہانگ کانگ اور تائیوان ہیں۔ کوریا کو اس مقام تک پہنچانے میں حکومت کا عمل دخل بہت کم رہا۔ سرکاری اسکول ہمارے اسکولوں کی طرح نتائج دینے میں ناکام رہے۔ البتہ نجی اکیڈمیوں (جدید ٹیوشن سنٹرز) نے انقلاب برپا کر دیا۔

بچے دن میں سرکاری اسکولوں میں جاتے اور پھر رات نو دس بجے تک ٹیوشن سنٹر میں مطلوبہ مضامین پڑھتے ہیں۔ ان اکیڈمیوں میں اساتذہ کو طے شدہ تنخواہ دی جاتی ہے۔ جو استاد جتنی محنت کرتا اتنا ہی زیادہ کماتا ہے۔ طلبہ کی عمدہ کارکردگی ہی اس کی مقبولیت اور دولت کا ذریعہ بنتی ہے۔ کوریا میں والدین سالانہ ستر ارب ڈالر سے زیادہ بڑی رقم ان جدید اکیڈمیوں کی خدمات لینے پر خرچ کرتے ہیں۔ کئی اکیڈمیاں تو اسٹاک مارکیٹ میں رجسٹرڈ اور اربوں روپے سالانہ منافع کما رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شعبہ تعلیم میں سرمایہ کاری کے لیے دنیا کے بڑے بڑے سرمایہ کار جنوبی کوریا کا رخ کر رہے ہیں۔

جنوبی کوریا میں ہر بچہ بڑا ہو کر اُستاد بننا چاہتا ہے کیونکہ وہ اُستاد بن کر عزت کے ساتھ ساتھ بے تحاشا دولت بھی کماتا ہے۔ ان اکیڈمیوں میں استاد بننے کے لیے کسی روایتی اور مستند تعلیمی ادارے سے ڈگری یا تجربے کی قید نہیں۔ حتیٰ کہ پڑھانے کے اوقات اور طریقہ کار پر بھی کوئی بندش نہیں ہوتی۔ اساتذہ اپنا وقت لیکچرز دینے پر کم اور طلبہ سے براہ راست یا آن لائن تال میل اور انفرادی مسائل حل کرنے پر زیادہ صرف کرتے ہیں۔ یہ لیکچر طلبہ کو نہایت کم قیمت پر سی ڈی میں بھی دستیاب ہوتے ہیں۔ جیسے ہی بچہ داخل ہوتا ہے تو وہ اکیڈمی کی ذمے داری بن جاتا ہے۔ ہر روز طالب علم کی کارکردگی کی رپورٹ بذریعہ ایس ایم ایس والدین تک پہنچائی جاتی ہے۔ اکیڈمی کا سربراہ خود بھی ہر ماہ والدین سے فون پر رابطہ کرنے کا پابند ہے۔ اگر والدین اپنے بچے کی کارکردگی سے ناواقف ہوں تو اکیڈمی اسے اپنی ناکامی تصور کرتی ہے۔

دنیا کے بہت سے ممالک میں جدید اکیڈمیوں کا یہ نظام تیزی سے مقبولیت حاصل کر رہا ہے۔ لیکن نجی اکیڈمی سے بچے کو پڑھانے کے لیے والدین کو کثیر سرمایہ خرچ کرنا پڑتا ہے۔ یہ خرچ غریب والدین کے بس سے باہر ہوتا ہے۔

پاکستان میں بھی لاکھوں بچے سرکاری و نجی اسکولوں میں زیرِ تعلیم ہیں مگر ان کے والدین تعلیمی معیار اور نتائج سے مطمئن نہیں۔ اسی لیے بیشتر والدین بچوں کو ٹیوشن سینٹر بھیجنے پر مجبور ہیں جو کہ بھاری بھرکم فیس لیتے ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں درج بالا تینوں اداروں کے احتساب کا کوئی میکنزم موجود نہیں۔ جنوبی کوریا میں ہر ٹرم کے بعد طلبہ ہر استاد کی کارکردگی جانچتے اور اسے نمبر دیتے ہیں۔ اسی درجہ بندی پر استاد اور اکیڈمی دونوں کے مستقبل کا دارومدار ہوتا ہے۔ پاکستان میں بھی اسی قسم کا میکنزم شروع ہونا چاہیے تاکہ اساتذہ کی کارکردگی سبھی کے سامنے آسکے۔

تازہ ترین اخباری اطلاعات کے مطابق محکمہ تعلیم پنجاب نے سرکاری کالجز اور اسکولوں کے اساتذہ پر نجی اکیڈمیوں میں خدمات انجام دینے پر پابندی عائد کر دی ہے۔ ایسے تمام اساتذہ کے خلاف پیڈا ایکٹ کے تحت کارروائی عمل میں لائی جائے گی۔ محکمہ نے یہ فیصلہ سرکاری کالجز اور اسکولوں میں اساتذہ کی ناقص کارکردگی کے باعث کیا۔ کوریا میں ۱۹۸۰ء کی دہائی میں نجی اکیڈمیوں پر پابندی لگائی گئی لیکن مختلف وجوہات کی بنا پر ان پابندیوں کے مطلوبہ نتائج برآمد نہ ہو سکے۔ ہماری حکومتوں کو بھی کوریا اور دوسری اکیڈمک سپرپاورز کے تعلیمی نظام کا جائزہ لے کر اصلاحات کرنا ہوں گی تاکہ پاکستان بھی درست سمت میں آگے بڑھ سکے۔ تعلیم کے شعبہ میں انقلاب ہی سے نیا اور بہتر پاکستان بن سکتا ہے۔

طیب اعجاز قریشی
tayyab.aijaz@urdu-digest.com

فہرست

فہرست

اسلامی زندگی کی کہکشاں

فہرست

اُردو ادب

طب و صحت

رنگا رنگ تحریریں

مستقل سلسلے

بھارت کی شرانگیزی کا موثر جواب

نریندر مودی نے انتخابی مہم کے دوران پاکستان کے خلاف ایک جارحانہ اور دھمکی آمیز لہجہ اختیار کیا تھا' مگر وزیراعظم نواز شریف اس کی تقریب حلف وفاداری میں اس خیال سے شریک ہوئے تھے کہ معاملات کو بہتر بنانے کی سبیل نکل آئے گی' حالانکہ 'بعض بااثر قومی حلقے اس شرکت کے حق میں نہیں تھے۔ بھارت کی طرف سے یہ تاثر دیا گیا کہ وہ کشمیر کا آئین میں دیا ہوا اسپیشل اسٹیٹس ختم کر کے' اسے اپنا ایک صوبہ بنا لے گا اور پاکستان کو کشمیریوں کی حمایت سے دستبردار ہو جانا چاہیے۔ اس کے برعکس' پاکستان کی مسلسل کوشش رہی کہ مذاکرات کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو جائے اور گفت وشنید کے ذریعے دیرینہ تنازعات کا حل تلاش کر لیا جائے' مگر وزیراعظم نریندر مودی بات چیت کے دروازے بند کرتے چلے گئے اور بھارتی وزیر دفاع نے یہ دھمکی بھی دے ڈالی کہ ہم پاکستان کو سبق سکھا دیں گے۔ ان رویوں کے پیش نظر وزیراعظم پاکستان نے بڑی جرأت اور پوری فہم وفراست کے ساتھ کشمیر کا مسئلہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں اٹھایا اور بین الاقوامی برادری سے اپیل کی کہ جموں و کشمیر میں رہنے والوں کو ان کا حق خودارادیت دلانے میں اپنا کردار ادا کرے اور بھارت پر سفارتی دباؤ بڑھائے۔ اس تقریر پر بھارتی نیتاؤں کے تن بدن میں آگ لگ گئی کہ وہ اقوام متحدہ کی سکیورٹی کونسل کا مستقل ممبر بن جانے کے خواب دیکھ رہے تھے۔

بھارت نے طیش میں آ کر لائن آف کنٹرول اور ورکنگ باؤنڈری پر گولہ باری شروع کر دی جس کے نتیجے میں درجنوں سویلین شہید اور زخمی ہوئے اور متعدد فوجی بھی جام شہادت نوش کر گئے۔ یہ سلسلہ کئی ہفتے جاری رہا۔ بدقسمتی سے یہی وہ دن تھے جب اسلام آباد میں دھرنے دیے جا رہے تھے اور حکومت اپنی بقا کی جنگ لڑ رہی تھی۔ ہمارے وزیر دفاع' جو بجلی کی لوڈشیڈنگ کے معاملات میں الجھے ہوئے تھے' وہ کئی روز تک خاموش رہے۔ تب آرمی چیف جنرل راحیل شریف نے بڑی متانت اور ایمانی طاقت سے بیان دیا کہ ہم دشمن کو منہ توڑ جواب دینے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس کے بعد بھارت کی شرانگیزی میں کسی قدر کمی آئی اور دونوں طرف کے ڈائریکٹر جنرل آپریشنز کے مابین رابطے قائم ہوئے۔ پاکستان کی مسلح افواج ان دنوں دہشت گردوں کے خلاف آپریشن ضرب عضب میں ہمہ تن مصروف ہے۔ بھارت نے غالباً اس آپریشن کو ناکام بنانے کے لیے مشرقی سرحد پر چھیڑ چھاڑ شروع کی ہے۔ اسی کے ساتھ اس نے بلوچستان میں اپنی خفیہ سرگرمیاں تیز کر دی ہیں اور وہاں امن عامہ کا نہایت سنگین مسئلہ پیدا ہوتا جا رہا ہے۔ غالباً وہ یہ پیغام دینا چاہتا ہے کہ پاکستان جب کبھی کشمیر کا مسئلہ اٹھائے گا' تو بلوچستان میں نیم بغاوت کی سی کیفیت پیدا کر دی

جائے گی۔ عالمی برادری کی توجہ ہٹانے کے لیے بھارتی الیکشن کمیشن نے نومبر کے اندر مقبوضہ کشمیر میں انتخابات کا اعلان کر دیا ہے لیکن اس کے خلاف انتہائی شدید ردعمل سامنے آیا ہے۔ جموں اور کشمیر کی نمائندہ سیاسی جماعت حریت کانفرنس نے اُن کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا ہے اور حکمران جماعت نیشنل کانگریس نے بھی ایک باغیانہ رویہ اختیار کیا ہے۔

ہماری وزارت خارجہ عملی طور پر تقسیم ہے اور ہمارے مشیر خارجہ بہت زیرک ہونے کے باوجود عمر کے جس حصے میں ہیں' ان کے لیے بہت فعال رہنا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ اُن کا بڑی تاخیر سے بیان آیا ہے کہ ہم بھارت کو کشمیر پر ہاتھ صاف کرنے کی اجازت نہیں دیں گے اور عالمی برادری کو اس معاملے میں پوری طرح متحرک کریں گے۔ بلاشبہ مسئلہ کشمیر پر پاکستان کے اندر قومی اتفاق رائے پایا جاتا ہے اور سیاسی اور فوجی قیادت بھی پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ پیپلز پارٹی کے چیئرمین بلاول زرداری نے بھی کراچی کے جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے کشمیر کے مسئلے پر ایک مضبوط موقف اپنایا ہے' مگر سیاسی حالات میں غیر معمولی اُچھل پیدا ہو جانے کی وجہ سے ہمارے عوام اس بات سے پوری طرح واقف نہیں کہ بھارت نہایت عیاری سے کس کھیل میں مصروف ہے۔ اس کے تیور اچھے نہیں اور اس کی فوجی تیاریاں عروج پر ہیں۔ جدید ترین اسلحے کے انبار لگائے جا رہے ہیں اور برق رفتار محدود جنگ کی دھمکیاں بھی دی جا رہی ہیں۔

ان حالات میں پہلا کام کرنے کا یہ ہے کہ اپنا گھر درست کیا جائے۔ ہم لوگ ملک کے اندر بھی آپس میں لڑ رہے ہیں اور باہر بھی۔ لندن میں کشمیریوں کے حق میں جو ملین مارچ ہوا' وہ عالمی سطح پر بہت بڑی پیش رفت ہے۔ اس احتجاج میں پورے انگلستان سے کشمیری آئے تھے اور یورپین پارلیمان کے ارکان بھی شامل ہوئے تھے۔ اس کی قیادت بیرسٹر سلطان کر رہے تھے۔ اس طرح مسئلہ کشمیر بین الاقوامی اہمیت اختیار کرتا جا رہا ہے' مگر اس احتجاجی مارچ میں پاکستان کی دو سیاسی جماعتیں ایک دوسرے کے مدمقابل آن کھڑی ہوئیں جس سے کشمیر کاز کو وقتی طور پر نقصان پہنچا ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ قوم کو اپنی مسلح افواج کی بھرپور حمایت کرنے اور شمالی وزیرستان کے آئی ڈی پیز کی دیکھ بھال پر خصوصی توجہ کا مظاہرہ کرتے رہنا چاہیے۔ اس کے علاوہ ہمارے دفتر خارجہ کو بہت فعال ہونے کی اشد ضرورت ہے اور اسے سکیورٹی کونسل کے مستقل ارکان ملکوں میں سفارتی سرگرمیاں تیز کر دینی چاہئیں۔ پاکستان کے اندر بھی سیمیناروں کے ذریعے بھارت کی شرانگیزی کے خلاف ٹھوس بنیادوں پر رائے عامہ منظم کی جائے اور بھارت کی طرف دیکھنے کے بجائے اپنے اندر جھانکنے کی حکمت عملی اپنائی جائے۔ اور عالمی برادری میں اپنا امیج منوانے کی منصوبہ بندی کی جائے اور بلوچستان کے معاملات میں زیادہ سے زیادہ بہتری لانے کے لیے صوبائی خودمختاری کو اور مقامی انتظامات کے ذریعے فروغ دیا جائے۔ اس ضمن میں کشمیر پر ایک قومی کانفرنس منعقد کرنے کی بھی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔

الطاف حسن قریشی

الطاف حسن قریشی

وہ ہمارے بھائیوں اور بہنوں میں سب سے بڑے تھے' اس لیے ہم سب انہیں "بھائی جی" کہتے تھے' بلکہ ہمارے پوتے اور نواسے بھی یہی الفاظ ہمارے منہ سے بار بار سنتے سنتے انہیں بھائی جی ہی کہنے لگے تھے۔ وہ ۹۶ سال کی عمر میں ۴ ستمبر ۲۰۱۴ء کو اس دار فانی سے کوچ کر گئے انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اُن کا نام گل حسن تھا اور اُن کی زندگی شرافت' دیانت' محنت اور بے پایاں محبت و شفقت اور مزاج میں بشاشت کا ایک حسین مرقع تھی۔ ہمارے والد محترم جناب شیخ عبدالغفار محکمۂ انہار میں پٹواری تھے جن کی آمدنی خاصی محدود تھی۔ ہماری والدہ فردوس بیگم اور والد صاحب کا ایک ہی خاندان تھا جو لوگوں کو قرآن کی تعلیم دینے اور اپنے رب کی عبادت کرنے میں شب و روز مصروف رہتا تھا۔ ان میں فقر کی ایک شان پائی جاتی تھی۔ گل حسن صاحب والدین کی پہلی نرینہ اولاد تھے۔ وہ ۱۹۱۸ء کے لگ بھگ ضلع کرنال کے ایک چھوٹے سے قصبے ہاڑی میں پیدا ہوئے۔ یہ مسلمان راجپوتوں کا علاقہ تھا جہاں ایک مزار بھی آباد تھا۔ ہماری سب سے چھوٹی بہن محبوبہ بیگم کے سوا باقی تمام بہن بھائیوں کی ولادت اسی قصبے میں ہوئی۔ ہمارے والد یہاں بیس برس کے لگ بھگ رہے تھے۔

کرنال صوبہ پنجاب کا ایک ضلع تھا۔ اس کی اہمیت یہ تھی کہ پاکستان کے پہلے وزیراعظم نوابزادہ لیاقت علی خاں کا تعلق اسی علاقے سے تھا۔ اس ضلع کی ایک تحصیل پانی پت کے حفاظ پورے ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے اور اُن کی قرأت میں

ایک خاص جاذبیت پائی جاتی تھی۔ ۱۹۳۰ء میں والد صاحب تبدیل ہو کر سرسے آ گئے جو پنجاب کے ضلع حصار کی ایک تحصیل تھی۔ تحصیل میں تو مسلمانوں کی اکثریت تھی' مگر شہر کے اندر وہ اقلیت میں تھے۔ ہماری والدہ صاحبہ جن کو اللہ تعالیٰ نے بڑی دانائی اور قوتِ ارادی عطا کی تھی' اُنہوں نے اس شہر میں مستقل سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ تبادلوں کی وجہ سے اُن کی اولاد کی تعلیم و تربیت میں کوئی خلل نہ پڑے۔ انہوں نے قلیل آمدنی میں سے کچھ رقم جمع کر لی تھی' چنانچہ فوری اپنا گھر تعمیر کرنے کا نقشہ بنایا۔ میرے بھائی گل حسن اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے گارا گوندتے اور پھر میری بہن انوری بیگم اُسے والدہ تک پہنچاتی جو پکی اینٹوں سے دیواریں اُٹھاتی چلی جاتی تھیں۔ سات آٹھ ماہ کی مشقت سے تقریباً ایک کنال کا گھر تیار ہو گیا جس میں چار کمرے اور ایک بڑا برآمدہ تھا۔ بھائی جی ہمیں اس گھر کی تعمیر کے واقعات بڑی تفصیل سے اکثر سنایا کرتے تھے کیونکہ وہ اُن کے لڑکپن کا ایک ناقابلِ فراموش تجربہ تھا جو اُن کے تحت الشعور کا حصہ بن چکا تھا۔

بھائی جی نے گورنمنٹ ہائی اسکول سرسے سے ۱۹۳۴ء میں دسویں جماعت کا امتحان پاس کیا۔ اُن کے ہم جماعتوں میں جناب اسلم خاں بھی تھے جن سے بعد میں میرے کلاس فیلو محمد یقین کی ہمشیرہ بیاہی گئی تھیں۔ آج ڈاکٹر یقین پاکستان کے ایک نہایت معروف آئی سرجن ہیں۔ میٹرک پاس کر لینے کے بعد بھائی جی کو عملی زندگی شروع کرنے کا سخت مرحلہ پیش آیا۔ والد صاحب کی خواہش تھی کہ وہ طبیب بنیں کیونکہ حکمت اُن دنوں درمیانے طبقے کے لیے ایک معزز پیشہ تھا' چنانچہ بھائی جی طبیہ کالج دہلی میں داخل کرا دیے گئے' مگر اُن کے مزاج کو وہ تعلیم راس نہ آئی اور اُسے درمیان ہی میں چھوڑ کر وہ گھر چلے آئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانوں کے لیے سرکاری ملازمت کا حصول بہت مشکل تھا۔ انگریز اُن کے حقوق کا اس لیے خیال نہ رکھتے کہ اُن کے مذہبی جوش و خروش سے خائف تھے اور ہندو اکثریت برطانوی راج سے زیادہ سے زیادہ مراعات اور حکومتی مشینری میں غلبہ حاصل کر لینے کے لیے مسلمانوں کو آگے آنے کا موقع بہت کم دیتے۔ ایک میٹرک پاس مسلمان طالب علم کے لیے کلرک بلکہ چپراسی کی ملازمت بھی کچھ سہل نہیں تھی۔

بڑے سوچ بچار کے بعد بھائی جی نے اپنے تایازاد بھائی جناب عبدالسلام کے پاس لدھیانے جانے کا فیصلہ کیا جو ایک زمانے میں محکمۂ انہار میں سگنیلر بھرتی ہوئے تھے۔ بھائی جی ٹیلی گرافی سیکھنے شبراتن کے پاس چلے گئے جو کوئی دو سو میل دور واقع تھا۔ یہ کام سیکھ لینے کے بعد بھی وہ کئی ماہ بیکار رہے اور اُن کی چھ ماہ کے لیے عارضی پوسٹنگ موجو کھیڑہ میں ہوئی جہاں دریائے گھاگھرا کے اوپر اوٹو کے مقام پر ایک بند تعمیر کیا گیا تھا جہاں سے وہ نہریں نکلتی تھیں جو ریاست بیکانیر کو سیراب کرتی تھیں۔ یہ وہی دریائے گھاگھرا ہے جو پاکستان کے چولستان میں آ کر ختم ہو جاتا ہے۔ پانی کے بہاؤ کی پنسال بھیجنے کے لیے وہاں ایک تار گھر تھا جہاں سے ٹیلی گرافی کے ذریعے پیغامات دیے جاتے تھے۔ چھ ماہ کے بعد بھائی جی بے روزگار ہو گئے اور ملازمت کے لیے روز دھوپ کرتے رہے۔ انہی دنوں اس علاقے میں سالہا سال سے بارشیں نہ ہونے کے باعث قحط پڑا۔ حکومت نے روزگار کے مواقع پیدا کرنے کے لیے سرسے اور حصار کے درمیان سڑک تعمیر کرنے کا اعلان کیا۔ بھائی جی اس نئی فورس میں بھرتی ہو گئے۔ اُنہوں نے سخت موسموں کے اندر تین سال چھولداریوں میں گزارے۔ بعد ازاں مستقل سگنیلر کی حیثیت سے اُن کی پہلی تعیناتی جمن غربی نہر کے کرنال ڈویژن میں ہوئی۔ اُن کے وہاں سے مختلف مقامات پر تبادلے ہوتے رہے۔

کوئی پانچ سال بعد اُنہیں احساس ہوا کہ سگنیلر ساری عمر سگنیلر ہی رہتا ہے' کیونکہ اس پر ترقی کے دروازے بند ہیں' چنانچہ وہ کلرکی کا امتحان دینے دہلی گئے جو جمن غربی سرکل کا ہیڈکوارٹر تھا۔ امتحان میں کامیابی اور ترقی پانے کے بعد اُن کی تعیناتی حصار شہر میں ہو گئی جو انبالہ ڈویژن کا ایک ضلع تھا۔ اسی شہر میں ہمارے ماموں جناب خلیق احمد رہتے تھے۔ اُن کی صاحبزادی شکیلہ سے بھائی جی کی شادی ہوئی۔ ہندوستان تقسیم ہوا' تو اُنہوں نے پاکستان کا آپشن دیا اور اُن کی تعیناتی اری گیشن ریسرچ انسٹی ٹیوٹ لاہور میں ہو گئی جس کے باعث اُنہیں گورنمنٹ چوبرجی کوارٹرز میں رہائش ملی۔ ہمارا پورا خاندان جب سرسے سے پاکستان آیا' تو ہم نے ۲۴۔ڈی میں قیام کیا تھا۔

بھائی جی محکمے میں ترقی پانے کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔ اُنہوں نے سب ڈویژنل کلرک کا امتحان پاس کیا اور اُن کی تقرری لاہور سے باہر ہو گئی۔ دیانت داری اور فرض شناسی سے کام کرنے کی بدولت وہ ترقی پا کر اکاؤنٹس کلرک بن گئے اور اس پورے عرصے میں اپنے بھائیوں کی اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں اُن کے ساتھ مالی تعاون کرتے رہے۔ پھر اُن کی زندگی میں ایک سخت مقام آیا۔ اُردو ڈائجسٹ کے اجرا کو پانچ سات سال ہو چکے تھے اور اسے ایک نہایت قابل اور ذمے دار اکاؤنٹنٹ کی ضرورت تھی۔ بھائی جی سے اس مسئلے پر بات ہوئی' تو اُنہوں نے کسی تامل کے بغیر سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہونے کا فیصلہ کر لیا اور وہ ۱۹۸۰ء تک اُردو ڈائجسٹ کی بے مثال خدمت سرانجام دیتے رہے۔ حسابات اس قدر شفاف رکھے کہ بھٹو دورِ حکومت میں ہمیں قانون کی گرفت میں لانے کی سرتوڑ کوششیں ہوئیں اور انکم ٹیکس کے ایک اعلیٰ افسر اس ادارے کے خلاف مقدمات بنانے کے لیے خاص طور پر تعینات کیے گئے' لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے وہ ہمارے حسابات میں ایک بھی قابلِ گرفت نکتہ تلاش نہ کر سکے۔ بھائی جی ایک ایک پائی کا حساب رکھتے اور حددرجہ کفایت شعاری سے کام لیتے تھے۔ بلاشبہ وہ اُردو ڈائجسٹ کو اپنا خونِ جگر پلاتے اور عملے کے ساتھ بڑی کشادہ پیشانی سے پیش آتے رہے۔ اُن کی ایثار پیشہ اور بالغ نظر شخصیت نے ہمیں بہت ساری بلاؤں سے محفوظ رکھا۔ محکمۂ انہار سے وہ اپنے ساتھ ایک قابلِ اعتماد اور انتہائی زیرک اکاؤنٹس کلرک جناب سیٹھی کو بھی لے آئے تھے۔ اِن دونوں اصحاب نے مل کر اس ماہنامے کی مالیاتی بنیادیں اس قدر مضبوط اُٹھائیں کہ وہ آگے چل کر ہفت روزہ "زندگی" اور روزنامہ "جسارت" ملتان کا بار بھی برداشت کر گیا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے بھائی جی کو بے پایاں صلاحیتوں اور خوبیوں سے نوازا تھا۔ خاندانی رشتوں کی قدر و قیمت کا اُنہیں بہت پاس تھا۔ اُن کی پہلی شادی اپنے ماموں کے ہاں ہوئی تھی اور اُن کی اہلیہ آٹھ دس برس بعد بیمار رہنے لگی تھیں' مگر اُنہوں نے آزمائش کا یہ پورا عرصہ غیر معمولی تحمل اور خوش اخلاقی کے ساتھ گزارا۔ اُن کے سسرال میں بڑوں سے لے کر چھوٹوں تک سب اُن کے حسنِ اخلاق کی تعریف کرتے اور اُن کا نام بڑے احترام سے لیتے تھے۔ اُن کی دوسری شادی ساہیوال میں جناب شیخ محمد اسحٰق کی صاحبزادی سعیدہ بیگم سے ہوئی اور دونوں نے ایک مثالی عائلی زندگی بسر کی۔ اُن دونوں میاں بیوی نے ہماری والدہ اور ہمارے والد صاحب کی اِس طرح خدمت کی جو ایثار اور فرماں برداری کی ایک اعلیٰ مثال بن گئی۔ والدہ صاحبہ پر فالج کا حملہ ہوا اور وہ کئی سال اِس حالت میں رہی تھیں۔ بھابی سعیدہ نے دن رات بڑی خندہ پیشانی سے اُن کی تیمارداری کی۔ اسی طرح والد صاحب بھی کئی سال تک بسترِ علالت پر رہے۔ آخری برسوں میں اچھرے کے اُس گھر میں منتقل ہو گئے تھے جو سرسے کے گھر کے عوض ۱۹۷۵ء کے آخر تک اُن کی تحویل میں آیا۔ بھائی جی اور اُن کی

اہلیہ نے والد صاحب کی جس طرح رات دن تیمارداری اور خبرگیری کی' اُس کی نظیر بھی کم ہی ملتی ہے۔

والد صاحب کا انتقال ستمبر ۱۹۷۷ء میں ہوا تو بھائی جی کو یہ احساس دامن گیر ہو گیا کہ والد صاحب اِس گھر کی نگہبانی مجھ پر چھوڑ کر گئے ہیں' چنانچہ وہ پانچ مرلے کے اِس چھوٹے سے مکان میں ۳۸ سال تک رہے اور اِس کی دیکھ بھال اور مرمت کی ذمے داری اپنی بساط کی حد تک ادا کرتے رہے۔ بعد میں ہمارے دوسرے بھائی حافظ افروغ حسن بھی گلشن پور، ہائی اسکول کی ۲۶ سال خدمت کرنے کے بعد ریٹائر ہو کر اِس گھر کے بالائی حصے میں اقامت پذیر ہوئے۔ اپنے انتقال سے آٹھ دس ماہ پہلے بھائی جی نے خواب میں ایک خوبصورت اور پُرفضا مکان دیکھا۔ اِس خواب کے چند ہی روز بعد بھابی سعیدہ کو دل کی تکلیف ہوئی اور اُنہیں ہسپتال لے جانا بہت دشوار ہو گیا' کیونکہ اچھرے کی وہ آبادی بڑی گنجان ہے جہاں یہ گھر واقع ہے۔ اِسی روز بھائی جی نے وہاں سے منتقل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ اللہ کی قدرت دیکھیے کہ اُنہیں ویسٹ وڈ کے کشادہ علاقے میں کرائے پر وہی مکان مل گیا جو اُنہوں نے خواب میں دیکھا تھا۔ اِس مکان میں بھائی جی کوئی سات آٹھ ماہ رہے اور پھر مختصر سی علالت کے بعد اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ اللہ تعالیٰ اُن پر اپنی رحمتوں کی بارش کرتا اور اُن کی قبر کو نور سے بھرتا رہے!

والدین کے علاوہ بھائی جی کا اپنے بھائیوں' بہنوں' بہنویوں اور بھتیجوں' بھتیجیوں' بھانجوں' بھانجیوں اور خاندان کے تمام رشتے داروں کے ساتھ کامل شفقت اور گہری اپنائیت کا تعلق فروغ پاتا رہا۔ میری اہلیہ ریحانہ کا جب دسمبر ۱۹۷۰ء میں انتقال ہوا' تو میری بیٹی قرطبہ دو سال اور بیٹا کامران کوئی آٹھ سال کا تھا۔ اُن کی پرورش بھابی سعیدہ نے کی جو ریحانہ مرحومہ کی خالہ زاد بہن تھیں۔ بھائی گل حسن اولاد کی نعمت سے محروم رہے' لیکن اُنہوں نے اپنے بھتیجوں' بھانجوں' بھتیجیوں اور بھانجیوں کو اپنی اولاد سمجھا اور اُن کے درمیان اپنی شفقت اور اپنی دعائیں تقسیم کرتے رہے۔ میری بیٹی قرطبہ اور اُس کے شوہر عزیزم مظہر احمد سعید اُن کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ خاندان کے متعدد لڑکے اور لڑکیاں اعلیٰ تعلیم کے لیے اُن کے گھر میں کئی کئی سال قیام کرتے۔ بھائی جی اور بھابی سعیدہ کے دل بہت بڑے اور محبت اور شفقت سے بھرے ہوئے تھے۔ اُردو ڈائجسٹ کا دفتر سمن آباد جس عمارت میں واقع تھا' اُس کی بالائی منزل میں میرے بڑے بھائی اعجاز حسن قریشی کی فیملی رہتی تھی۔ بھائی جی نے اُردو ڈائجسٹ میں سالہا سال کام کیا تھا اور ہم تینوں بھائی دوپہر کا کھانا اوپر ہی کھاتے اور بھابی رضیہ کی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہوتے۔ اصل میں اِس عظیم خاتون کا اردو ڈائجسٹ کے اجرا اور نشوونما میں بہت بڑا کردار تھا۔ اِس لیے بھائی جی اُن کے بیٹوں اور بیٹیوں سے گہری اُنسیت رکھتے جو ابھی تعلیم و تدریس کے مختلف مراحل سے گزر رہے تھے۔ وہ بڑے ہوئے تو فاروق' خالد' قاسم' سعادت' طیب' رومی اور زمرد اُن کے دست بازو ثابت ہوئے۔ ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی کے دوسری اولاد کا بھی یہی عالم تھا جو بھابی کنیز کے بطن سے تھیں۔ اِسی طرح ہماری بہن اکبری بیگم اور چھوٹی بہن محبوبہ بیگم کے بیٹے اور بیٹیاں اُن پر جان چھڑکتی تھیں۔ اسلام آباد سے ارتضا اور ریضان ملنے کو آ جاتے اور اُن کے ساتھ وقت گزارتے۔ ہماری مرحومہ بہن انوری بیگم کے نیاز بیگ اور اخلاق بیگ بھی اُن سے جڑے رہتے تھے۔ بھائی جی اپنے بہنوئی ضیاء الرحمٰن اور شیخ عبدالحفیظ کا بڑا احترام کرتے۔ ضیاء الرحمٰن تو پورے ایک عشرے اردو ڈائجسٹ کے جنرل منیجر کے طور پر کام کرتے رہے تھے۔ ہر ایک کو "میرے یار" کہہ کر مخاطب ہوتے جو اُن کا تکیہ

کلام تھا اور بے تکلفی کا مظہر تھا۔ بھابی سعیدہ کے بھائی بہن ساہیوال سے ملنے آتے رہتے تھے۔ اِس طرح گھر میں رونق لگی رہتی۔ میری دوسری شادی نومبر ۱۹۷۴ء میں جناب غازی خدا بخش کی صاحبزادی شاہدہ بیگم سے ہوئی۔ غازی صاحب نے جہادِ کشمیر میں حصہ لیا تھا اور ہجرت کی تحریک میں وہ اپنے بڑے بھائی حاجی نور احمد کے ہمراہ افغانستان کے راستے روس گئے تھے۔ وہ مولانا احمد علی لاہوری کے پیروکاروں میں سے تھے اور ماہنامہ "نونہال" نکالتے تھے۔ میری اِسی شادی کا ایک قابلِ ذکر پہلو یہ تھا کہ بارات میں جناب اے کے بروہی اور سردار شیر باز خان مزاری شامل ہوئے تھے اور ولیمے کی دعوت میں بہت سارے دوستوں کے علاوہ چودھری ظہور الٰہی آئے تھے جنھیں واپس جاتے ہوئے گرفتار کر کے بلوچستان کی سب سے خطرناک جیل مچھ میں بھیج دیا گیا تھا۔ میری اہلیہ بھائی جی سے اکثر ملنے جاتیں' تو وہ بہت خوشی اور گہری اپنائیت کا اظہار کرتے۔ اِسی طرح میری بہو نبیلہ تبسم اُن سے ملنے جاتیں' تو اکثر بتاتی کہ بھائی جی کی ہلکی پھلکی باتوں سے ایک عجب قسم کی سرشاری اور تازگی محسوس ہوتی ہے۔ یہ اُن کی اچھی صحت اور لمبی عمر کا سب سے بڑا راز تھا۔

اللہ تعالیٰ نے بھائی جی پر ایسی خاص عنایت فرمائی تھی کہ اُن کی ہر ضرورت اور خواہش پوری ہو جاتی۔ اُن کی پرورش تو ایک غریب گھرانے میں ہوئی تھی' مگر اُن کا ذوق بہت ستھرا اور اعلیٰ تھا۔ وہ اچھا لباس پہنتے اور اِس کی صفائی ستھرائی کا خیال رکھتے۔ دن کے وقت آرام کرتے' تو کپڑے بدل لیتے' رات کے سونے کا لباس بھی اُن کا الگ ہوتا تھا۔ نماز کے کپڑے بھی اُن کے علیحدہ تھے۔ یہی عالم اُن کے کھانے پینے کے آداب کا تھا۔ صبح سات بجے ناشتا کرتے' گیارہ بجے چائے پیتے' ٹھیک ڈیڑھ بجے کھانا کھاتے اور مقررہ وقت پر شام کی چائے پیتے اور آٹھ بجے عشائیہ کھا لیتے۔ میز استعمال کرتے اور اُن کی خواہش ہوتی کہ ہر شے قرینے سے استعمال کی جائے۔ وہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتے تھے اور اِس بات کے قائل تھے کہ ایک متوسط گھرانا سلیقے اور قرینے ہی سے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے شادکام ہو سکتا ہے۔ وہ ہمارے لیے ایک رول ماڈل کی حیثیت رکھتے تھے کہ اُن کی عادات و اطوار میں بڑا توازن تھا اور اُن کے مزاج میں باقاعدگی اور خوش مزاجی غالب تھی۔ وہ خود بھی خوش رہتے اور ملنے والوں میں بھی خوشیاں بانٹتے رہتے۔ آخری چند برسوں میں اُن کی بینائی جاتی رہی تھی اور وہ ٹی وی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ کہیں آنا جانا بھی دشوار ہو گیا تھا' مگر دل شکستہ ہونے کے بجائے بھائی جی نے وقت کو ہنسی خوشی گزارنے کے طریقے اپنائے۔ اُنہیں تین پاروں کے لگ بھگ قرآن حفظ تھا۔ وہ صبح سویرے سورتوں کی تلاوت کرتے' ناشتے کے بعد کئی گھنٹے ریڈیو سنتے۔ اِس پر قرآن کا درس بھی ہوتا' حالاتِ حاضرہ کے تجزیے بھی' نئے اور پرانے گانے بھی' ڈاکٹروں اور حکیموں کی صحت کے بارے میں نہایت کارآمد باتیں بھی۔ پھر اُن پر اہلِ خانہ سے تبادلۂ خیال کرتے۔ بھائی حافظ افروغ حسن کو ماضی کے واقعات سناتے اور روزمرہ واقعات پر گفتگو کرتے۔ ملنے والے آ جاتے' تو اُن کے ساتھ ہنسی مذاق بھی کر لیتے۔ بیٹی قرطبہ سے پوچھتے آج کیا پکانا ہے اور اِن دنوں کپڑوں کا کیا فیشن چل رہا ہے۔ اُن کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ گھر کے ماحول کو ہلکا پھلکا خوشگوار اور پُرلطف رکھتے اور چھوٹی چھوٹی خوشیاں تخلیق کرتے رہتے۔

اُن کی اچھی صحت کا راز بھی یہی تھا کہ وہ خوش باش رہتے اور لمبی سیر کرتے تھے۔ والی بال کھیلنے کا شوق تو اُنہیں زمانۂ طالب علمی ہی سے تھا اور باقاعدہ ورزش اُن کی زندگی کے معمولات میں شامل تھی۔ وہ جب اچھرے والے گھر میں آ گئے' تو صبح کی سیر کا سلسلہ جاری رکھا۔ وہ فجر کی نماز شادمان کی مسجد میں ادا کرتے اور یہ سلسلہ آنکھوں کی بینائی جانے تک قائم رہا۔

صبح کی سیر کرنے والوں کا ایک حلقہ بن گیا تھا جس میں میرے بھانجے حافظ عبدالرؤف کے سسر جناب برکت علی لُوتا بھی شامل تھے۔ اُنھیں بچپن ہی سے گھر کے کام کاج کرنے اور اپنے فرائض محنت سے ادا کرنے کی عادت پڑ گئی تھی' اِس لیے وہ آخری وقت تک جسمانی لحاظ سے تندرست اور توانا رہے۔ قدرت نے اُنھیں زبردست قوت برداشت عطا کی تھی۔ وہ اپنے بھتیجوں اور بھانجوں سے اکثر کہتے کہ میں اپنے آپ کو بالکل "فٹ" محسوس کرتا ہوں۔ اُنھیں گاہے گاہے کھانسی کی شکایت ہو جاتی جو دوائی کے استعمال سے رفع ہو جاتی تھی۔ وہ جب ویسٹ وڈ کے مکان میں منتقل ہوئے اور صبح کے وقت قرآن کی تلاوت لان میں بیٹھ کر کرتے تو پڑوس کے مکین اُن کی تلاوت سننے دیوار کے قریب آ جاتے۔ پھر ایک سہ پہر اُنھوں نے بھابی سعیدہ سے کہا کہ مجھے سانس لینے میں دقت محسوس ہو رہی ہے۔ خیال گزرا کہ شاید دل کی تکلیف کے باعث ایسا ہو رہا ہو' چنانچہ اُنھیں فاروق ہسپتال لے جایا گیا۔ وہاں میرے نہایت عزیز دوست جناب ڈاکٹر مسعود نے اُن کا تفصیلی معائنہ کیا اور ٹیسٹ کرائے۔ دو ڈھائی گھنٹے کی ایکسرسائز کے بعد اُنھوں نے مبارک باد دی کہ الحمدللہ اُنھیں دل کا کوئی عارضہ نہیں۔ طیب' کامران اور مظہر اُنھیں گھر لے آئے' مگر بھائی جی کی سانس لینے میں لحہ بہ لحہ تکلیف بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر اُنھیں ڈاکٹرز ہسپتال میں داخل کرا لیا گیا۔ مختلف ٹیسٹوں کے بعد معلوم ہوا کہ اُنھیں انتڑیوں کی ٹی بی ہے اور پوسٹریٹ میں سرطان کے اجزا پائے گئے ہیں۔ وہ پندرہ روز ہسپتال میں رہے اور کڑی آزمائشوں کے باوجود اُن کی زبان پر کوئی حرف شکایت آیا نہ اُن کے کراہنے کی آواز سنی گئی۔ ایک بار ڈاکٹر صاحب نے اُن سے کہا کہ ہمیں آپ کا ٹیسٹ لیتے ہوئے خوف محسوس ہو رہا تھا کہ شاید آپ برداشت نہ کر سکیں تو بھائی جی نے بلند آواز میں اپنا ہاتھ اُٹھا کر کہا کہ "جو ہوا سو ہوا"۔ آخری دن تک اُن کا دماغ صحیح طور پر کام کرتا رہا۔ پھر وہ بڑے سکون سے موت کی آغوش میں چلے گئے اور ہم سب کو سوگوار چھوڑ گئے۔ اُن کے چلے جانے سے بہت بڑا خلا محسوس ہو رہا ہے اور یوں لگتا ہے کہ ہم شجرِ سایہ دار کی گھنی چھاؤں سے محروم ہو گئے ہیں' مگر اُنھوں نے جس وقار اور جس سج دھج سے زندگی گزاری' وہ ہمیں صبر کی تلقین کرتی اور اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کا حوصلہ دیتی ہے۔

بھائی جی کی اصل طاقت اُن کا دین کے ساتھ گہرا لگاؤ اور اسلامی تعلیمات کے مطابق اپنی زندگی بسر کرنا تھی۔ اُنھوں نے اپنے والدین کو باقاعدگی سے تہجد پڑھتے دیکھا تھا' اِس لیے وہ بھی جوانی ہی سے تہجد پڑھنے کا اہتمام کرتے تھے۔ پانچ وقت کی نماز کی ادائیگی میں وہ تساہل سے کام نہیں لیتے تھے۔ نماز اُن کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی اور یہی وجہ ہے کہ اپنی بیماری کے دنوں میں بھی وہ اشاروں سے نماز ادا کرتے رہے۔ فاروق ہسپتال سے عشا کے وقت واپس آئے' تو اپنی اہلیہ سے کہنے لگے کہ تھکان بہت ہو گئی ہے اور عشا کی نماز پڑھنا مشکل محسوس ہو رہا ہے۔ بھابی سعیدہ نے کہا کہ اب آرام کر لیجیے اور تہجد کے وقت پڑھ لیجیے گا۔ بھائی جی نے کچھ دیر آرام کیا' مگر قدرے بے چین رہے۔ اُٹھے' وضو کیا' نماز ادا کی اور کہا اب سکون آیا ہے۔

ایک زمانے میں مولانا نصراللہ خان عزیز سمن آباد ہی میں سکونت پذیر تھے۔ وہ باقاعدگی سے صبح کی سیر کرتے اور اس چہل قدمی میں بھائی جی بھی شامل ہو جاتے۔ مولانا عظیم شاعر اور عظیم صحافی ہونے کے علاوہ ایک بہت بڑی روحانی شخصیت بھی تھے۔ وہ سیر کے دوران قرآن کی تلاوت کرتے رہتے تھے۔ بھائی جی نے اُن سے کہا کہ آپ مجھے

بھی قرآن کی اُن سورتوں کی نشاندہی فرما دیں جن کی تلاوت سے تزکیہ نفس بھی ہوتا رہے اور اپنے رب کے ساتھ تعلق بھی گہرا ہوتا جائے۔ اُنھوں نے سورہ رحمٰن' سورہ یٰسین اور سورہ مزمل کے علاوہ سورہ واقعہ اور سورہ الملک کا خاص طور پر ذکر کیا۔ بھائی جی نے وہ تمام سورتیں حفظ کر لیں اور وہ دفتری کام کے دوران بھی اُن کی تلاوت اور درود شریف کا ورد کرتے رہتے تھے اور بڑی آسودگی محسوس کرتے تھے۔

ہمارے دین میں خونی رشتوں کا احترام اور اُن کے مابین اچھے تعلقات بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ بھائی جی نے اپنے حُسنِ اخلاق سے اِن رشتوں کو مستحکم کیا اور ہر فرد کی خوبی اور صلاحیت کی دل کھول کر تعریف اور حوصلہ افزائی کی۔ اسی طرح وہ نہایت خاموشی سے غریبوں' ناداروں اور ضرورت مندوں کی مدد کرتے رہتے اور کہا کرتے تھے کہ اپنے لیے تو سب جیتے ہیں' مگر اسلام ہمیں دوسروں کے لیے جینا سکھاتا ہے۔ صفائی' ستھرائی اور پاکیزگی کا تصور بھی اُنھوں نے اسلام ہی سے لیا تھا اور اُن کی خوش مزاجی میں بھی میرے رسول ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی اتباع کا دخل تھا۔ ہم نے کبھی اُنھیں اونچی آواز سے بولتے نہیں سنا۔ وہ ایک وضع دار' انتہائی ملنسار اور حلیم الطبع انسان تھے جو برسوں یاد رکھے جائیں گے کہ اُنھوں نے فقیری میں بادشاہی کی اور ثابت کر دیا کہ گھر کو خوشیوں اور برکتوں کا گہوارہ بنایا جا سکتا ہے۔ ◆◆◆

صغیرہ آپا کی یاد میں

۱۹۹۹ء میں جب راقم ادارہ اردو ڈائجسٹ کا حصہ بنا، تو ایک دن دفتر میں صغیرہ بانو شیریں صاحبہ سے ملاقات ہوئی۔ چمکتی آنکھیں، مسکراتے ہونٹ اور محبت آمیز گفتگو نے دل موہ لیا۔ آپ اردو ڈائجسٹ میں "مشورہ حاضر ہے" تحریر کرتی تھیں۔

جلد منکشف ہوا کہ قارئین میں یہ سلسلہ بہت مقبول ہے۔ وجہ یہی ہے کہ صغیرہ آپا اس میں نہایت مفید طبی و گھریلو مشورے دیتیں جن سے مسائل میں گرفتار افراد کے علاوہ بھی قارئین مستفید ہوتے۔ یہ سلسلہ دراصل مصیبت میں مبتلا انسانوں کی مدد کرنے کا نادر طریق کار تھا۔ اسی لیے اسے جاری کرنے پر دنیا بھر سے لاکھوں مرد و زن نے اردو ڈائجسٹ اور صغیرہ آپا کو داد و تحسین سے نوازا۔

صغیرہ آپا دفتر تشریف لاتیں، تو بیشتر وقت استاد محترم ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی کی معیت میں گزارتیں۔ کبھی موڈ میں ہوتیں، تو راقم کو بھی اپنے انوکھے تجربات زندگی سے آگاہ کرتیں۔ دوسروں کی مدد کرنے کا جذبہ ان میں فطرتاً موجود تھا۔ کسی کو لاچار و بے بس پاتیں، تو اسے تسلی دلاسا دینے پشاور جیسے اور دور دراز اور اجنبی شہر بھی پہنچ جاتیں۔

افسوس کہ یکم اکتوبر کو یہ شفیق ہستی اپنے رب کے حضور پہنچ گئیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کے درجات بلند فرمائے اور انھیں جنت الفردوس میں جگہ عطا کرے۔ (آمین)

صغیرہ بانو شیریں اردو کے صاحب طرز ادیب، ملا واحدی کی نواسی تھیں۔ دہلی سے تعلق ہونے کے باعث اردو گھر کی لونڈی تھی اور لکھنا پڑھنا جیسے خمیر میں شامل تھا۔ آپ نے بچوں کی کہانیاں لکھیں اور خواتین کے موضوعات پر بھی قلم اٹھایا۔ روحانیت سے بھی دلچسپی تھی۔ تاہم آپ کی مقبول ترین میراث "مشورہ حاضر ہے" ہی ہے جو کئی برس باقاعدگی سے اردو ڈائجسٹ میں شائع ہوتا رہا۔ اسے "گھریلو و طبی مشوروں کا انسائیکلوپیڈیا" کہا جائے، تو بے جا نہ ہوگا۔

امید ہے، اس سلسلے میں دیے گئے کئی صد مشورے آنے والے دنوں میں بھی پریشان حال مرد و زن کی راہنمائی و مدد کرتے رہیں گے۔ گویا یہ قلمی سلسلہ ایسا انمول صدقہ جاریہ ہے جو سدا صغیرہ آپا کی یاد ہمارے دلوں میں بھی تازہ رکھے گا۔ (سید عاصم محمود)

اچھی شہرت کے حامل سابق بیوروکریٹ
پی ٹی آئی کی کور کمیٹی کے بیدار مغز رکن

تسنیم نورانی

اپنے تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں
معاشی مشکلات' داخلی سلامتی کے چیلنجز' توانائی کے بحران
اور پبلک ٹرانسپورٹ کے بارے میں اپنا ویژن پیش کرتے ہیں

انٹرویو پینل: الطاف حسن قریشی
طیب اعجاز قریشی' کامران الطاف قریشی

میری اُن سے پہلی ملاقات غالباً ۱۹۹۲ء میں ہوئی تھی جب وہ پنجاب کے سیکرٹری تعلیم تھے اور کمشنر کی حیثیت سے فیصل آباد کی شہری زندگی میں حیرت انگیز انقلاب پیدا کر کے آئے تھے۔ وہ ایک دیانتدار' فرض شناس اور اعلیٰ پائے کے منتظم ہونے کی شہرت رکھتے تھے۔ اُن کا ذہن تخلیقی تھا جو انھیں نئے نئے تجربات کرنے پر اُکساتا رہتا۔ بعدازاں وہ وفاقی سطح پر سیکرٹری کامرس اور سیکرٹری داخلہ کے مناصب پر فائز رہے اور وہاں بھی اپنی جدت طبع کے نقوش ثبت کیے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انھوں نے لاہور میں ٹرانسپورٹ کے مسائل حل کرنے کے لیے ایک منصوبہ تیار کیا لیکن وزیراعلیٰ شہباز شریف کی ''تنگ نظری'' کے باعث اُس پر عمل نہ ہو سکا۔ پھر وہ ''بہادر'' اور ''ایماندار'' عمران خاں سے متاثر ہوتے گئے اور آج کل پاکستان تحریک انصاف کی کور کمیٹی

میں شامل ہیں اور اپنی فہم و فراست' حکومت چلانے کی قابلیت اور تجربے کی روشنی میں قیادت کو صائب مشورے دیتے رہتے ہیں۔ وہ سیاسی طمع سے بالاتر ہیں' البتہ سیاسی جماعتوں کے اندر اصول پسندی' دیانت داری اور بالغ نظری کا فروغ چاہتے ہیں۔ ان کے بعض تصورات اور احساسات سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے' مگر ان کی نیت پر شک و شبے کی بہت کم گنجائش ہے۔

میں نے انھیں ٹیلی فون کیا کہ آپ ہمیں انٹرویو کے لیے کب وقت دے سکتے ہیں؟ وہ اس وقت اسلام آباد میں تھے۔ کہنے لگے کہ ہم کل یعنی ۱۶ اکتوبر کی شام ڈیفنس کلب لاہور میں مل سکتے ہیں۔ اُردو ڈائجسٹ کا ایک پینل انٹرویو لینے وقت پر نکل کھڑا ہوا' لیکن جب ڈیفنس میں خالد مسجد کے قریب پہنچا' تو وہاں لوگوں کا بڑا ہجوم تھا۔ یہاں میرے عزیز دوست حفیظ اللہ خاں نیازی کے چھوٹے بھائی مرحوم نجیب اللہ خاں کی مغفرت کے لیے قرآن خوانی ہو رہی تھی۔ مرحوم عمران خاں کے چچازاد بھائی تھے اور وہ ان کے جنازے میں شریک نہیں ہوئے۔ ہم شام چھ بجے ڈیفنس کلب پہنچے جہاں تسنیم نورانی صاحب ایک خاموش گوشے میں ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ اُردو ڈائجسٹ کے پینل میں عزیزی طیب اعجاز اور عزیزم کامران الطاف بھی شامل تھے۔ طیب اعجاز اس ماہنامے کے ایگزیکٹو ایڈیٹر ہونے کے علاوہ پیکجز انڈسٹری میں بھی ایک نام رکھتے ہیں۔ "روشن پیکجز" ان کمپنیوں میں شامل ہے جنھیں ہارورڈ یونیورسٹی نے پاکستان میں بڑی تیزی سے آگے بڑھنے والے کمپنی قرار دیا ہے۔ طیب اعجاز اوورسیز پاکستان انٹرپریور فورم کے اندر سرگرم اور سارک چیمبر آف کامرس کے بھی رکن ہیں۔ انھیں بیرونی ممالک میں جانے اور خاص طور پر بھارت کے طول و عرض کو دیکھنے کے مواقع ملتے رہتے ہیں۔

دراصل ہمارے بڑے بھائی' ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی نے اُردو ڈائجسٹ کی انتظامی ذمے داریاں سنبھالنے کے ساتھ ساتھ پاکستانی کنو کو دنیا میں متعارف کرانے کے لیے نت نئے تجربات کیے تھے۔ انھیں شروع شروع میں بہت نقصان اُٹھانا پڑا تھا' لیکن ان کی سائنسی بنیاد پر کی جانے والی کاوشوں کا آج یہ ثمرہ ہے کہ پاکستان کے تازہ پھل اور سبزیاں مشرقی ایشیا اور مغربی ممالک میں بھی برآمد ہو رہی ہیں۔ جناب تسنیم نورانی ہمارے اس عظیم کارنامے سے بڑی حد تک باخبر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے کافی شاپ میں بیٹھتے ہی کنو کا ذکر چھیڑ دیا۔ وہ کہنے لگے:

"پاکستان سے کنو کی ایکسپورٹ کا کریڈٹ میں لے سکتا ہوں۔ میں ۱۹۸۴ء کے لگ بھگ سنگاپور میں کمرشل

کونسلر تعینات ہوا۔ تب ٹریڈنگ کارپوریشن آف پاکستان نے وہاں کنو بھجوانے کی کوشش کی۔ دو چار کنٹینروں کا آرڈر ملا۔ انھوں نے کنو بھیجے جو راستے ہی میں گل سڑ گئے۔ وہاں کے تاجروں نے جب کنٹینر کھولے' تو انھوں نے سمندر میں پھینکوا دیے۔ انھیں کلیم بھی نہیں ملا۔ چناں چہ پاکستان اُس وقت بہت بدنام ہوا۔ پہلے سال جب میں وہاں گیا تو ہمارے لوگ کنو کے کنٹینر بھجواتے تھے۔ میں جب پھل مارکیٹ میں لے کر جاتا' تو کوئی نہ خریدتا حالانکہ ہمارا کنو تائیوان اور چین کے کنو سے کہیں بہتر تھا۔ جب میں نے چھ مہینے تمام چیزوں کا جائزہ لیا تو پتا چلا وہ ایک سال پہلے بکنگ کرتے ہیں۔ اس لیے آف سیزن میں ہمارے لوگ جاتے' تو وہ مارکیٹ میں بری طرح پٹ جاتے۔

سنگاپور میں "کولڈ اسٹوریج" نامی کمپنی ہول سیل اسٹوریج کا کام کرتی تھی۔ ان کے ساتھ میں نے بات کی کہ ہم آپ کو اگلے سال تین چار ماہ پہلے کنو دیں گے۔ یہ بھی کہا کہ آپ اپنے آدمی بھیجیں، ہم انھیں اپنے باغات دکھا دیں۔ انھوں نے لوگ بھیجے اور ہم نے انھیں باغات دکھائے۔ انھوں نے کہا کہ آپ کے کارٹن پچک جاتے ہیں۔ میں نے کہا' کارٹن آپ ہمیں دے دیں۔ لہٰذا ہمیں نے سنگاپور سے کارٹن خرید کر ٹی سی پی کو بھیجے۔

اس وقت کارپوریشن کے چیئرمین یوسف صاحب سی ایس پی آفیسر تھے۔ کنو بھجوانے کے حوالے سے ٹی سی پی کے منیجر' بشیر صاحب بہت سرگرم رہے۔ میں نے پہلے سال دس کنٹینروں کا آرڈر لے کے دیا۔ پہلے سال کارپوریشن نے سرگودھا سے فرسٹ کلاس کنو منگوایا جو ہاتھوں ہاتھ بک گئے۔ ہمارے کنو کا رنگ خوب صورت ہے اور ذائقہ بھی اچھا ہے۔ اگلے سال چار گنا زیادہ آرڈر دیا۔ اس سے اگلے سال (۱۹۸۷ء میں) ہمارے کنو کی بہت بڑے پیمانے پر فروخت ہوئی۔ پاکستانی سنگاپور میں کامیاب ہوا' تو پھر ملائیشیا اور انڈونیشیا بھی جانا شروع ہوا۔ چینی کمیونٹی یہ پھل زیادہ

کماتی ہے کیونکہ ان کے ہاں کنو کی پوجا ہوتی ہے۔ ہم یہاں جیسے ایک دوسرے کو عیدی دیتے ہیں تو وہ ایک دوسرے کو کنو دیتے ہیں۔ یہ اُن کے لیے اچھی قسمت کا نشان بھی ہے۔

اس وقت ہمارے چار ٹریڈنگ پلانٹ تھے جن میں سے تین بند پڑے تھے۔ اب میرا خیال ہے کہ ۱۱۰ تا ۱۲۰ پلانٹ ہیں۔ بعدازاں بشیر صاحب نے ٹریڈنگ کارپوریشن چھوڑ کر یونین فروٹس کے نام سے کام شروع کر دیا۔ وہ ایک محنتی آدمی تھا۔ میں نے کولڈ اسٹوریج والوں سے کہا کہ آپ بشیر صاحب کے ساتھ مل کر کام کریں۔ وہ مجھے کئی سال بعد ملے۔ انھوں نے اب خربوزے بھیجنا شروع کر دیے تھے اور آم بھی۔ غرض میں نے اس وقت مارکیٹ میں تھوڑی سی دلچسپی لی تو مجھے پتا چل گیا کہ آرڈر چھ مہینے پہلے دیا جانا چاہیے اور پیکجنگ کا بڑا مسئلہ ہے جسے حل کر دیا۔ تسنیم صاحب نے پھر طیب اعجاز سے دریافت کیا' کیا ہمارے ہاں اعلیٰ کوالٹی کا پیکجنگ میٹریل بننا شروع ہو گیا ہے؟'

انھوں نے جواب دیا ''ہم معیاری میٹریل بنا رہے ہیں۔ ہمیں پیکجنگ میں اسی لیے آنا پڑا کہ سنگاپور سے مہنگا میٹریل درآمد کر رہے تھے۔ پھر ہم نے دبئی سے منگوانا شروع کیا۔ بعد میں ہم نے خود پیکنگ میٹریل بنانے کی کوشش کی اور کامیاب رہے۔''

تسنیم نورانی صاحب کہنے لگے، ہماری اور آپ کی کوششوں سے ایک انقلاب آ گیا ہے۔ جو پانچ سات آٹھ ہزار کے بھی نہیں بکتے تھے' اب لاکھوں روپے میں فروخت ہو رہے ہیں۔ اس کے علاوہ چین' روس اور ایران میں ہمیں بہت بڑی مارکیٹ مل گئی۔ وسطی ایشیائی ریاستیں بھی کِنّو برآمد کر رہی ہیں۔ اس کے بعد بات چیت پاک بھارت تعلقات کی سمت بڑھ گئی اور سوال جواب کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔

س: بھارت اور پاکستان کے مابین تجارت شروع کرانے میں بھی آپ کا کردار رہا؟

ج: ''کمپوزٹ ڈائیلاگ ۲۰۰۴ء میں شروع ہوئے تھے' مگر تب معاملہ خاص آگے نہیں بڑھا۔ جب ہم بھارت گئے' تو ان کا رویہ عجیب سا تھا۔ میں اُسے متکبرانہ تو نہیں کہوں گا' ان کے انداز میں کنفیوژن سی تھی۔ دراصل وہ چاہتے تھے کہ صرف انھی کو فائدہ پہنچے۔ بھارتی تاجر کہتا تھا کہ پاکستان کے پاس ایکسپورٹ کرنے کے لیے ہے کیا؟ ہم نے بتایا کہ ہمارے پاس سائیکلیں' سرامیکس اور باتھ روم فٹنگ ہیں۔ پلاسٹک اور چمڑے کی مصنوعات بہت اچھی ہیں۔ وہ کہتے کہ ہم یہ ساری چیزیں خود بہت بہتر بنا سکتے ہیں۔ آپ سے تو ہمیں نمک' چھوہارے یا جپسم پاؤڈر ملے گا۔''

س: آپ کی تاجروں سے بات چیت ہوئی تھی؟

ج: ''امرتسر گئے تو وہاں ان کی ٹریڈر ایسوسی ایشن سے ہماری بات ہوئی۔ دہلی میں بھی ان کی ٹریڈر ایسوسی ایشن فعال ہے۔ بھارتی تاجروں کا ذہنی رویہ یہی رہا کہ پاکستان سے کوئی چیز خریدنے کو وہ اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ وہ پاکستان کو اپنی مصنوعات فروخت کریں۔ وہ تجارت کی بات کرتے ہیں مگر ہم جب انھیں کوئی چیز ایکسپورٹ کرنا چاہیں تو کوشش کرتے ہیں کہ کوئی پاکستانی چیز نہ خریدی جائے کیونکہ بھارت برتر ملک ہے۔ وہ پھر پاکستانی اشیا پر مختلف پابندیاں لگا دیتے ہیں۔

مثال کے طور پر آپ اگر کپڑا لے کر گئے تو وہ کہتے ہیں کہ اس کی ڈائی کا ہمیں ٹیسٹ چاہیے کہ یہ کہاں سے آئی ہے؟ یا پھر آپ کوئی چیز امرتسر برآمد کرنا چاہیں تو وہ کہیں گے کہ یہ صرف مدراس بندرگاہ ہی سے آ سکتی ہے۔ ایسی انہونی پابندیاں لگاتے ہیں۔ اب سرحد پار کر کے کوئی پاکستانی دہلی جائے تو یہاں جو چیز ۱۰۰ روپے کی ہے' وہ وہاں ۱۵۰ روپے کی بک سکتی ہے اور کوالٹی بھی اچھی ہے، تو وہ اس پہ نان ٹیرف بیریئر کی پابندی لگا دیتے ہیں۔

اس کمپوزٹ ڈائیلاگ میں ہمارے ساتھ یہی ہوا، ہم کہتے کہ جناب آپ ان نان ٹیرف بیریئر کا کوئی حل تلاش کریں۔ وہ کہتے' ٹھیک ہے۔ ہم ایک کمیٹی بنا دیتے ہیں' آپ فکر مت کریں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم ان سے کہتے کہ بھائی سالہا سال سے یہی ہو رہا ہے اور تاحال اس میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ بالآخر جو چیز ان کو درکار ہوتی' وہ لے لیتے۔ مثلاً سیمنٹ کی قلت ہوگئی تو انھوں نے کہا کہ اچھا جی' دو لاکھ ٹن سیمنٹ بھیج دیں۔ دو لاکھ ٹن سیمنٹ تک وہ ساری سہولتیں دیتے مگر جیسے ہی دو لاکھ ٹن کی برآمدات ختم ہوتیں' تو وہ کہتے کہ فلاں نوٹیفکیشن آ گیا ہے' انھوں نے یہ کہہ دیا' وہ کہہ دیا۔ مختصراً کوئی نہ کوئی شرط لگا دی جاتی۔ چنانچہ کمپوزٹ ڈائیلاگ ان کے ساتھ ہوتا رہا' بڑی شائستہ باتیں ہوتیں مگر نتیجہ کچھ نہ نکلتا۔

س: وجہ کیا ہے؟

ج: ''یہی کہ پاکستان سے کوئی تاجر اپنی مصنوعات لے کر کسی بھارتی شہر میں جائے' تو وہاں اس کے پیچھے ''را'' کے ایجنٹ لگ جاتے ہیں۔ وہ بیچارا کہتا ہے کہ میں کس مصیبت میں پھنس گیا! بھارتی حکمران طبقے نے پاکستان کے خلاف اتنا زیادہ پراپیگنڈہ کر رکھا ہے کہ آپ معقول طریقے سے بھارت میں تجارت یا کاروبار نہیں کر سکتے۔ بہرحال کچھ پاکستانی وہاں کام کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پہ یہ بار بزے (Bareeze) اور انٹر وڈ (Interwood) والوں نے دکان کھول لی ہے۔ چار مہینے پہلے آخرالذکر نے بتایا تھا کہ میں امرتسر اور بعد میں

دہلی میں بھی دکان کھول رہا ہوں۔ بھارتی اپنی سرزمین میں پاکستانیوں کو ایک حد سے آگے نہیں جانے دیتے کیونکہ پھر وہ اسے اپنی ناک کا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔"

س: اس کا تو مطلب ہے کہ ہمارے تجارتی معاملات کبھی ٹھیک نہیں ہوں گے؟

ج: "میں سمجھتا ہوں کہ بھارت اور پاکستان کی تجارت دوطرفہ ہونی چاہیے۔ اس میں طے ہونا چاہیے کہ اتنے کروڑ روپے کی ہم ایکسپورٹ کریں گے اور اتنے کروڑ روپے کا سامان آپ بھجوائیں گے۔ جب تک یہ مفاہمت نہیں ہوگی' مسئلہ حل نہیں ہوگا۔"

س: سافٹا (SAFTA) کا کوئی مستقبل ہے؟ کیا یہ بھی آپ ہی کے دور میں طے پایا تھا؟

ج: "سافٹا میں تو سارا جنوبی ایشیا آتا ہے اور یہ سب کے لیے ایک جیسا ہے۔ اس میں بھارت بڑا بھائی ہے اور ہم چھوٹے بھائی۔ اُسے چاہیے کہ چھوٹے بھائیوں کے لیے سہولت پیدا کرے' جن میں بنگلہ دیش اور نیپال بھی شامل ہیں۔"

س: آپ نے بھارت کے بیوروکریٹس کو کیسا پایا؟

ج: وہ بھی ہمارے جیسی تعلیم و تربیت پاتے ہیں۔ ہم ایک دوسرے سے بڑی اچھی گپ شپ لگا سکتے ہیں' مگر ان کی نفسیات میں بھی ہمارے لیے نفرت سی موجود ہے جو نریندر مودی کے آنے سے اور بڑھ گئی۔ منموہن سنگھ قدرے نرم تھے مگر انھوں نے بھی واقعہ بمبئی اور پارلیمان پہ حملے کے بعد میڈیا کے ذریعے پاکستان کے خلاف اپنی عوام میں اتنی زیادہ نفرت پھیلائی جو پہلے کبھی دیکھنے کو نہیں ملی۔ ان کا ایک ہدف یہ ہے کہ اپنے آپ کو بڑا کرنے کے لیے پاکستان کو نیچا دکھانا ضروری ہے۔ اس وجہ سے جو تھوڑے بہت لوگ کشادہ ذہن کے تھے یا جو "امن کی آشا" کا راگ الاپتے' وہ تو آپ کے حق میں بات کرتے ہیں۔ مثلاً کلدیپ نیئر یا خشونت سنگھ جو پاکستان کے لیے تھوڑا سا نرم گوشہ رکھتے تھے۔ لیکن اب وہ بھی ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ میں پانچ چھ دفعہ بھارت جا چکا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد دوبارہ گیا۔ اب جانے کو میرا دل نہیں کرتا' کیونکہ بھارتیوں کو ایک پاکستانی سے مل کر جو خوشی پہلے ہوا کرتی تھی' اب وہ نہیں رہی۔ ایسے لگتا ہے جیسے ان پہ کوئی مصیبت آن پڑی ہو!

س: میں دس بارہ برس سے بھارت جا رہا ہوں۔ پہلے بھارتی کاروباری یہ سمجھتا تھا کہ پاکستان کی معیشت بڑی عمدہ جا رہی ہے۔ لیکن ۲۰۰۰ء کے بعد ان کے کاروباری و صنعتی ادارے عالمگیر حیثیت اختیار کر چکے۔ کئی بھارتی دنیا کے امیر ترین لوگ بن گئے ہیں۔ چنانچہ اب وہ ہمیں غیر اہم سمجھنے لگے ہیں اور ہماری طرف دانستہ توجہ نہیں دیتے۔ میرا خیال ہے' گرمجوشی کم ہونے کی یہ بھی وجہ ہے۔ چند سال قبل میں نے امرتسر سے کاغذ درآمد کرنا شروع کیا۔ اس کاروبار میں' میں اور میرے دوست شفیق عباسی شریک تھے۔ کھنا پیپر مل سے ہم نے مال منگوایا۔ شروع میں کاغذ آیا تو لگا کہ نیوز پرنٹ کی بہت بڑی منڈی پاکستان میں کھل جائے گی۔ لیکن جلد ہی احساس ہوا، بھارتی کاغذ کی قیمتیں یورپی ممالک سے بھی زیادہ ہیں۔ ان کی لاگت اتنی زیادہ بڑھ گئی کہ پاکستان کو سستے داموں بیچنا ان کے لیے مشکل ہو گیا۔ پہلے تو وہ بڑے گرم جوش تھے کہ جی پاکستان کی اتنی بڑی مارکیٹ مل جائے گی۔ لیکن وہ تو یورپ کی قیمتوں سے بھی مہنگا کاغذ فروخت کر رہے تھے' لہٰذا پاکستانی کیوں خریدے گا؟ اسی لیے سارا جذبہ ماند پڑ گیا۔

بھارتی باشندے احساسِ برتری میں مبتلا ہو چکے اور پاکستانیوں کو بہ نظرِ حقارت دیکھتے ہیں

ج: شاید اس لیے وہ کمپوزٹ ڈائیلاگ پر بھی بات نہیں کرتے۔ ویسے بھی مستقبل میں بھارت اور پاکستان کا جو تعلق ہے' اس کے متعلق' میں زیادہ پُرامید نہیں۔ ہمیں اپنی طرف دیکھنا چاہیے۔ ہمیں چاہیے کہ بھارت سے جنگ نہ کریں مگر ان سے خیر کی کوئی توقع رکھنا عبث ہے۔

س: گویا میاں صاحب نے اقتدار سنبھالتے ہی یہ پیغام دیا کہ ہم نے بھارت سے تجارت کو فروغ دینا ہے' تو وہ محض خواب ہے؟

ج: "ہمارے ہاں ایک لابی سمجھتی ہے کہ بھارت سے تجارت کرنے میں ہمیں زیادہ فائدہ ہو سکتا ہے' کیونکہ ان کی منڈی دس گنا بڑی ہے۔ مزید برآں ہماری کرنسی قدرے کمزور ہے' لہٰذا ہمیں منافع زیادہ ہوگا۔ اگر ہمیں وہ اشیا بھی مل جائیں تو وہ اربوں روپے کی برآمدات بن جائیں گی۔ مسئلہ یہ ہے کہ آپ کا چونکہ بھلا ہو رہا ہوگا تو بھارتی پاکستانی اشیا قبول نہیں کریں گے۔ مفاہمت اسی وقت ہوگی کہ بھارت اور پاکستان برابری کی بنیاد پر اصول و قوانین طے کر کے ایک دوسرے کو اشیا بھجوائیں۔

س: ہم نے اس کے باوجود بھارتیوں کے ساتھ سبزیوں اور پھلوں کی تجارت شروع کر دی اور اپنے کسان کا خیال نہیں رکھا۔ جب کہ بھارتی حکومت اپنے کسان کو سبسڈی دے رہی ہے۔ ہم وہاں سے سبزیاں اور پھل درآمد کرتے ہیں۔ جب ہمیں ضرورت پڑے تو فوراً ٹماٹر درآمد کر لیتے ہیں۔ لیکن جب ہمارے کسان کو اچھی قیمت ملنے لگتی ہے تو ہم فوری طور پر کہتے ہیں کہ سیاسی مسائل آڑے آ گئے اور سبزی بھارت نہیں جا سکتی۔ یہ تو سراسر زیادتی ہے۔ اس پر بھی کوئی روشنی ڈالیے؟

ج: اگر پاکستان میں کوئی فصل اچھی ہوئی ہے اور بھارت میں بری، تو یقیناً ہماری والی کو وہاں جانا چاہیے۔ اگر بھارت اس معاملے میں ڈنڈی مارتا ہے، تو حکومت نوٹس لے۔ امریکہ اور یورپ سے زیادہ دوست تو کوئی نہیں مگر تجارت کے معاملے میں ان کا "اینٹ کتے کا بیر" ہے۔ اس معاملے میں وہ ایک دوسرے کا کوئی لحاظ نہیں کرتے۔"

س: ہم اپنی معاشی ترقی برقرار کیوں نہیں رکھ سکے؟

ج: "مشرف دورِ حکومت میں کنزیومر اشیا کی خرید و فروخت پر زیادہ زور دیا گیا مثلاً گاڑیاں، موٹر سائیکلیں اور دیگر الیکٹرانکس سامان! اس سے مینوفیکچرنگ بڑھ گئی۔ یوں آپ کا ٹرن اوور اور جی ڈی پی ایک لحاظ سے بڑھتا گیا مگر معیشت مختلف طریقوں سے ترقی کرتی ہے۔ مثال کے طور پر آپ کی پیداوار بڑھے' آپ خود نئی چیزیں متعارف کرائیں یا پھر سستی اشیا بنا کر ملکی و غیر ملکی منڈیوں میں بھجوائیں۔ لیکن انھوں نے اس دور میں بینک کے قرضوں سے مصنوعی معاشی بلبلہ پیدا کر دیا۔ جیسے ہی معیشت میں تھوڑی سی کمزوری آئی' سب کچھ ٹھپ ہو گیا۔ دراصل انھوں نے معیشت کو دیرپا بنیادوں پر کھڑا نہیں کیا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ نائن الیون کے بعد بہت مالی وسائل پاکستان کی طرف آئے۔ اس وقت فنڈز کا بہاؤ ہماری سمت بہت زیادہ تھا۔ ہمیں وہ کہتے تھے کہ اتنے ہزار ارب روپے ٹیکس بڑھ گیا۔

مگر جی ڈی پی کے تناسب سے ٹیکس کم ہوا۔ یعنی معیشت بڑھ رہی ہے۔ اس کے بڑھنے سے کسٹم ڈیوٹی زیادہ آ گئی، یوں آپ کا ٹیکس زیادہ ہو گیا اور آپ یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ جناب ہم نے تو اتنا زیادہ ٹیکس وصول کر لیا۔

مارشل لا کی گورنمنٹ بظاہر مستحکم ہوتی ہے۔ اسی لیے کاروباری حضرات اور صنعت کار دل کھول کر سرکاری و نجی منصوبوں پر سرمایہ لگاتے ہیں۔ ان کو یقین ہوتا ہے کہ چار پانچ سال میں سرمائے کی بازیافت ہو جائے گی۔ وہ موقع ہوتا زیادہ ٹیکس جمع کرنے کا! میں سمجھتا ہوں کہ سب سے بڑی بددیانتی یہ ہوئی کہ انھوں نے قوم کو بتایا، ہم بہت اچھے منیجر ہیں، حالانکہ جی ڈی پی کی شرح نمو گیارہ فی صد سے گر کر آٹھ فیصد پر آ گئی تھی۔

آج بھی دیکھیے، حکومت طویل المعیادی منصوبہ بنانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ بس سرمایہ کاروں سے پیسے لے کر زرمبادلہ کے ذخائر بڑھا رہے ہیں۔ حکومت خود پہ کسی قسم کا دباؤ محسوس نہیں کرتی۔ بدقسمتی سے ہمارے سیاست دان جو پالیسیاں اختیار کرتے ہیں' وہ ایسی ہیں کہ سال دو سال اچھے گزر جائیں، آئندہ فائدہ ہو یا نہ ہو، اس سے انھیں کوئی سروکار نہیں۔ تعلیم کے نظام میں بھی ان کی یہی پالیسی ہے اور نظامِ صحت میں بھی۔

ان کا نظریہ ہے کہ چونکہ پل اور میٹرو نظر آتی ہیں لہٰذا آپ بھوکے کے منہ سے نوالا چھین کر بھی اس کی تیاری میں لگا دیں۔ سڑک نظر تو آئے گی، وہ بھوکا مر جائے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ چاہے آمدنی کا بندوبست ہو یا نہ ہو، میٹرو چلانے کے لیے ہمارے پاس پیسے ہوں یا نہ ہوں۔ جب کوئی اچھا اکانومی منیجر آئے' تو وہ بچت کرنے کا ہنر سیکھتا ہے، کوئی کام انجام دیتا ہے تاکہ دس سال بعد معلوم ہو کہ اس کا خاندان بہتر زندگی گزار رہا ہے۔ ہمارے ہاں دو قسم کے لوگ ہیں۔

بھارتی حکومت صرف اپنا مال پاکستان بھجوانا چاہتی ہے

ایک وہ جو آج اچھے کپڑے پہنتے اور پندرہ سے ۲۰ ہزاری سی گاڑی پر سفر کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے حالات بہت اچھے ہو گئے ہیں۔ دوسری طرف ایک شخص قرض لیتا یا پلاٹ بیچتا ہے' روپے پیسے کی بچت کرتا ہے، دال روٹی کھاتا، سائیکل یا موٹر سائیکل پہ جاتا اور اپنے بچوں کو تعلیم دلواتا ہے۔ اُسے بس اچھے مستقبل کی امید ہوتی ہے۔ آج ہر سیاستدان اپنی شان بان دکھانے کے لیے سب کچھ کرتا ہے لیکن اس میں اتنی ہمت نہیں کہ قوم کو بتا سکے، آنے والے پانچ سال سخت ہیں' اس کے بعد ترقی ہو گی۔ لیڈرشپ کا مطلب یہی ہے کہ ایک شخص قیادت کرتے ہوئے ملک و قوم کو ترقی و خوشحالی کی طرف لے جائے۔

س: سیاست دان آج تنقید کے سلسلے میں سب سے آسان شکار بنے ہوئے ہیں۔ آپ جیسے ذہین اور تجربہ کار لوگ مارشل لا کے دور میں حکومتوں میں رہے' لیکن اس دور میں بھی کوئی بڑا ڈیم نہیں بنا' تعلیم پر بھی کام نہیں ہوا۔ کیا ہم کہہ سکتے

ہیں کہ سیاست دان ہوں یا بیوروکریٹس' کسی کے پاس ہمارے قومی مسائل کا حل نہیں' کیونکہ وہ ان کا فہم ہی نہیں رکھتے اور سبھی "شارٹ کٹس" پر چل رہے ہیں؟

ج: "بات یہ ہے کہ بیوروکریسی ایک گاڑی میں انجن کی طرح ہے اور سیاستدان جس کے ڈرائیور ہوتے ہیں۔ اسٹیئرنگ ویل پہ بیٹھا سیاستدان ہی فیصلہ کرتا ہے کہ گاڑی کو کہاں لے جانا ہے۔ بیوروکریسی تو صرف گاڑی چلاتی ہے۔ مشرف کے دور میں شوکت عزیز وزیراعظم بنے جو فنانس کے آدمی تھے۔ ان کی بات چلتی تھی۔ اُس زمانے کے کسی فنانس سیکرٹری کا نام یاد ہے آپ کو جو پالیسی بناتا تھا؟ کاروباری حلقے اسی لیے شوکت عزیز کو منانے کی کوشش کرتے تھے۔ آج کراچی کے کاروباری حضرات ڈار صاحب کے پاس جاتے، ڈاکٹر وقار مسعود کے پاس کوئی نہیں جاتا۔ ڈار صاحب فیصلہ کرتے ہیں کہ ہم نے فلاں چیز مہنگی کرنی ہے اور امریکہ سے قرض لینا ہے۔ جس زمانے کی آپ بات کر رہے ہیں وہ، غلام اسحٰق خان کے دور تک رہا' اس وقت بیوروکریٹ طاقتور تھے۔

میں سمجھتا ہوں کہ بیوروکریسی تب ختم ہوئی جب بھٹو نے ۱۹۷۳ء میں اس کو حاصل آئینی تحفظ ختم کر دیا۔ ایوب خان کے دور سے پہلے غلام محمد سرکاری افسر تھے اور اسکندر مرزا بھی! یہ وہ دور تھا جب سول سرونٹ چمکتے تارے تھے اور سیاستدان بیچارے تحفظ ڈھونڈتے تھے۔ اب ہوا یہ کہ ۱۹۹۰ء سے ۲۰۰۵ء کے عرصے میں سیاستدان اتنے زیادہ حاوی ہو گئے کہ پچھلے دنوں میں نے روزنامہ ڈان میں "A little respect" کے عنوان سے مضمون لکھا اور بتایا، اب ہمارے بیچارے سول سرونٹ کو تو اتنی عزت بھی نہیں مل رہی کہ وہ کوئی بات کہہ سکیں۔ بیوروکریسی میں افسر جہاد کرنے تو نہیں آتے' لہٰذا اپنی نوکری گنوانے کی کون جرأت کرے گا؟ ان حالات میں سول سرونٹ کو الزام دینا درست نہیں۔

س: بھارت میں سیکرٹری خوراک مسٹر بی سی گپتا رہے۔ انھوں نے ایک بار مجھے حیرت انگیز واقعہ سنایا۔ فوڈ سبسڈی کو تحفظ دینے کا معاملہ تھا۔ منموہن سنگھ نے سونیا گاندھی کی ہدایت پر قانون سازی کے لیے ایک ڈرافٹ تیار کرایا۔ اس کے مطابق حکومت بھارت ہر حال میں خوراک کی مد میں کھربوں روپے سبسڈی دینے کی پابند تھی۔ کہنے لگے' میں نے اسے پڑھا تو منموہن سنگھ کے پاس گیا اور کہا کہ آپ مجھے یہ بتائیے، ملک میں قحط پڑ جانے کی صورت میں ہم باہر سے خوراک درآمد کر کے کیسے اپنے لوگوں کو سبسڈی پہ دیں گے؟ وہ مسکرائے اور کہنے لگے' لگتا ہے کہ تم مجھے نوکری سے نکلواؤ گے۔ لیکن تم جو کرنا چاہتے ہو وہ کر لو۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب بھارتی سرکاری افسروں میں اتنی جرأت پائی جاتی ہے' تو ہمارے ہاں اس کا فقدان کیوں ہے؟

ج: بھارت میں بیوروکریٹ آج بھی قدرے بہتر ہے۔ ہمارے ہاں سی ایس پی (سنٹرل سپیریئر سروسز آف پاکستان) بہترین سروس تھی۔ اس میں ڈپٹی کمشنر ایک طاقتور عہدہ تھا۔ جب سرکاری افسر پانچ سات سال ڈی سی رہ لیتا' تو اس میں خوداعتمادی پیدا ہو جاتی۔ تربیت کے بعد وہ مختلف اداروں و محکموں میں جاتا اور یہ سلسلہ انگریز کے زمانے سے چل رہا تھا۔ لیکن جنرل مشرف نے آتے ہی سی ایس پی افسروں کے خلاف مہم چلا دی۔ میں یہ بات دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ انھوں نے اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کے تحت نظام تباہ کیا۔ ڈپٹی کمشنر کا نظام ختم کر کے وہ ڈی سی او کا نظام لے کے آئے۔ اپنی طرف سے کہا کہ ہم حکومت نچلی سطح پہ لے جا رہے ہیں' حالانکہ ہر مارشل لا ایڈمنسٹریٹر پہلے بھی صرف لوکل

گورنمنٹ کے ذریعے کام کرتا تھا اور مشرف نے بھی یہی کیا۔ انھوں نے سب کچھ لوکل گورنمنٹ کے کھاتے میں ڈال دیا' پیسے بھی زیادہ دیے مگر یوں بیوروکریسی کا تربیتی میدان اور اس کی خود اعتمادی ختم کر دی۔ اس وقت ڈی سی او کے پاس ڈی سی سے فنانشل پاور سو گنا زیادہ ہیں۔ ڈی سی کے پاس مقابلے میں کچھ ہوتا ہی نہیں تھا۔ لیکن آج ہم تڑپ رہے ہیں کہ اسلام آباد میں پولیس والے کو مار پڑ رہی ہے۔ آج ہم ٹی وی پہ دیکھتے ہیں کہ ملتان میں ایک عورت نے پورے پولنگ اسٹیشن کو یرغمال بنالیا۔ سب پولیس والے اس کے سامنے بے بس تھے۔ یہ تو ہمارے حالات ہو چکے۔ بھارت میں بھی حالات تبدیل ہوئے میڈیا کو آزادی ملی لیکن بیوروکریسی کا بنیادی ڈھانچہ وہی ہے۔ جب کہ پاکستان میں اس کی شکست و ریخت کے باعث لا اینڈ آرڈر پر حکومت کا کنٹرول نہیں رہا۔ اسلام آباد میں چالیس ہزار پولیس والے احتجاجیوں کو کنٹرول کرنے پر لگے رہے پھر بھی ان پہ قابو نہ پا سکے۔

آپ بیوروکریسی کو مزید ماریں، اسے ذمے دار ٹھہرائیں، تو حالات مزید خراب ہوں گے۔ سرکاری افسر جہاد کرنے کے بجائے نوکری کرنے آتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ باضمیر و غیرت والے ایماندار لوگ بھی سول سروس میں ہیں اور ۹۰ فیصد ملک و قوم کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ الگ بات کہ "نور" دکھانے کی خواہش بھی ان میں ہوتی ہے۔ لیکن ہوا یہ کہ وہ نور آپ نے ختم کر دی جس کے باعث کام کرنے کا جذبہ سرد پڑ گیا۔ اب اس قسم کا شخص جب سیکرٹری بنے تو اس کی شخصیت ہی بدلی ہوتی ہے۔ اس میں اعتماد ہوتا ہے اور نہ اُس کی شخصیت کے اندر کوئی رعب داب۔ وہ سیاستدان کو پکڑتا ہے کہ میری فلاں جگہ پوسٹنگ کرا دو۔ نتیجہ یہ کہ جو کچھ اس سے سیاستدان کرانا چاہے' افسر وہی کرتا ہے۔

س: نورانی صاحب سول سروس میں اصلاحات کی رپورٹیں آتی رہی ہیں' کیا ان کا کچھ فائدہ ہوا؟

ج: "مجھے یہ علم ہے کہ ۱۹۴۷ء سے اب تک پچاس پچپن رپورٹیں آئی ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ فخر امام صاحب نے رپورٹ تیار کرنے میں بہت وقت لیا تھا۔ اس کے بعد ابھی حال ہی میں ڈاکٹر عشرت حسین نے چار پانچ سال محنت کر کے "گڈ گورننس" کے موضوع پر رپورٹ مرتب کی۔ اس میں بیوروکریسی کی اصلاحات کو بھی برتا گیا۔"

س: آپ نے آئینی تحفظ کی بات کی ہے' اس کی ضرورت کیا تھی؟

ج: سرکاری افسر کو حاصل آئینی تحفظ یہ تھا: "وہ حکومت کا نہیں مملکت کا ملازم ہے۔" دراصل حکومت تو منتخب ہو کر آتی ہے' جبکہ سرکاری افسر صدر کے ماتحت ہوتا ہے۔ اب تو صدر کے عہدے کی بھی تذلیل ہونے لگی ہے۔ ۱۹۷۳ء سے پہلے کی بیوروکریسی میں بھی کچھ برائیاں تھیں اور منفی پہلو پائے جاتے۔ مگر سرکاری افسر حکمرانوں کی ہاں میں ہاں نہیں ملاتے تھے۔ ناراضی کی صورت میں حکومت ان کو او ایس ڈی بناتی یا میانوالی تبادلہ کر دیتی تھی۔ اس زمانے میں کسی کو سزا دینا ہوتی' تو اسے میانوالی یا ڈی جی خان بھیج دیا جاتا۔ جو ایماندار لوگ تھے' وہ اس زمانے میں بھی غلط کام نہیں کرتے تھے۔ وہ میانوالی یا ڈیرہ غازی خان چلے جاتے مگر جی حضوری نہ کرتے۔ ان دنوں تنخواہ میں گزارہ بھی بہتر ہوتا تھا۔ پچاس اور ساٹھ کی دہائی میں سول سرونٹ کی تنخواہ صرف تین ہزار روپے ہوتی تھی، جب کہ اس کے مقابلے میں آج اسے چار پانچ لاکھ روپے ملتے ہیں۔ ابھی انھوں نے حالیہ دنوں میں مزید تنخواہ بڑھائی ہے۔ مگر اسے دستور میں جو ضمانت دی گئی کہ وہ ملازمت سے نکالا نہیں جائے گا' وہ اس کے لیے بڑی نفسیاتی طاقت

مشرف دور میں غیر ملکی امداد اور بینک سے لیے گئے قرضوں کے ذریعے معاشی ترقی ہوئی جو حقیقتاً سراب تھا

اور ذہنی طمانیت کا درجہ رکھتی تھی۔

س: نورانی صاحب! آپ نے فرمایا کہ ۱۹۷۳ء تک بیوروکریسی بہت مضبوط تھی۔ سوال یہ ہے کہ اس نے تب تک ملک کے لیے کیا خدمات انجام دیں؟

ج: "آپ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۳ء تک نظر دوڑائیں تو بیوروکریسی پہ الزام دھرے جا سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر اس نے ۱۹۵۸ء کے مارشل لا میں جنرل ایوب خان کا ساتھ دیا۔ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۶۰ء تک سیاستدانوں کی اعانت اور انتظامی مشنری ٹھیک کرنے کے بجائے سرکاری افسروں نے خود ہی حکومتیں سنبھال لیں اور بڑے کھلاڑی بن گئے۔ آج وہ اپنی کوتاہیوں کی وجہ سے بھی ناتوانی کا شکار ہیں۔

س: لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ موجودہ حکومت بھی چند بیوروکریٹس چلا رہے ہیں؟

ج: "حقیقت یہ ہے کہ بیوروکریٹس تجربہ کار اور باصلاحیت ہیں' لیکن اُن کو ذمے داری نہیں دی جا رہی۔ آپ جن کی بات کر رہے ہیں' وہ تو مڈلیول بیوروکریٹ ہیں جو پالیسی بھی صحیح طور پر نہیں بنا رہے۔"

س: رازداں کہہ رہے ہیں کہ پالیسی وہی بناتے ہیں اور وہی فیصلے کرتے ہیں؟

ج: "معاشی پالیسی ڈار صاحب اور سیکورٹی پالیسی نثار صاحب بناتے ہیں۔ انرجی پالیسی کا کسی کو علم نہیں کہ کس قسم کی بنائی ہے۔ اس وقت خاقان عباسی' خواجہ آصف اور دوسرے کچھ لوگ کسی قدر سرگرم دکھائی دیتے ہیں' مگر ان کے درمیان رابطے اور ہم آہنگی کا فقدان ہے۔ حاکم وقت کے پاس چونکہ اتنا وقت نہیں کہ تمام سیکرٹریوں سے بات کر سکے، لہٰذا انھوں نے ایک یا دو افسر رکھے ہوئے ہیں جن کے ذریعے نام و پیام ہوتا ہے۔ اس وجہ سے ان افسروں کو بڑی طاقت مل گئی۔ اسی طرح حکومت نے ہر صوبے میں ایک دو بیوروکریٹ رکھ لیے۔ آپ کی گورننس کا انداز ہی ایسا ہے کہ آپ محنت نہیں کرنا چاہتے' ہر سیکرٹری کے ساتھ بیٹھ کر بات نہیں کرتے اور وزیروں کو وقت نہیں دیتے۔ آپ نے بس سادہ سا میکانزم رکھا ہوا ہے کہ ہمیں ہر مسئلے کا نچوڑ دیا اور بتایا جائے کہ کدھر دستخط کرنا ہیں۔ جو چیز ان کی اپنے ذاتی مفاد میں ہو وہ تو سمجھ میں آجاتی ہے۔

س: آپ سیکرٹری داخلہ بھی رہے ہیں۔ ہمارے داخلی سیکیورٹی کے معاملات جس طرح خراب ہوتے جا رہے ہیں' آپ کی نگاہ میں انھیں کیسے درست بنایا جا سکتا ہے؟

ج: اس میں دو باتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ اندرونی سیکیورٹی جو لوگ خراب کر رہے ہیں' وہ کہاں سے آتے ہیں، کس طرح پیدا ہو رہے ہیں اور ان کو آپ کس طرح روکیں گے۔ جہادی تنظیمیں' دہشت گردی اور مافیا گینگ بڑھ رہے ہیں۔ گویا ہمارے سیکیورٹی' کرائم اور جہاد کے تین بنیادی ایشوز ہیں۔ ہمیں اس امر پر بھی غور کرنا ہوگا کہ معاملات کنٹرول کرنے والوں کی صلاحیتیں کیا ہیں اور آپ کے پاس ان سب کو قابو کرنے کی طاقت ہے یا نہیں۔ آپ کی قانون نافذ کرنے والی ایجنسیاں کس حال میں ہیں۔ میرا ایک سادہ سا نسخہ ہے کہ جب سے آپ نے

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا عہدہ ختم کیا' تب سے آپ کی صلاحیت نچلی سطح پر ختم ہو گئی۔ اب سو آدمی کہیں سے نکل آتے ہیں' تو آپ گھبرا جاتے ہیں' کیونکہ آپ کے پاس اس وقت جو اسلحہ یا طاقت ہے' اس کا کوئی رابطہ کار (کوآرڈینیٹر) ہی نہیں۔ میرے خیال میں ڈی سی او کا کام لا اینڈ آرڈر کو سنبھالنا نہیں' وہ ضلع کا سب سے بڑا افسر ہے۔ پولیس کا کام ہے لا اینڈ آرڈر کو کنٹرول کرنا! اب آپ بتایئے پولیس کو لاٹھی چلانے کی تربیت ملی ہے یا وہاں سے بھاگ جانے کی! درمیان میں بات چیت اور معاملات طے کرنا پولیس کی تربیت میں شامل نہیں۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا یہ کردار ہوتا تھا کہ وہ علاقے کو کنٹرول کرنے کے لیے چھوٹے موٹے جرائم پر مجرموں کو فوراً سزا دیتا اور انھیں نقضِ امن توڑنے پر قید کر سکتا تھا۔ چنانچہ شہری قانون پہ عمل درآمد کرتے۔ اب انتظامیہ کے پاس طاقت ہی نہیں رہی۔"

اب ہوتا یہ ہے کہ اگر میں آپ کے خلاف کوئی کیس بناؤں، تو وہ جوڈیشل مجسٹریٹ کے پاس جاتا ہے۔ وہ آپ کو ایک دن میں فارغ کر دیتا ہے' وہ کہتا ہے کہ میں تو سیشن جج کے نیچے ہوں۔ یوں معاملہ ختم ہو جاتا ہے۔ گورنمنٹ ڈی سی او کو کہتی ہے کہ حالات ٹھیک کرو حالانکہ وہ یہ کام کرنے کی طاقت و صلاحیت ہی نہیں رکھتا۔ مزید برآں پولیس اصلاحات میں بڑی پیچیدگیاں پیدا کر دی گئی ہیں۔ جہاں ایک ایس پی ہونا چاہیے تھا' وہاں آپ چھے چھے افسر لگا رہے ہیں۔ یوں انتظامی انتشار پھیلتا جا رہا ہے۔ تیسری چیز بھرتیوں اور تربیت کا نظام ہے جس پر ہم نے توجہ نہیں دی۔ جب کبھی ہمیں دس ہزار افراد کی فورس چاہیے تو صرف ایک مہینے میں دس ہزار جوان بھرتی کر لیے جاتے ہیں۔ اگر انھیں ایک سال تربیت کی ضرورت ہے تو ہم ان کو چھے یا تین مہینے بعد فیلڈ کے اندر لے آتے ہیں۔ مطلب یہ کہ آپ نے تربیت کے بغیر انھیں ذمے داری سونپ دی۔ پھر ہمارے نظام انصاف میں کوئی بہتری نہیں آرہی۔ دراصل لا اینڈ آرڈر تب کنٹرول ہوتا ہے جب مجرم کو علم ہو کہ مجھے سزا ہو سکتی ہے۔ اگر کسی کو پورا یقین ہو کہ اسے سزا نہیں ہو سکتی تو وہ بے خوفی سے جرم کرتا چلا جائے گا۔ آپ نے اسلام آباد میں پولیس کو مار پڑتے دیکھی۔ دھرنے کا سارا علاقہ احتجاجی خود کنٹرول کر رہے تھے اور پولیس ان سے ڈر کر بھاگ رہی تھی۔

جنرل پرویز مشرف جنھوں نے
کئی متنازع اقدامات کر ڈالے

عام جرائم عوام کی زندگیوں کو متاثر کرتے ہیں۔ دوسری طرف دہشت گرد خوف و ہراس پھیلاتے ہیں۔ میرا یہ نظریہ ہے کہ آپ جب تک ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو واپس نہیں لاتے، گے تب تک معاملات بہتر نہیں ہو سکتے۔ مجسٹریٹی نظام نچلی سطح پر جرائم قابو کرنے کا موثر ہتھیار تھا۔ یہ یاد رہے کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹی کا ہائیکورٹ معائنہ کرتا تھا، مجسٹریٹ کو طاقت بھی ہائیکورٹ دیتا تھا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مادر پدر آزاد نہیں ہوتا تھا' اس کی عدالتوں کا

معائنہ ہوتا۔ کسی نے اگر اپنی طاقت کا غلط یا ناجائز استعمال کیا، تو اس کے خلاف کارروائی ہوتی تھی۔ اس طرح مجسٹریٹ کا ادارہ کنٹرول میں رہتا۔ آج جرائم کے خاتمے کے لیے جو اہلیت درکار ہے' اس کا نوے فیصد تک فقدان ہے۔"

س: آپ یہ بتایئے کہ دہشت گردوں کا قلع قمع کیسے ممکن ہے؟

ج: "اب ہم جہادیوں کی بات بھی کرتے ہیں وہاں بھی معاملہ بدانتظامی کے باعث خراب ہو رہا ہے۔ آپ سندھ میں ایک اچھا آئی جی لگاتے ہیں اور وہ کام شروع کرتا ہے۔ ایک مرحلہ آتا ہے کہ آپ نے آٹھ ارب روپے کا اسلحہ یا گاڑیاں خریدنی ہیں۔ یہ کام آئی جی یا زیادہ سے زیادہ ہوم سیکرٹری کا ہے۔ آپ اسے کہتے ہیں کہ فلاں شخص کو آرڈر دو۔ وہ کہتا ہے، میں تو نہیں دے سکتا۔ آپ اس کی تذلیل کر کے اسے چار مہینے بعد بدل دیتے ہیں۔ لہٰذا جب حاکم جرائم کا خاتمہ ہی نہ چاہتا ہو' تو پھر آپ کراچی یا کسی اور شہر میں امن کیسے لائیں گے؟ سوچنا چاہیے کہ ہماری پولیس فورس سے فوج کیوں بہتر ہے؟ کیا آپ میجر جنرل کو کہہ سکتے ہیں کہ فلاں سپاہی کو چھٹی دے دو، اس کی بیوی بڑی بیمار ہے، یا فلاں کو اس جگہ سے وہاں تعینات کر دو، یہ بڑا پیارا ہے؟ وہ تو الگ ہے، لیفٹیننٹ جنرل بھی ایسا نہیں کہہ سکتا۔ وجہ یہی کہ بریگیڈیئر اپنے میجر جنرل کی بات نہیں سنتا۔ سفارش کے معاملے میں وہ کہتا ہے کہ یہ میری ذمے داری ہے اور یہ میری کمانڈ ہے، آپ اس کے اندر مداخلت نہ کریں۔ یہ جو آئی جی ہے، اس کی کمان میں ایک لاکھ کے لگ بھگ نفری ہوتی ہے۔ آپ اسے بلاتے اور ٹی وی کے سامنے اسے کہتے ہیں کہ اگر دو دن میں لڑکی کی آبروریزی کرنے والا ملزم برآمد نہ ہوا تو تم اپنے آپ کو فارغ سمجھو۔ اب ایک ڈیڑھ لاکھ فورس کا کمانڈر ہے، اس سے آپ ذاتی ملازم کی طرح پیش آئیں' تو وہ کیسے درست کام کرے گا؟

"اگر ہم جرائم کی بات کرتے ہیں تو کراچی کلاسیک مثال ہے۔ وہاں آدھی سے زیادہ پولیس فورس ایک جماعت یا دیگر جماعتوں کی بھرتی کرائی ہوئی ہے۔ اس لیے وہ فورس غیر جانبدار نہیں۔ وہ آئی جی کی طرف دیکھنے کے بجائے اپنے علاقے کے جماعتی کمانڈر یا دوست ایم پی اے کی طرف دیکھتی ہے' لہٰذا جب تک یہ خرابیاں دور نہیں ہوتیں، نظام بہتر نہیں ہوتا، تب تک امن عامہ بگاڑ سے دوچار ہی رہے گا۔

س: جرائم کنٹرول کرنے کے بارے میں آپ نے تفصیل سے اظہار خیال کیا' مگر ہمیں انتہا پسندی اور دہشت گردی کے ناسور کا بھی سامنا ہے۔ اس بارے میں آپ کی تجاویز کیا ہیں؟

ج: "جہادی جنگجو لوگ ہیں۔ وہ جہاں بس رہے ہوں' وہاں کا تھانیدار کہتا ہے کہ مجھے معلوم ہے، یہ لوگ کیا کر رہے ہیں مگر میرے علاقے میں تو کچھ نہیں کرتے۔ اس لیے اسلام آباد والے ان سے مطمئن ہیں۔ ہمارے زمانے میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو ہر جمعے رپورٹ آتی تھی کہ فلاں مسجد کے خطیب نے واعظ میں کیا کہا ہے۔ اگر وہ کوئی الٹی سیدھی بات کرتا' تو اسے بلا لیا جاتا تھا۔"

س: ایسا کب تک ہوتا رہا؟

ج: "میں ۷۷۔۱۹۷۸ء تک خود فیلڈ میں تھا۔ تب تک تو یہ نظام قائم تھا۔ ہمارا ایک اسپیشل برانچ کا آدمی رپورٹ تیار

کرتا تھا۔ پھر جو شرپسند مولوی ہوتے تھے اُن پہ خاص طور پر نظر رکھی جاتی۔ اس وقت ہر ضلع میں دو تین شریر مولوی ہوتے تھے مگر ان سے انتظامیہ کا رابطہ رہتا۔ کبھی ڈاڑھی کو ہاتھ لگایا جاتا کبھی سختی بھی کی جاتی تھی۔ اب ہر چیز آئی ایس آئی کر رہی ہے۔ مقامی انتظامیہ کا یہ تاثر ہے کہ اگر کوئی دہشت گرد ہے تو اسے آئی ایس آئی دیکھے گی ہمارا تو یہ کام ہے کہ کسی شخص نے قتل کیا ہے اس پہ کیس بنایا جائے۔ اس طرح جہادیوں کو آزادی ملی ہوئی ہے۔"

س: کیا انٹیلی جنس بیورو (آئی بی) کچھ نہیں کرتی؟

ج: "آئی بی معلومات دے دیتی ہے۔ اس کی اہلیت تو ہے یعنی اگر وہ کچھ کرنا چاہے تو کر سکتی ہے مگر اس کے اندر بھی ایک قسم کا خوف پایا جاتا ہے۔ لہٰذا وہ بھی کامل طریقے سے کام نہیں کرتی۔"

س: دہشت گردوں کا خوف؟

ج: "جی ہاں۔ آئی ایس آئی مختلف طریقے سے کام کرتی ہے اس کے ذرائع کئی گنا زیادہ ہیں اور وہ بہت بھی متحرک ہے لیکن کئی دفعہ وہ بھی جہاد کے بارے میں اپنی سوچ رکھتی ہے۔ بہرحال سیکیورٹی کا نظام خرابیوں سے پاک ہو جائے، تو ہمارے ہاں جلد امن آ سکتا ہے۔ آج کل "فول پروف سیکیورٹی" کا بڑا چرچا ہے جس کی کسی بھی کتاب میں تعریف درج نہیں۔ کہتے ہیں، فول پروف سیکیورٹی دے دی گئی ہے۔ اور وہ کیا ہے کہ چند ڈرپوک سے پولیس والے اِدھر اُدھر پھر رہے ہیں ذرا سا دھماکا ہوا تو بھاگ کھڑے ہوئے۔ ایک اور چیز میں ہمیشہ سوچتا ہوں کہ فوج والا کیوں لڑتا ہے؟ وہ اس لیے کہ کپتان اور عام فوجی کئی سال تک ساتھ رہتے ہیں۔ ایک یونٹ میں آفیسر کی پوسٹنگ ہوتی ہے اور سو دو سو فوجی اس کے ماتحت ہوتے ہیں ان کو وہ ذاتی طور پر جانتا ہے۔ وہاں سبھی کے اہلِ خانہ گھل مل جاتے ہیں۔ وہ ایک قسم کی ٹیم ہوتی ہے۔ پولیس میں کیا ہوتا ہے اس کا تماشا آپ نے اسلام آباد میں دیکھا کہ چالیس ہزار اہلکار گئے۔ کوئی ریلوے پولیس کا تو کوئی آزاد کشمیر پولیس کا اور کوئی پنجاب پولیس کا۔ اِدھر سے پکڑ کر اُدھر دے دیا۔ وہ ایک دوسرے کو جانتے بھی نہیں تھے۔ پہلی دفعہ مل رہے تھے۔ افسر پر اگر گولی چلے گی یا گولہ گرے گا تو کیا وہ اس افسر کے کہنے پہ کھڑا ہوگا؟ آپ نے دیکھا کہ ایس پی کو جب ہجوم نے مارا تو بجائے اس کے کہ پولیس والے اس کی خاطر لڑتے وہ بھاگ نکلے۔ کیا فوج میں آپ سوچ سکتے ہیں کہ اس طرح ہوگا؟"

س: یہ بتائیے کہ دھرنوں کے دوران اگر آپ سیکرٹری داخلہ ہوتے تو کیا کرتے؟

ج: "دیکھیے اگر ایک لیڈر کے خلاف نفرت پائی جاتی ہے اور اس کی مخالفت میں کوئی دوسرا لیڈر اٹھتا ہے تو اس احتجاج کو پوری طرح سے ختم کرنا کسی بھی انتظامیہ کا کام نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ جو انھوں نے کیا تو ایک لحاظ سے ٹھیک تھا کہ اپنی تذلیل کروالی۔ مگر نکتہ یہ ہے کہ اتنی زیادہ فورس اکٹھا کرنے اور معاملے کو خوب اُچھالنے کی ضرورت کیا تھی؟ اُن کی حکمت عملی یہ تھی کہ ہم نے کوئی تشدد نہیں کرنا۔ اور ویسے بھی طاقت استعمال کرنے کی ان میں ہمت نہیں تھی کیونکہ ماڈل ٹاؤن واقعے کے بعد زبردست ردعمل سامنے آیا تھا۔ یہ واقعہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نہ ہونے کے باعث رونما ہوا کہ وہاں کسی کو نہیں معلوم، آرڈر کس نے دیا ہے۔ ہوا یہ کہ جب گولیاں چلیں تو سب نے گولیاں چلانی شروع کر

دیں۔ کسی کو پتا ہی نہیں تھا گولی چلانے کا آرڈر کس نے دیا۔

"اب آپ دیکھیں کہ حکومت کو پولیس فورس پہ اعتماد نہیں چناں چہ اُن سے پستول واپس لے لیے گئے۔ ایک پولیس والے کی یونیفارم میں پستول اس کا حصہ ہے۔ اب حکومت کو یہ خطرہ ہے کہ وہ کہیں چلا نہ دے۔ پہلے بھی پولیس کے پاس پستول ہوتے تھے مگر یہ کبھی نہیں ہوا کہ وہ بغیر آرڈر کے گولی چلا دے کیونکہ اگر اس نے چلائی تو اس پہ قتل کا کیس ہو جائے گا۔"

س: اس سے پہلے اسلام آباد میں سکندر کا ڈراما کافی دیر لگا رہا تھا؟

ج: "بات یہ ہے کہ میڈیا کی موجودگی میں حالات کچھ بدلے ہیں اور اب وہ ہر معاملہ خوب اچھالتا ہے۔ دوسری طرف ہماری پولیس ایسے معاملات سے نمٹنے کی تربیت نہیں رکھتی۔ دراصل احتجاجیوں سے نمٹنے والی پولیس بڑی اسپیشل قسم کی فورس ہوتی ہے جو ہزاروں مظاہرین کو حد میں رکھتی ہے۔ جیسا حال ہی میں ہانگ کانگ میں ہوا۔ کوریا میں ہوتا رہتا ہے۔ اس پولیس فورس کا یہی کام ہے کہ احتجاجیوں کو کنٹرول کرے اور وہ کسی سے نہیں ڈرتے۔ ہماری فورس کو یہ جانوروں کی طرح ٹرکوں میں بھر کے لے آتے اور کہتے ہیں کہ جی ہم نے دس ہزار فورس اکٹھی کر لی۔"

س: آپ کا مطلب یہ ہے ہماری قابلیت محدود اور ہمارا سسٹم بھی ٹھیک نہیں؟

ج: "میں نے ۲۰۰۳ء میں ایک اسکیم بنائی جو سابق وزیراعظم جمالی صاحب کو پیش کی تھی۔ اس وقت اسلام آباد میں سات ہزار پولیس والے موجود تھے۔ ان میں سے صرف ۱۳۰۰ پولیس والے تھانوں میں تھے باقی پانچ ہزار سات سو باہر مختلف ڈیوٹیاں انجام دیتے۔ میں نے ان سے کہا کہ ذرا سا مسئلہ پیدا ہوتا ہے تو آپ رینجرز بلا لیتے ہیں۔ ذرا سا خوف محسوس، فرنٹیئر کانسٹیبلری بلاتے ہیں۔ تھانے کا کام تفتیش کرنا ہے۔ اس کے لیے آپ پولیس کو رہنے دیں اور سیکیورٹی کے دیگر مسائل پر قابو پانے کی خاطر ڈھائی ہزار کی الگ سے فورس بنائیں۔ اس فورس میں جوان اس طرح بھرتی کریں جس طرح رینجرز کرتے ہیں۔ میں نے انھیں ایک قانون بھی بنا کر دیا کہ اس کے تحت نئی فورس کام کرے۔ یہ جو ڈھائی ہزار کی فورس ہوگی اس کو آپ کمانڈو تربیت دیں، انھیں سترہ، اٹھارہ سال کی عمر میں ریکروٹ کریں جس طرح فوج میں ہوتا ہے اور ۳۵، ۳۶ سال کی عمر میں فارغ کر دیں۔ ان کے افسر انہی کے ساتھ رہیں۔ اس میں سے ۵۰۰ جوانوں پر مشتمل فسادات روکنے والی (anti riots) فورس بنائیں اور باقی کے ۲ ہزار وی آئی پیز اور عمارتوں کی حفاظت کریں۔

پچھلے دنوں اسلام آباد کی عدالتوں میں طالبان گھس آئے تھے جنھوں نے جج کو مار دیا۔ وہاں پولیس والے کھڑے تھے، مگر انھوں نے گولی نہیں چلائی اور کہا کہ ہم سے چل گئی تو ایک سال تک کیس ہمارے خلاف چلتا رہے گا۔ اگر آپ کی کوئی پروفیشنل فورس ہو جسے احتجاج اور دہشت گردی سے نمٹنے کی تربیت دی جائے تو سیکیورٹی کی حالت کئی گنا بہتر ہو جائے گی۔ میں نے کہا کہ یہ ڈھائی ہزار کی فورس شہر کے لیے کافی ہے، مگر ان کی رہائش اچھی ہو،

ان کی تذلیل نہ کی جائے' ان کو ٹرانسپورٹ کے ذریعے لایا جائے، جس طرح فوج اپنے جوانوں کا خیال رکھتی ہے، فورس زیادہ نہ ہو مگر پوری طرح پیشہ ور ہو۔

''اس اسکیم کے لیے ہمیں پیسے بھی مل گئے مگر تب تک میرا تبادلہ ہو چکا تھا۔ انھوں نے بعد میں اسلام آباد پولیس سیکیورٹی ڈویژن بنا دیا۔ میرے منصوبے والی فورس یہ ایک قسم کی پولیس ہی تھی۔ یہ پولیس آفیسروں کے ماتحت تھی مگر اس کی تربیت پیراملٹری انداز میں ہونا تھی۔ اس میں ریپڈ فورس اور اینٹی ٹیررسٹ فورس بھی شامل ہوتی۔ اگر یہ کامیاب ہو جاتا تو پھر دوسرے شہروں کے لیے بھی یہی نظام وضع کیا جا سکتا تھا۔ میں نے اس پر ایک کتابچہ بھی لکھ کے دیا جس پہ میں نے ڈیڑھ سال کام کیا تھا۔

اب دھرنوں کا مسئلہ سامنے آیا تو انھوں نے کہا' اسلام آباد پولیس کچھ نہیں کر سکتی' آپ پنجاب پولیس کو بلا لیے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ بڑی مہذب پولیس ہے۔ اب آپ دیکھیں کہ اسلام آباد میں دہشت گرد تو ہر طرح کے ہیں' وہ تو مہذب نہیں۔ پھر انھیں کنٹرول کرنے کے لیے آپ کو فورس تو چاہیے۔ چلیے آپ ساری فورس نہیں فارغ کر سکتے تو ان میں سے ۲ہزار کی نفری کم کر کے اس سے نئی فورس تیار کر لیں۔ گیارہ سال قبل میں نے حل بتایا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ اس میں کوئی جلد بازی نہیں کی جائے گی۔ اگر ان کی تربیت ایک سال کی ہے تو یہ نتیجہ ایک سال بعد ہی آئے گا۔''

ذوالفقار علی بھٹو نے بیوروکریسی کو حاصل آئینی تحفظ ختم کر ڈالا

س: آپ نے شعبہ ٹرانسپورٹ میں بھی کافی کام کیا' اس کے کیا نتائج نکلے؟

ج: ''میں جب فیصل آباد میں کمشنر تھا تو وہاں مجھے اتنی آزادی میسر تھی کہ میں نے کبھی صوبائی حکومت سے کچھ پوچھا ہی نہیں! ایوب خان کے دور سے شہر کے لیے بائی پاس بنانے کا مطالبہ چلا آ رہا تھا' کیونکہ ہر سڑک گھنٹا گھر سے ہو کے جاتی ہے۔ لہٰذا ہر سڑک پر بہت ہجوم رہتا۔ ایوب خان کے زمانے سے فنڈ نہیں آ رہے تھے۔ میں نے وہاں سپرنٹنڈنٹ انجینئر سے گزارش کی کہ سروے کرو اور دیکھو کہ ہماری کتنی سڑکیں ہیں، فارم ٹو مارکیٹ روڈ ہے، ڈسٹرکٹ کونسل کی سڑک ہے، میونسپل کمیٹی کی سڑک ہے۔ انھیں ملا کر اگر ہم کوئی سرکٹ بنا لیں تو کتنی نئی سڑکیں بنانا پڑیں گی۔ ایک مہینے بعد مجھے بتایا گیا کہ یہ بائی پاس ۴۰ کلومیٹر طویل ہے۔ گوڈلیاں والا سے لے کر جھنگ تک اور اس میں صرف ۷ کلومیٹر ہمیں نئی سڑک بنانا پڑے گی اور ہم پرانی سڑکوں کو کشادہ کر سکتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یہ دس کروڑ روپے کا نسخہ ہے۔ یہ ۱۹۹۳ء کی بات ہے، اس وقت کے دس کروڑ

روپے آج کے سو کروڑ روپے کے برابر تھے۔ میں نے یہ کیا کہ ڈسٹرکٹ کونسل' میونسپل کمیٹی اور فارم ٹو مارکیٹ والوں کو اپنی اپنی سڑکیں بنانے کا حکم دے دیا۔

''آخر میں صرف تین کروڑ روپے کی ضرورت رہ گئی۔ اس پوری اسکیم کا کوئی پی سی ون نہیں بنا اور منظوری کے لیے پی این ڈی پی کے پاس بھی نہیں گئی۔ ہائی وے کے ایس ای نے اسے سپروائز کیا، اور ایک سال میں بائی پاس سڑک بن گئی۔ اس کے ذریعے سارے شہر کا کلچر ہی بدل گیا اور تمام گودام وہاں منتقل ہو گئے۔ زمینوں کی قیمتیں بڑھ گئیں۔ کچہری بازار کا ہجوم کم ہوا اور گھنٹا گھر میں بھی ہجوم گھٹ گیا۔

''پھر میں نے ایک اور کام کیا۔ تب چناب کلب میں لوگوں کا ہجوم رہتا تھا۔ میں نے میونسپل کارپوریشن والوں سے پوچھا کہ ہر مناسب جگہ پر ایک اسپورٹس کلب بن سکتا ہے؟ انھوں نے کہا، جی بن سکتا ہے۔ میں نے لاہور سے آرکیٹیکٹ بلایا اور اسے کہا کہ ایک اسپورٹس کمپلیکس ڈیزائن کرو جس میں کثیرالمیعاد ہال ہوں یعنی وہاں والی بال کھیلا جا سکے، اس میں اسکوائش کورٹ' ساتھ چھوٹا سا جم اور لائبریری بھی ہو۔ وہ ڈیزائن تیار ہو گیا' تو برائے تعمیر پیسے اکٹھے کرنے کے لیے میں نے فیصل آباد کے صنعتکار بلائے۔ بارہ لوگ تھے، انھوں نے شاید بارہ بارہ یا پندرہ پندرہ لاکھ روپے دیے۔ انھوں نے ۷۰ فیصد پیسے دیے اور ۳۰ فیصد میونسپل کارپوریشن نے وسائل فراہم کیے۔ ہمارا آئیڈیا چھ کورٹس بنانے کا تھا۔ چھ تو نہ بن سکے چار بن گئے۔ پنجاب میں صرف منٹو پارک کا ہال ایسا ہے کہ وہاں والی بال کھیلا جا سکتا ہے یا پھر فیصل آباد کے چار کمپلیکس ہیں۔ اس وقت آئیڈیا یہ تھا کہ علاقہ مجسٹریٹ کلب کا صدر ہو گا اور گلی کوچوں میں کھیلنے والا بچہ بھی وہاں کھیل سکے گا۔

''اس کے بعد میں نے ٹرانسپورٹ کی بہتری کے لیے کام کیا۔ فیصل آباد میں سوزوکی تھی یا رکشے چلتے۔ ان میں بھیڑ بکریوں کی طرح مسافر ٹھونس دیے جاتے۔ میں نے کبھی ٹرانسپورٹ پر کام نہیں کیا تھا۔ تاہم ایک شمالاً جنوباً اور ایک مشرقی مغربی روٹ بنایا۔ اور وہ سارے کچہری بازار سے گزرتے تھے۔ درمیان میں ایک انٹرچینج بنایا۔ اس طرح روٹ پلاننگ کی گئی۔ میں نے کہا کہ درمیان میں ایک ایسی جگہ ہو جہاں پہ بسیں کھڑی ہو سکیں۔ وہاں کوئی ایسی جگہ ہی نہیں تھی۔ جہاں کچہری بازار ختم ہوتا وہاں سرکاری گھر تھے۔ ان سے میں نے کوئی آٹھ کینال زمین نکالی اور ایک سنٹرل ٹرمینل بنایا۔ اس وقت پرائم منسٹر اسکیم کی ویگنیں بہت آئی ہوئی تھیں۔ مفت میں مل رہی تھیں جو لوگوں نے لے لیں مگر ان کا کوئی خاص استعمال نہیں ہو رہا تھا۔

میں نے ایک کمپنی بنائی اور اسے رجسٹرڈ کرایا۔ اس کا نام رکھا: ''فیصل آباد اربن ٹرانسپورٹ سسٹم''۔ اس کا ایک لوگو ڈیزائن کیا اور ہم نے کہا، جو شخص اپنی ویگن اس سسٹم میں ڈالتا ہے' ہم اس کو روٹ پرمٹ دیں گے۔ وہ ہماری مرضی کے مطابق چلے گا، اس کو اچھا کرایہ ملے گا' مگر گاڑی میں اگر چودہ سیٹیں ہیں تو وہ چودہ لوگ ہی بٹھائے گا، اوور لوڈنگ نہیں ہو گی۔ گاڑی کا دروازہ بند ہو گا اور موسیقی نہیں چلے گی۔ ان کو سپروائز کرنے کے لیے سیکیورٹی کمپنی سے ہم نے سو آدمی رکھ لیے۔ یہ لوگ ان گاڑیوں کے روٹ چیک کرتے تھے۔ ہم نے فی سواری کرایہ پانچ روپے طے کیا۔

"یہ کرایہ دوسری سوزوکی سے زیادہ مگر رکشے سے کم تھا۔ پہلے تو ہم نے مجسٹریٹ کے ذریعے پکڑ دھکڑ کر کے ویگنیں ڈالیں جو بڑی کامیاب ثابت ہوئیں۔ رفتہ رفتہ ویگن والوں کو بڑا مالی فائدہ ہونے لگا۔ کیونکہ مسافروں کو جب باعزت نشست ملی، عورتیں اور بچے آسانی سے سفر کرنے لگے تو وہ ادھر ہی آنے لگے۔ ہم ویگن والوں سے ۱۵۰۰ روپے مہینہ لیتے تھے۔ یوں باقاعدہ آمدنی ہونے لگی۔ سوچا تھا کہ اس آمدنی سے ٹریفک پولیس کی کارکردگی بڑھانے کے لیے اقدامات کریں گے۔ لیکن جب میرا تبادلہ ہوا تو وہاں جو لوگ تھے' انھوں نے گاڑی رجسٹرڈ کرنے پہ رشوت لینا شروع کر دی۔ بہرحال یہ ماڈل چلتا رہا اور فیصل آباد کو بغیر کسی سرکاری سرمایہ کاری کے ایک ٹرانسپورٹ سسٹم مل گیا۔

س: آپ نے اتنا عظیم کارنامہ انجام دیا' اس پر حکومت نے آپ کی بڑی قدر افزائی کی ہوگی؟

ج: "میں اس کی کتھا بھی سناتا ہوں۔ جب شہباز شریف آئے تو انھوں نے فرنچائز ٹرانسپورٹ ماڈل متعارف کرایا۔ یوں اچھے خاصے سسٹم کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ ان کے پہلے دور حکومت میں ایک تجویز آئی تھی کہ جو شخص ۵۰ بسیں چلائے، اسے دو روٹ کی اجارہ داری دے دی جائے۔ چناں چہ چودھری نذیر کے بیٹے زاہد نذیر نے بسیں چلا لیں۔ اس تجربے کی بنا پر جب میں ۲۰۰۵ء میں ریٹائرڈ ہوا تو شہباز شریف نے کہا کہ آپ لاہور کے لیے کچھ بنائیں۔ میں نے ہامی بھر لی۔ انھوں نے پھر ایک ٹاسک فورس بنا دی۔ اس میں مایہ ناز لوگ شامل تھے اور میں اس فورس کا سربراہ تھا۔ ہم نے تین مہینے کام کر کے ایک اسکیم بنائی کہ لاہور میں بھی ایک کمپنی بنائی جائے۔ اس کو پارلیمان کے ذریعے یہ اختیار دلایا جائے کہ وہ روٹ پرمٹ دے اور بسوں کو ٹریک بھی کرے۔

کمپنی کی بسیں ڈسپلن میں لانے کے لیے میں نے کہا کہ جیسے یہ ٹریفک پولیس ہے' اسی طرح ایک پولیس الگ سے بنائی جائے جو پبلک ٹرانسپورٹ کو مانیٹر کرے۔ ہم اس کو ریگولیٹ کریں اور دیکھیں گے کہ اس روٹ پر اسے کتنے روپے وارے کھاتے ہیں۔ اس کا کام صرف بس چلانا ہے، باقی نظام سے اس کا کوئی تعلق یا کسی قسم کا کوئی واسطہ نہیں ہوگا۔

"ہم نے پھر سرمایہ کار سے کہا کہ آپ کا روٹ نمبر ۱۰ ہے اور تم نے ہمیں ۳۰ بسیں دینی ہیں۔ ٹکٹ آپ لیں گے اور ٹائم ٹیبل ہم دیں گے۔ ہمیں معلوم ہے کہ آپ کو اس روٹ پر چلنے کے لیے پانچ روپے کلومیٹر زیادہ درکار ہوں گے تاکہ پانچ سال میں سرمایہ واپس آجائے۔ ہم نے بس پہ ٹریکر لگایا کہ بس جتنے کلومیٹر چلے گی' وہ کمپیوٹر ہمیں بتا دے گا۔ اس کے اصول و قوانین بنائے۔ کرایہ طے کرنے اور سروے کرانے کے لیے بڑی تگ و دو کے بعد ایک یونیورسٹی کے ماہر سے سروے کرایا۔

"اب سرمایہ کاروں نے کہا کہ آپ کا نظام بہت اچھا ہے' مگر ہمیں نہیں لگتا کہ پنجاب حکومت کوئی سبسڈی دے گی۔ میں نے شہباز شریف سے کہا کہ مجھے ایک سال کے لیے دو ارب روپے چاہئیں اور یوں ایک ہزار بس اس شہر میں چل جائے گی۔ وہ دو ارب روپے ان کو بطور سبسڈی دینے ہوں گے' کیونکہ اربن ٹرانسپورٹ میں زیادہ منافع نہیں

میں عمران خان کے علاوہ کسی لیڈر کے ساتھ بیٹھنے کو تیار نہیں' سبھی ذاتی خواہشات کے اسیر ہیں

ہوتا اور اسی لیے کوئی بڑا سرمایہ کار آگے نہیں آتا۔ میں نے کہا کہ جو دو ارب روپے آپ نے بجٹ میں رکھے ہیں' وہ آپ کمپنی کو مستقل دے دیں۔ اس سلسلے میں بے شک آپ چار ایم پی اے کی کمیٹی بنا دیں جن پہ آپ کو اعتماد ہے۔ ایک سسٹم ہوگا جس کے ذریعے جو شخص بس چلائے گا۔ اسے شیڈول کے مطابق ہر مہینے ہر ہفتے پیسے ملتے رہیں گے۔ آپ اپنا یہ بندوبست رکھیں کہ ہمیں دو ارب روپے ہر سال ملتے رہیں۔

"ایک سال تین مہینے میں ان سے کہتا رہا کہ پیسے کمپنی کو تو دیں، مگر وہ کہتے کہ آپ کام شروع تو کریں۔ فنانس ڈیپارٹمنٹ کے پاس پیسے ہیں' آپ کو مل جائیں گے۔ انھوں نے ایک دن طعنہ دیا کہ آپ تو کہتے تھے کہ ایک سال میں ہزار بسیں چل جائیں گی۔ میں نے کہا' یہ نظام اس قدر مضبوط ہے کہ آپ کے پوتے بھی اسے استعمال کریں گے' کیونکہ ایک دفعہ جب سسٹم بن جائے تو پائیدار بھی ہوگا۔ یہ بھی کہا کہ آپ کاروں پر ٹیکس لگائیں۔ اس وقت شاید کار پہ تین ہزار روپے ٹیکس تھا۔ میں نے اسے ڈبل کرنے کی تجویز دی تاکہ وسائل آٹومیٹک طور پر کمپنی میں آئیں اور سرمایہ کاروں کو سبسڈی ملتی رہے۔ یہ نہ ہو کہ فنانس سیکرٹری بدل گیا تو ان کو دو ارب روپے نہیں مل رہے۔ لیکن انھوں نے اس امر پر کوئی توجہ نہ دی۔ ان کے ذہن میں شاید اس وقت میٹرو بس آ گئی تھی۔ میں جب اس فورس کا حصہ بنا تو میں نے کہا کہ میں تنخواہ بالکل نہیں لوں گا، لیکن آپ میری بات مانیں گے۔

میں نے ڈیڑھ سال کام کیا۔ اس دوران لاہور ٹرانسپورٹ کا لوگو اور سب کچھ بنایا۔ میں نے اپنے دوست ارشد چودھری کا دفتر لے کر ایک ہینڈ بیگ سے کام شروع کیا تھا۔ بعد میں لبرٹی میں جو انجینئرنگ کونسل کی بلڈنگ ہے' اس کا ایک پورا فلور لیا اور وہاں دفتر بنایا۔ میرٹ کی بنیاد پر افسران اور عملہ بھرتی کر کے پورا ادارہ کھڑا کر دیا۔ جب انھوں نے کوئی دلچسپی نہیں لی تو میں نے استعفا دے دیا۔ انھوں نے شکریہ کرنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی۔

اس کے بعد پھر میٹرو بس شروع ہو گئی جس میں ساڑھے تین پونے چار ارب روپے ایک روٹ کا لگتا ہے اور میں ۴۰ روٹوں کے لیے صرف دو ارب روپے مانگ رہا تھا! یہ محض ۶۲ بسیں چلتی ہیں جبکہ ہمارے پروگرام کے مطابق ایک ہزار بسیں چلنا تھیں۔ فرق صرف یہ تھا کہ اگر یہ ۴۵ منٹ میں جاتی ہے تو وہ ڈیڑھ گھنٹے میں جاتی۔ اگر آپ ویگنیں ختم کر دیتے تو ہماری بس بھی تیز ہو جاتی۔ اب سنا ہے کہ اس ادارے کو میٹرو میں ضم کر رہے ہیں۔ جب میں نے چھوڑا تھا تو ۱۰۰ آدمی تھے۔ وہ پھر ۵۰۰ بسیں اپنے سرمائے سے لے آئے اور اس کے بعد لوگ تلاش کرتے رہے کہ ۵۰ بسیں تم چلا لو اور ۵۰ ہم چلا لیں۔ ان کی چار سو یا پانچ سو بسیں آئی تھیں، جبکہ میرے ماڈل میں وہ بسیں نجی سرمایہ کاروں نے خریدنی تھیں۔ ہم نے صرف سبسڈی دینا تھی۔

س: اب آپ کا بنایا سسٹم لاہور میں چل سکتا ہے یا نہیں کیونکہ میٹرو بس بن گئی ہے؟

ج: "کیوں نہیں چل سکتا؟ میٹرو بس تو ایک روٹ ہے جبکہ لاہور شہر تو بہت بڑا ہے۔

س: اس میٹرو منصوبے کا مستقبل کیا ہے؟

ج: ''انھوں نے جو پل وغیرہ بنائے تو میرے خیال میں ۶۰۔۷۰ ارب روپے خرچ کر دیے۔ یہ دیکھیے کہ آپ نے صرف خوب صورت بسیں دکھانے کے لیے اتنے پیسے لگا دیے۔ ۴۰ ارب روپے میں تو ایک شہر کو پیرس بنایا جا سکتا ہے۔

س: آپ نے بہت سے سیاستدانوں کے ساتھ کام کیا اور انھیں قریب سے دیکھا۔ وہ کیا سمجھتے نہیں، سنتے نہیں یا مانتے نہیں' آخر ان کا مسئلہ کیا ہے؟

ج: ''ہر سیاست دان کا اپنا انداز کار ہے۔ یہ باہر جائیں تو وہاں سے کوئی آئیڈیا لے آتے ہیں۔ مثال کے طور پر بڑے میاں صاحب کی تو دلی خواہش ہے کہ ''ماڈل ٹاؤن تو مری'' تیز رفتار ریل یا موٹروے بن جائے۔ یہ ان کا مشن تھا۔ اب وہ گوادر کی بات کرتے ہیں' مگر بات یہ ہے کہ کیا محض انفراسٹرکچر سے سارے مسائل حل ہو جائیں گے؟

س: کہا جاتا ہے کہ انفراسٹرکچر بنانے سے معیشت میں تیزی آتی ہے، روپیہ پیسہ آتا ہے، لوگوں کو روزگار ملتا ہے۔ جب وسائل کم ہوں اور آپ کو معیشت وسیع کرنی ہو تب انفراسٹرکچر اہمیت تو رکھتا ہے؟

ج: میں ایک مثال دیتا ہوں۔ اگر میرے پاس ۵۰ لاکھ روپے ہیں اور میں اس سے ایک گھر بنا لوں تو میرا گزارہ کیسے ہوگا؟ جب کہ کسی اور شخص نے ۵۰ لاکھ میں سے بیس لاکھ کا گھر بنوایا، دس لاکھ بچوں کی تعلیم پر صرف کیے' پانچ لاکھ ان کی صحت پہ خرچ کیے اور پندرہ یا بیس لاکھ کاروبار میں لگایا۔ اب آپ دیکھیں کہ کون سا منصوبہ بہتر ہے؟''

میٹرو بس منصوبہ انتہائی مہنگا ہونے کے باعث تنقید کی زد میں۔
ایک رپورٹ کی رو سے منصوبہ جاری رکھنے کے لیے
پنجاب حکومت روزانہ 5 لاکھ روپے کی سبسڈی دے رہی ہے

س: کیا وجہ ہے کہ سیاسی حکومتوں کو پورا وقت نہیں دیا جاتا؟ ان کے ذہن میں یہی ہوتا ہے کہ سال ڈیڑھ سال ہی میں کچھ کر جاؤ۔ میاں صاحب کو سال بھی نہیں ہوا کہ انھیں دھرنے اور اسٹیبلشمنٹ کے ذریعے ہٹانے کی کوشش کی گئی؟

ج: ''پچھلی حکومت کو پانچ سال پورے دیے گئے اور نتیجہ لوگوں نے دیکھ لیا کہ انھوں نے کوئی کام نہیں کیا۔ اب لوگ اس نتیجے پہ پہنچ چکے کہ اگر حکمران کام نہیں کرتے تو انھیں نکال دو۔ حقیقت یہ ہے کہ حکمران طبقے نے گٹھ جوڑ کیا ہوا ہے۔ پہلے سال تو انھیں کسی نے تنگ نہیں کیا۔ اب اس سال میں سمت کا تعین ہو جانا چاہیے تھا۔ ایک سال میں یہ ہوا کہ ساڑھے چار سو بلین روپے اکٹھے کر کے بجلی کی کمپنیوں کو دے دیے۔ اب کس بیوقوف کو یہ نہیں پتا تھا کہ جب

تک آپ بجلی چوری ختم اور ریکوری نہیں کریں گے تو ایک سال میں دوبارہ ساڑھے چار سو ارب روپے کے بل جمع ہو جائیں گے۔ انھوں نے کہا کہ کوئلے کے بجلی گھر بنائیں گے۔ اب ایک سال ہو گیا ہے اور انھیں سمجھ نہیں آتا کہ گوادر میں بنانا ہیں یا اندرون سندھ۔ جب اندرون سندھ بنانے کا سوچا تو لوگوں نے کہا کہ اس کو چلانے کے لیے تو آپ کو دس ٹرینیں چاہییں ہوں گی روزانہ کوئلہ لانے کے لیے! اب شاید پھر گوادر ہی میں بنانے کا سوچ رہے ہیں۔ انھوں نے کوئی کام ٹھیکیداروں کے بغیر نہیں کیا۔ دنیا میں کوئی قوم ایسی ہے جو بغیر صحت اور تعلیم کے ترقی کر سکے؟''

س: نورانی صاحب! آپ بیوروکریٹ ہیں۔ سرکاری معاملات کو آپ نے نہایت قریب سے دیکھا ہے۔ اب جس سیاسی پارٹی میں آپ آئے ہیں' اس کا تجربہ کیسا رہا؟

ج: ''میں سیاسی پارٹی میں کوئی ذاتی مقصد پورا کرنے نہیں آیا۔ بات یہ ہے کہ عمران خان حماقتیں کرتا ہوگا' لیکن آج اس سے زیادہ ایماندار' دلیر اور نیک نیت آدمی کوئی نہیں اور میں ان کی انہی خوبیوں کا معترف ہوں۔''

س: کب سے معترف ہیں؟

ج: ''میں انھیں پچھلے پانچ برس سے جانتا ہوں۔ شاید وہ اچھا سیاستدان نہیں، اچھا ایڈمنسٹریٹر بھی شاید نہ ہو' مگر بنیادی بات یہ ہے کہ وہ ایماندار ہے۔ اگر مجھے شک ہوا کہ یہ شخص اپنے لیے کچھ کر رہا ہے' اپنا فائدہ دیکھتا ہے تو پھر میں اسے چھوڑ دوں گا۔ جہاں تک اس کی فہم و فراست یا عقل مندی کا تعلق ہے تو اس حوالے سے آپ سوال کر سکتے ہیں۔ ہم بھی اس سے بحث اور لڑائی کرتے ہیں' مگر اس میں خاصیت ہے کہ جس چیز کو وہ درست سمجھے' کر گزرتا ہے۔''

س: یہ کوئی اچھی بات تو نہیں؟

ج: ''میں یہ نہیں کہہ رہا کہ یہ اچھی بات ہے۔ مگر اس کی خوبیوں میں سے یہ بھی ایک خوبی ہے۔ آپ خود سوچیے، جس شخص کے ۹۰ فیصد اثاثے ملک سے باہر ہوں' قوم اس پہ کیسے اعتماد کر سکتی ہے؟

س: اکثر لیڈروں کے اثاثے باہر ہیں۔

ج: ''باقی تو چھوٹے لیڈر ہیں نا' چوٹی کے لیڈروں کے ساتھ بھی یہی معاملہ درپیش ہے۔ یہ تو ہماری قیادت کر رہے ہیں۔ ان سے پھر آپ کیا توقع کر سکتے ہیں؟

س: آپ کے خیال میں پی ٹی آئی صحیح اصولوں پر پھل پھول رہی ہے؟

ج: ''میں سمجھتا ہوں کہ وقت کے ساتھ ساتھ جماعتی کام میں بہتری آ رہی ہے۔ میرے خیال میں کام سیکھنے کے لیے کچھ نہ کچھ وقت تو لگتا ہے اور قیمت تو دینا پڑتی ہے۔''

س: آپ کی پارٹی میں جو اندرونی انتخابات ہوئے، تو اس کے حوالے سے کئی منفی باتیں سامنے آئیں۔ آپ کے الیکشن ٹریبونل نے ہر نوع کی بے قاعدگیوں کے باعث انھیں کالعدم قرار دے دیا ہے اور مارچ میں نئے انتخابات کرانے کی بات کی ہے۔

ج: ''بات وہی ہے کہ معاملات کو صحیح خطوط پر چلانے میں وقت لگتا ہے۔ اس الیکشن میں ساری چیزیں بہتر ہو

سکتی تھیں۔ مثال کے طور پر ایک بحث ہوئی کہ ٹکٹ تمام نوجوان اور شریف لوگوں کو ملنے چاہئیں یا اُن کو بھی جو تھوڑے غنڈے مگر تجربہ کار ہیں۔ فیصلہ یہ ہوا کہ ۳۰ فیصد، ۳۵ فیصد جوانوں کو دے دو جن کا تجربہ نہیں، ۷۰ فیصد باقیوں کو دے دیں جن کا تجربہ ہے۔ تحریک انصاف اس وقت شاید اتنی اچھی تنظیم نہیں' لیکن دوسری یا تیسری دفعہ جماعتی الیکشن کے بعد بہتر ہو جائے گی۔''

س: لوگ کہتے ہیں کہ الیکشن میں پیسا بہت استعمال ہوا۔ مثلاً علیم خان جیسے لوگوں نے دولت کی بنا پہ ٹکٹ لے لیے۔ چودھری اعجاز اور محمود الرشید جیسے لوگ' جو بڑے عرصے سے جماعت کے لیے کام کر رہے تھے، وہ پیچھے رہ گئے اور پیسا آگے آگیا۔

ج: ''میں سمجھتا ہوں کہ آگے چل کر حالات بہتر ہوں گے۔''

س: اچھا یہ بتائیے کہ پی ٹی آئی کے دور حکومت میں خیبر پختون خواہ کے حالات کچھ بہتر ہوئے؟

ج: ''اس صوبے میں کرپشن وزیر سے لے کر نچلی ہر سطح تک خاصی کم ہو چکی ہے۔ کرپشن ختم کرنے کے لیے ہی خان صاحب نے پہلے شیر پاؤ کے وزیر ہٹائے، حالانکہ حکومت گر سکتی تھی۔ اس کے بعد کوئی دو تین اپنے وزیر بھی نکال دیے۔ دوسری بات یہ کہ پولیس جیسا اہم محکمہ وہاں سیاسی دباؤ سے آزاد ہے۔ وزیر داخلہ کے ضلع میں ایس پی اس کی پسند کا نہیں لگا بلکہ آئی جی نے لگایا ہے۔ یہاں تک کہ تھانیدار بھی آئی جی کی اپنی پسند کے ہیں۔ وہ کسی کی کوئی سفارش نہیں لیتا۔ اس طرح وزیر تعلیم ہے، اس نے اساتذہ کی حاضری پہلے سے بہتر کر دی۔ طلبہ بڑی تعداد میں اسکولوں میں آ رہے ہیں۔ محکمہ صحت میں بھی اسی طرح بہتری آ رہی ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہم موازنہ کرتے ہیں کہ وہاں کوئی پل بنا؟ کوئی میٹرو بنی؟ یہ کام نہیں ہوئے' تو کہتے ہیں، وہاں کچھ بھی نہیں ہوا۔

س: نورانی صاحب اب اپنے بارے میں بھی کچھ بتائیں کہ تعلیم کہاں سے پائی، بچپن کہاں گزرا اور بیوروکریسی میں کیسے آئے؟

ج: ''میں ایک متوسط خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔ میرے والد ریلوے میں آفیسر تھے۔ ہم جالندھر سے پاکستان آئے۔ والد کے دیگر بھائی ہجرت کے بعد کراچی چلے گئے۔ میرے والد صاحب کی پہلی تقرری رائیونڈ میں ہوئی۔ بعد میں شیخوپورہ اور خانپور بھی رہے۔ میں جب گیارہ سال کا ہوا تو مجھے کیڈٹ کالج سرگودھا داخل کرا دیا گیا۔ اس اسکول میں شاندار طالب علم زیر تعلیم تھے۔ مجھ سمیت انہی طلبہ نے آج ایک ٹرسٹ بنا رکھا ہے۔ اس کے پہلے چیئرمین تھے ائیر چیف مارشل فاروق فیروز خان۔ اب پچھلے چار سال سے میں چیئرمین ہوں۔ اس کے ایک رکن جنرل احسان الحق ہیں جو آئی ایس آئی کے چیف رہے۔

ہم دوستوں نے سوچا کہ ملک کے لیے کچھ اچھا کرنا چاہیے۔ جب جنرل احسان الحق آئی ایس آئی میں تھے اور میں وزارت داخلہ میں، تو ہم نے کچھ پیسے جمع کیے۔ ٹنڈو اللہ یار میں ہمارے ایک پرانے ساتھی نے ۵۰ ایکڑ زمین ہمیں عطیہ کی۔ اس پر ہم نے ایک کیڈٹ کالج بنایا۔ اس وقت وہاں ساڑھے چار سو بچوں کو تعلیم دے رہے ہیں۔ ان

میں سے ۳۵ فیصد مفت تعلیم پاتے ہیں۔ اس کا معیار ایچی سن جیسا ہے۔ ہمارا مشن ہے کہ ہر صوبے میں ایک کیڈٹ کالج بنانا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہمیں بہت اچھی تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔ اس لیے دوسرے بچوں کو بھی معیاری تعلیم ملنی چاہیے۔ ہم نے وانا اور قبائلی علاقوں کے بچوں کو لمر میں پہنچا دیا ہے۔ ہمارے اسکول کے بچوں میں سے کوئی اسکالرشپ پہ ترکی چلا گیا، تو کوئی یورپی ملک میں۔ ہمارے پاس بچے ۱۲ سال کی عمر میں آتے اور ۱۸ سال کی عمر تک رہتے ہیں۔ کیڈٹ کالج سے پڑھ کر میں گورنمنٹ کالج میں آ گیا اور وہاں سے بی ایس کیا۔

س: آپ کے خاندان کا مستقل ٹھکانا کہاں تھا؟

ج: ''والد صاحب لاہور ریلوے کالونی میں رہتے تھے۔

س: آپ کی پیدائش کب ہوئی؟

ج: ''۱۹۴۵ء میں پیدا ہوا۔ ۱۹۶۰ء میں میٹرک کیا اور ۱۹۶۶ء میں ایم ایس سی جیالوجی پنجاب یونیورسٹی سے کیا۔ مجھے مہم جوئی کا بہت شوق تھا چنانچہ ۱۷ سال کی عمر میں اپنے دوست کے ساتھ کچھ پیسے لے کر بذریعہ سڑک تہران گیا۔ ہم نے وہاں کوئی مہینہ گزارا۔ پھر جب ۱۹ سال کا ہوا تو والد صاحب سے ۵۰۰ روپے لے کر ہم دونوں دوست ہائیکنگ کرتے ہوئے لندن گئے۔ پاکستان سے ریل پر ایران گئے، پھر بس کے ذریعے ترکی پہنچے۔ ترکی میں ریل کے ذریعے استنبول جا پہنچے جہاں سے اورینٹ ایکسپریس چلتی تھی۔ اس پہ یورپ چلے گئے۔ لندن میں نے چار ہفتے مزدوری کی اور اتنا پیسہ کمایا کہ لندن کی سیر کرنے کے بعد پیرس بھی گئے۔ ساڑھے تین چار مہینے بعد واپس آ گئے۔ اس سفر سے خود اعتمادی پیدا ہوئی۔ ہم ایک بھائی اور ایک بہن ہیں۔ جب میں پنجاب یونیورسٹی میں تھا تو میں نے ۱۹۶۵ء میں یونین کا الیکشن لڑا۔ اس زمانے میں وکیل حامد خان سیکرٹری تھے۔ ایم ایس سی کرنے کے بعد پنجاب یونیورسٹی میں جیالوجی ڈیپارٹمنٹ میں لیکچرار ہو گیا۔ ۱۹۶۷ء میں سی ایس ایس کا امتحان دیا۔ اس وقت میرا خاندان آئل کمپنیوں میں شامل تھا۔ اس وقت ان کی آمدن ۲۰ ہزار روپے تھی اور سی ایس پی آفیسر کی تنخواہ صرف ساڑھے تین سو روپے۔ میں زیادہ قابل طالب علم نہیں تھا زیادہ تر وقت غیر نصابی سرگرمیوں میں گزرتا۔ جیسے تقریریں کرنا، الیکشن لڑنا پھر بھی میں نے تین مہینے سی ایس ایس کی تیاری کی اور میری پاکستان میں چوتھی پوزیشن آئی۔ پہلی پوزیشن اور مجھ میں صرف ۲ نمبروں کا فرق تھا۔

۲۰ فیصد میرٹ کا کوٹہ ہوتا' اس کے بعد پنجاب کا کوٹہ تھا۔ بیس فیصد میں یہ چار سیٹیں شامل تھیں۔ ہم ٹاپ کے چار لڑکے میرٹ پر آئے۔ ۱۹۶۸ء میں سول سروس جائن کی اور ۲۰۰۵ء میں ریٹائر ہوا۔ ۳۷ سال نوکری کی۔ میں نے ایک دن کی بھی ایکسٹینشن نہیں مانگی اور نہ ملی۔ ۶۰ سال کی عمر میں ریٹائر ہوا۔

س: آپ نے طویل عرصہ بیوروکریسی میں گزارا۔ اس دوران کچھ دلچسپ واقعات ضرور پیش آئے ہوں گے؟

ج: ''میں سمجھتا ہوں کہ اگر مجھے دوسری زندگی بھی ملے تو مسائل کے باوجود سول سروسز میں جانا پسند کروں گا۔ کیونکہ سرکاری نوکری میں پہچان ملی تبھی آج آپ انٹرویو لے رہے ہیں جبکہ ہمارے جو دوست کروڑ پتی ہیں، شاید انھیں کوئی جانتا بھی نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ جہاں بھی نوکری کی وہاں یہ مقصد سامنے رکھا کہ وقت نہیں گزارنا بلکہ کچھ کر کے دکھانا ہے، جیسے میں نے فیصل آباد اور سنگاپور کی کہانی سنائی۔ میں جب نماز پڑھتا ہوں تو اکثر یہ دعا مانگتا ہوں کہ اے اللہ مجھے توفیق دے کہ میں قومی سسٹم درست کرنے کے لیے کچھ کر سکوں۔ اپنے اور بچوں کے لیے تو سارے ہی کرتے ہیں۔ یاد اس شخص کو رکھا جاتا ہے جو اپنے سسٹم کے لیے کچھ کرے۔ درویشی پر میں نے کبھی یقین نہیں رکھا۔

جب میں سیکرٹری تعلیم تھا' تو میں نے ایک این جی او بنائی۔ اس کا نام تھا ریڈ (READ) یعنی Rural Education And Area Development۔ اس میں کچھ پیسے اپنی طرف سے ڈالے اور باقی اکٹھے کیے۔ میں پنجاب کا سیکرٹری تعلیم ۲ سال رہا۔ ۲۰۱۳ء تک میں نے یہ کام کیا کہ چھ اسکول لیے اور لاکھوں روپے ان پہ خرچ کیے۔ فرنیچر لیا، واش روم بنوائے، بجلی لگوائی، ہر اسکول کو ایک ایک استاد دیا اور اس کی تنخواہ ادا کی' لیکن منصوبہ اتنا کامیاب نہیں ہوا' کیونکہ ہم اساتذہ سے باز پرس نہیں کرتے تھے۔ ان کی یونین مضبوط ہے۔ جب تک آپ ان کو پیسے دیتے رہتے ہیں' وہ بڑے خوش رہتے ہیں۔ جب آپ کہتے ہیں کہ پڑھاؤ تو اساتذہ ناراض ہو جاتے ہیں۔ بڑے دعوؤں اور اشتہاروں کے ساتھ چیزیں شروع ہوتی پھر ختم ہو جاتی ہیں۔''

پولیس کے انتظام کی اوور ہالنگ سے امن وامان کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے

س: تحریک انصاف نے جو دھرنا دیا کیا وہ پاکستان کے لیے مفید ثابت ہوا؟ اگر اگلے سال انتخابات میں یہ کامیاب ہوتی ہے' تو وہ حقیقی تبدیلی لے آئے گی؟

ج: ''ایک نئی پارٹی میں اہلیت آہستہ آہستہ جنم لیتی ہے۔ نئے ورکر آتے رہتے ہیں۔ کوئی جذباتی ہوتا ہے اور کوئی نااہل۔ سال ڈیڑھ سال میں معاملہ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ پی ٹی آئی میں میرے جیسے لوگ بھی ہیں جو زیادہ سامنے نہیں آتے۔ دھرنے میں جاتا' تو کنٹینر پر پیچھے بیٹھا رہتا' کیونکہ مجھے دھکم پیل کی عادت نہیں اور مجھے کوئی شہرت بھی نہیں چاہیے۔ اللہ نے جو عزت دی، وہ کافی ہے۔ سو کام کرنے والے بندے بھی ہیں' مگر جیسے میں نے عرض کیا کہ وقت کے ساتھ پارٹی بہتر ہو جائے گی۔ پارٹی قیادت کو یہ خواہش نہیں کہ سارے فیصلے وہ خود کرے، بلکہ وہ میرٹ پہ کام کرنا چاہتی ہے۔ آپ شوکت خانم کا تجربہ دیکھ لیں، ہر کام ایک نظام کے تحت میرٹ پر ہو رہا ہے۔

س: ہم جب ہارورڈ یونیورسٹی گئے تو وہاں ایک دانشور، مائیکل پوٹر کے ساتھ ہمارا دو تین دن مکالمہ جاری رہا اور بحث ہوتی رہی۔ انھوں نے کہا کہ اب حکومتیں بہت سے محکمے تنہا نہیں چلا سکتیں جن میں سرفہرست تعلیم' صحت اور ٹرانسپورٹ ہیں۔ نجی سیکٹر کو بھی انتظام مملکت میں شامل کرنا پڑے گا۔ آپ نے بھی کہا کہ نجی سیکٹر کے ذریعے کام بہتر ہو سکتا ہے۔ دراصل مسائل بہت زیادہ ہیں' جیسے پولیس کا معاملہ، پٹواری کا مسئلہ، صحت، تعلیم وغیرہ۔ لیکن خیبر پختونخواہ میں ہمیں کچھ ہوتا نظر نہیں آتا؟

ج: ''خیبر پختونخوا میں تھوڑی سی پریشانی یہ ہے کہ وہاں کام کرنے والے پشتون ہونے چاہئیں' یعنی میں اگر پی ٹی آئی میں ہوں تو میرا وہاں بیٹھ جانا مناسب نہیں۔

س: جہانگیر ترین تو وہاں بہت آ جا رہے ہیں؟

ج: ''نہیں' وہ تو ریموٹ کنٹرول ہیں اور اس سے سارا کام نہیں ہو سکتا۔ مجھے بھی انھوں نے ایک مشاورتی گروپ میں ڈالا ہے' مگر اس طرح کام نہیں چلتا' کیوں کہ آپ ایک مشیر ہیں' چیف ایگزیکٹو تو نہیں۔ آپ روزانہ دفتر نہیں جاتے۔ آپ ایک دو ہفتے بعد پوچھ رہے ہیں کہ کیا ہوا؟ اس نے کوئی بات بتا دی، آپ واپس آ گئے۔ پھر وہاں چلے گئے۔ تو وہ جو آپ کی اہلیت ہے' وہ مکمل طور پر میسر نہیں۔ وہاں جو لوگ منتخب ہوئے' وہ پہلی دفعہ آئے ہیں۔ ان کا تجربہ ہے اور نہ کبھی انھوں نے سرکاری کام کیا ہے۔ چناں چہ انھیں کام کرتے ہوئے دشواری پیش آ رہی ہے۔

''انھوں نے اسلام آباد میں ایک ایڈوائزری کمیٹی بنائی جس میں مجھے بھی شامل کیا گیا۔ چیئرمین صاحب نے مجھے دو تین اسائنمنٹ بھی دیں۔ میں جاتا رہا۔ وزیر اور سیکرٹری سے کہا کہ اس طرح کام ہونا چاہیے۔ وہ کہتے' ہاں سر' بالکل ٹھیک ہے۔ ایک ہفتے بعد فون کیا تو کہا، ہاں جی' بس ہو رہا ہے۔ اگر میں وہاں انچارج ہوتا تو پھر میری قابلیت وہاں استعمال ہوتی نا۔ اب ریموٹ کنٹرول سے تو آپ نتیجہ نہیں لے سکتے۔

س: ہم بلوچستان گئے تو وہاں ہماری عبدالمالک صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ ان کے پاس محدود وسائل ہیں' لیکن وہاں ہمیں کام ہوتا نظر آیا۔ بیشتر لوگوں نے بتایا کہ کام ہو رہا ہے۔

ج: ''وجہ یہ ہے کہ انھیں اچھا چیف سیکرٹری ملا جس نے حکومت کو سنبھال لیا۔ پھر پہلے حالات اتنے زیادہ مخدوش تھے کہ تھوڑا سا کام کرنے پر فرق نظر آنا شروع ہو گیا۔ مزید یہ کہ جو بلوچ احتجاج کرتے تھے' اب وہ خود وزیراعلیٰ بنے ہوئے ہیں۔ ادھر انھوں نے لوکل گورنمنٹ الیکشن کرا دیے' جس میں چیف سیکرٹری کا بہت اہم کردار تھا۔ اس نے بہت ہمت کی اور فوج بھی اسے اسپورٹ کرتی رہی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر مالک صاحب کو الیکشن کی طرف لانے والا بھی یہی شخص تھا۔

س: تحریک انصاف کی یک دم احتجاجی سیاست سامنے آئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسٹیبلشمنٹ کی حمایت حاصل ہے۔ خواص و عام میں یہ تصور موجود ہے۔

ج: ''میرے خیال میں پی ٹی آئی کی احتجاجی سیاست نے سسٹم سے مایوسی کے باعث جنم لیا۔ تحریک انصاف

کا یقین پختہ ہو چکا کہ نارمل سسٹم کے ذریعے عوام کو کچھ بھی نہیں ملے گا' لہٰذا احتجاج کے ذریعے ہی اسے درست کرنا چاہیے۔ شروع میں وہ چار نشستوں کی بات کرتے تھے' پھر چالیس پر آئے۔ اب نہ تو چار کی بات ہو رہی ہے اور نہ چالیس کی' اب تو مڈٹرم الیکشن کی بات ہو رہی ہے۔ حکومت نے خود اپنے لیے ایسے حالات پیدا کیے ہیں۔"

س: آپ اپنے بچوں کے بارے میں کچھ بتائیے؟

ج: "میرے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ بیٹی پی ایچ ڈی کر رہی ہے۔ ییل (Yale) اور ہارورڈ میں دو سال رہ کے آئی ہے۔ اس کا سبجیکٹ ہسٹری آف آرٹ ہے۔ میرا ایک بیٹا لمز سے پڑھ کے این سی اے یونیورسٹی چلا گیا جو پیرس کے قریب ہے۔ وہاں سے ایم بی اے کر کے آیا تو میکنزم کمپنی میں وہ کنسلٹنٹ ہو گیا جو دنیا کی ٹاپ کمپنی ہے۔ اب پچھلے ایک سال سے استعفا دے کر پاکستان آیا ہے۔ کمپیوٹر ایپس ڈیزائن کر رہا ہے۔ دوسرے بیٹے نے بھی امریکا سے گریجوایشن کی ہے۔ وہاں چار پانچ سال ملازمت کے بعد وہ بھی این سی اے ڈی گیا۔ اس نے بھی نوکری چھوڑ دی اور سال ڈیڑھ سال پہلے پاکستان آ گیا۔ اب اپنی کمپنی لانچ کی ہے۔ وہ ڈیجیٹل ایڈورٹائزنگ، سوشل ایڈورٹائزنگ کرتا ہے۔ سب سے چھوٹی بیٹی لمز میں پڑھ رہی ہے۔"

س: حیرت کی بات ہے کہ آپ کے بچوں میں سے کسی نے سول سروسز جانے کا نہیں سوچا؟

ج: "چھوٹے بیٹے میں جذبہ موجود ہے۔ وہ سوشل ویلفیئر پیغامات کے ذریعے محکمہ تعلیم کی رفتار تیز کرنا چاہتا ہے۔ کبھی کہتا ہے کہ سیکرٹری تعلیم سے مجھے ملوا دیں' کبھی کہتا ہے میں فلاں کو آئیڈیا دینا چاہتا ہوں کہ اساتذہ کی حاضری کیسے بہتر بنائی جائے۔ کوئی ایسی اسکیم بنانی چاہیے جس سے ان کی حوصلہ افزائی ہو سکے۔ استاد کے شعبے کی عظمت کو اجاگر کیا جائے، تو اس کی ایسی سوچ ہے۔ سب سے چھوٹی بیٹی سول سروس میں جانے کی خواہش کرتی ہے، تو میں اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہوں۔"

س: آپ پرانے اے سی آر سسٹم پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ کیا کارآمد ہے؟ یا جدید پرفارمنس اپریزل یعنی کے پی آئی (KPI) سسٹم مفید ثابت ہو سکتا ہے؟

ج: "کے پی آئی سسٹم نجی سیکٹر سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے لیے آپ کو نظام اور کلچر بھی بدلنا ہوگا۔ جب کہ ہمارے ہاں کلچر بھائی چارے کا ہے یعنی کسی کو برا کہا جائے نہ بری رپورٹ دی جائے۔ کوئی سو میں سے پانچ صحیح رپورٹ کرتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ اگر کسی نے بری رپورٹ دی بھی ہو تو وہ بھی ٹھیک ہو جاتی ہے۔ اس پر وہ نظرثانی کر لیتا ہے' البتہ چند لوگ پھنس جاتے ہیں۔ سول سروس کی کارکردگی کا جائزہ اتنا مشکل نہیں' کیونکہ ایک سرکاری افسر کی کارکردگی کے بارے میں علاقے کے عوام بتا دیتے ہیں۔ اگر آپ کو سیاسی انعام نہ دینا ہو تو آپ کو اچھے افسر کی تشخیص میں کوئی دقت نہیں آتی۔ یہ پہلی دفعہ شہباز شریف نے ڈپٹی کمشنر میرٹ پر لگائے تھے۔ اس وقت ڈپٹی کمشنر کا دور تھا۔ انھوں نے تب ضلع اچھی طرح چلائے مگر تب بھی اسسٹنٹ کمشنر اور ڈی ایس پی ایم پی ایز کی سفارش پر لگائے گئے تھے۔"

س: فارغ وقت میں کیا کرتے ہیں؟ گالف کھیلتے ہیں؟

ج: "جی گالف کھیلتا ہوں اور تیراکی کرتا ہوں۔"

س: مشرف صاحب کے ساتھ گالف کھیلی ہے آپ نے؟

ج: "نہیں' مشرف سے میری ذاتی دوستی نہیں تھی۔ البتہ اپنے وزیر، جنرل (ر) معین الدین حیدر کے ساتھ گالف کھیلی ہے۔

س: آپ نے شیرپاؤ کے ساتھ بھی کام کیا تھا؟

ج: "نہیں وہ میرے بعد آئے تھے۔ میں جنرل نقوی کے دور میں سیکرٹری تھا۔ میں ڈی سی او کے نظام پر ان سے طویل بحث کیا کرتا۔ مگر وہ مشرف صاحب کو ایسا بریف کر کے لاتے کہ وہ کسی کی سنتا ہی نہیں تھا۔ ایک دفعہ میں نے جنرل نقوی سے کہا کہ کمشنر اور ڈپٹی کمشنر کے نظام میں وہ حکومت کے پیسے لگوائے بغیر کام کراتے تھے۔ آپ نے وہ نظام ہی ختم کر ڈالا۔ میں نے انھیں فیصل آباد کی مثال دی کہ وہاں حکومت پاکستان کا ایک روپیہ بھی نہیں لگا۔ کہنے لگے، آپ ہی کی وجہ سے تو وہ ختم کیا ہے۔ وہ کام عوام کے نمائندوں کو کرنا چاہیے۔"

س: آپ کے تفریحی مشاغل کیا ہیں؟

ج: "مجھے لکھنا بہت پسند ہے اور لکھتا بھی ہوں۔ آپ اگر میرے نام سے گوگل پر سرچ کریں تو آپ کو میرے مضامین ملیں گے۔ ڈان اور نیوز میں لکھتا ہوں۔ ساتھ ہی مجھے کھیلوں سے بھی دلچسپی ہے۔ خاص طور پر کرکٹ کا بہت شوق ہے۔ میں فروری میں ورلڈ کپ دیکھنے ڈھاکہ گیا تھا۔ ٹینس دیکھنے ویمبلڈن دو مرتبہ جا چکا ہوں' موسیقی کا بھی شوق ہے۔"

س: کس کو زیادہ سنتے ہیں، کلاسیکل یا کچھ اور؟

ج: "خود گاتا ہوں لیکن کوئی رسمی تربیت نہیں پائی۔"

س: کون سا میوزک سنتے ہیں؟

ج: "آج کل کے گانوں کے علاوہ جتنے بھی پرانے فلمی گانے ہیں' وہ سنتا ہوں۔ صوفی میوزک جس میں عابدہ پروین بڑی حیثیت رکھتی ہیں اور کوک اسٹوڈیو کے بھی اچھے گانے ہیں، وہ بھی سنتا ہوں۔"

س: آپ کس شخصیت کو آئیڈیل سمجھتے ہیں؟ کہیں عمران خان تو نہیں؟

ج: "میں آج کل عمران خان ہی کو آئیڈیل سمجھتا ہوں۔ اس وقت جو ہماری لیڈرشپ ہے' اس میں صحیح آدمی ہے۔"

س: آپ نے بے نظیر کے ساتھ کام کیا؟

ج: "کام تو نہیں کیا البتہ ملاقات ہوئی ہے۔ میں نے کسی حاکم کے ساتھ کام نہیں کیا۔ مشرف دور میں پانچ چھ سال سیکرٹری رہا۔ ملاقات بھی پانچ چھ دفعہ ہوئی۔ ہو سکتا ہے کہ میٹنگ میں بیٹھ گئے اور ہاتھ اٹھا کے دو جملے کہہ دیے۔ میرے والد صاحب کا جب انتقال ہوا' تب ان کا فون آیا تھا۔"

س: سول سروس میں کوئی ایسا افسر جو آپ کو بہت پسند آیا؟

ج: ''ہمارے ایک ایسے افسر کنور ادریس ہیں۔ ماشاءاللہ حیات ہیں۔ چیف سیکرٹری سندھ رہے اور ڈان میں بہت لکھتے تھے۔ فرنٹیئر میں بھی انھوں نے کام کیا۔ خاموش، مضبوط کردار کے مالک اور مصنوعی تشہیر سے کوسوں دور! کچھ افسر اپنی پبلسٹی زیادہ کرتے اور حاکموں سے زیادہ بنا کے رکھتے ہیں۔ لیکن سول سروس کا سرمایہ کنور ادریس جیسے افسر ہیں۔''

س: آنے والے دس پندرہ برس میں آپ پاکستان کو کہاں کھڑا دیکھتے ہیں؟

ج: ''مجھے اپنے وطن کا مستقبل تابناک دکھائی دیتا ہے' اس لیے میں نے کبھی ہجرت کا نہیں سوچا۔ کبھی کسی بچے کو نہیں کہا کہ تم باہر چلے جاؤ۔ کسی کے پاس غیرملکی قومیت نہیں اور نہ کسی نے درخواست دی۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں دنیا کے جس حصے میں پیدا کیا ہمارے آباؤاجداد بھی وہیں پیدا ہوئے۔ اب یہ برا ہے یا اچھا' ہمارا مقدر یہی ہے۔ یہاں سے فرار میں کوئی فائدہ نہیں۔ آپ عارضی طور پہ چھٹی پر یا پڑھنے چلے جائیں تو ٹھیک ہے مگر رہنا اور مرنا یہیں ہے۔ یہ سب کچھ میں اپنے بچوں کو بتاتا رہتا ہوں۔ یہاں مسائل بڑھ رہے ہیں تو آپ محنت کر کے اپنے ذریعۂ معاش کا بندوبست کریں۔ اس کے بعد معاشرہ بہتر کرنے میں حصہ ڈالیں۔ جہاں تک پاکستان کے بارے میں ناامیدی ہے تو ۲۵ سال پہلے بھی لوگ اس کا اظہار کرتے تھے۔ کئی خوشحال لوگ کینیڈا منتقل ہو گئے' مگر وہاں جانے کے بعد انھیں احساس ہوا کہ ادھر بھی حالات خاص مختلف نہیں۔ اب کئی لوگ واپس آ رہے ہیں۔ جو پُرامید ہیں' ان کو امید تب بھی تھی اور آج بھی ہے۔ جتنی دولت آپ یہاں کما سکتے ہیں' باہر نہیں کمائی جا سکتی۔''

س: انتخابات لڑنے کا ارادہ ہے؟

ج: ''الیکشن لڑا جا سکتا ہے مگر اب مجھ میں چالیس سالہ سرکاری ملازمت کا خاص مزاج راسخ ہو چکا۔ اب کھدر کی شلوار قمیص پہن کے ۲۴ گھنٹے لوگوں کو سلام کرنا میرے بس میں نہیں رہا۔''

س: اگر ٹیکنوکریٹس کی حکومت بنی تو اس میں شامل ہوں گے؟

ج: ''وہ پوچھیں گے ہی نہیں۔ ٹیکنوکریٹس حکومت کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ پائیدار نہیں ہوتی' مگر میں مطمئن ہوں کہ کوئی بھی ایسی فیلڈ جس میں میرا تجربہ ہے، مجھے مل جائے اور دو تین سال دیے جائیں' تو اس سیکٹر کے مسئلے حل کرنے کی کوشش کر سکتا ہوں۔''

س: آپ کون سا سیکٹر چاہتے ہیں؟ معیشت' صحت یا سیکیورٹی؟

ج: ''معیشت، تعلیم، صحت اور سیکیورٹی ہی میرے شعبے ہیں۔ معیشت کے لیے کام کرنا زیادہ پسند کروں گا۔ میرے نزدیک معیشت سادہ چیز ہے' بس آپ کو خرچے کم کرنا اور آمدن بڑھانی ہے۔ باقی مسئلے خود ہی حل ہو جائیں گے۔ آمدن بڑھانے کے لیے آپ کو ٹیکس لگانا پڑے گا۔ تب عوام ناخوش ہو کر کہیں گے کہ ہمارا کاروبار خراب ہو گیا۔ لیکن سچ یہی ہے کہ جس کو پیسے دینے چاہئیں' وہ نہیں دے رہا۔ وہ بڑا ڈھیٹ ہے' لڑتا ہے، کہتا ہے سڑکوں پر آ جاؤں گا، دکانیں بند کر دوں گا۔

یہ انداز فکر شہریوں کو تعلیم دے کر بدلنا ممکن ہے' مگر ہم نے اس سمت توجہ ہی نہیں دی۔ جب منظور وٹو آئے' تو میں سیکرٹری تعلیم تھا۔ میں نے کہا کہ تعلیم کو اہمیت دینے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ آپ کا جو سب سے اچھا سرکاری افسر ہے' اسے محکمہ تعلیم میں لگائیں۔ پھر ایک اسکیم بنائی کہ جو ڈی ایم جی افسر اکیڈیمی سے نکلتا ہے' اس کو پہلا سال تعلیم کے محکمہ میں گزارنا ہو گا' چناںچہ اے ڈی سی لٹریسی کی ایک پوسٹ بنائی گئی! پھر جو بھی افسر اکیڈیمی سے نکل رہے تھے' میں نے ان کو قائل کیا کہ وہ پہلے محکمہ تعلیم میں ایک سال گزاریں۔ وہ کہنے لگے' ہم نے ماسٹر بننے کے لیے تو سی ایس ایس نہیں کیا۔ بہرحال میں نے منظور وٹو کو رضامند کر لیا کہ جو لڑکے تازہ دم ہیں' انھیں ضلع کی تعلیم کا ٹاسک دیا جائے۔ پوری اسکیم میں نے بنائی۔ افسر آئے اور لڑتے جھگڑتے ضلعوں میں چلے گئے۔ مگر جیسے حکومتوں میں ہوتا ہے کہ جب آپ کوئی اچھی اسکیم متعارف کراتے ہیں تو آپ کا تبادلہ ہو جاتا ہے۔ سو میری اس قسم کی اختراعات ادھوری رہ گئیں۔ انھیں دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔''

س: ہم جتنے بھی افسروں سے ملے' وہ یہی کہتے ہیں کہ انھیں کچھ کرنے نہیں دیا گیا۔ اس کا سبب کیا ہے؟

ج: ''ایسی بات نہیں۔ فیصل آباد میں تو جو کچھ میں نے سوچا' وہ کر دیا' کیونکہ مجھے وہاں کام کرنے کے لیے دو تین سال مل گئے تھے۔ دراصل ایک ڈیڑھ سال گزارنے کے بعد ہی سرکاری افسر کو اندازہ ہوتا ہے کہ اُسے کیا کرنا ہے' لیکن اب ہمارے اتنے طویل دورانیے نہیں رہے۔ تین سال کا دورانیہ انگریز نے اسی لیے رکھا تھا کہ پہلے سال سیکھو، دوسرے سال عمل کرو اور تیسرے سال نتائج کو مستحکم کرو۔ اگر یہی دورانیے دوبارہ نافذ کر دیے جائیں' تو حالات بہتر ہو سکتے ہیں۔

''اسی طرح جب میں سیکرٹری کامرس تھا تو سفارت خانوں میں تعینات کمرشل کونسلروں کو ایک سٹینو ٹائپسٹ ملتا اور دوسرا اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ۔ میں سیکرٹری بنا تو میں نے کہا' ان دو لوگوں کی ضرورت نہیں کیونکہ تنخواہ تو گورنمنٹ دیتی ہے۔ اگر کرایہ گھر' بچوں کی تعلیم اور میڈیکل الاؤنس کا حساب لگایا جائے تو اچھی خاصی رقم صرف ہوتی ہے۔

میں نے کہا' ایک عہدہ ختم کر دو اور جو رقم بچے' اس پر ایسا آدمی لے آؤ جو مقامی زبان جانتا اور تعلیم یافتہ ہو۔ وہ سفارت خانے میں آ کر بیٹھے اور تجارت کو بڑھائے۔ ملکی تاجروں اور چیمبر آف کامرس کے ساتھ اس کی تعلق داریاں ہوں۔ سفارت خانے کے پاس اتنا پیسا ہوتا ہے کہ وہ اچھے سے اچھا مقامی ملازم رکھ سکتے ہیں۔ پھر میں نے ان کو بجٹ دلوایا کیونکہ ہمارے کمرشل کونسلروں کی تنخواہ بھی کم ہوتی ہے۔ میں نے انھیں فارن الاؤنس کے علاوہ انٹرٹینمنٹ کے پیسے بھی دلوائے۔ ٹرانسپورٹ کے بھی علیحدہ پیسے رکھے تاکہ ان کی کارکردگی بہتر ہو سکے۔ انھیں مقامی عملہ دیا اور یہ نظام آج بھی چل رہا ہے۔ میں نے کمرشل کونسلر کی تعیناتی سفارش کے بجائے میرٹ کی بنیاد پر کی۔''

س: آپ حکمرانوں میں کیڑے ڈالتے رہتے ہیں جبکہ وہ کہتے ہیں' ہم نے ایٹمی دھماکا کیا اور ملک کو ایٹمی طاقت بنا دیا؟

ج: ''ایٹمی دھماکا کیا تھا' ایٹم بم تو نہیں بنایا! اگر ایٹم بم بنایا ہوتا تو شاید میں ان کو کریڈٹ دے دیتا۔ انھوں نے تو صرف دھماکا کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ کچھ عرصہ قبل جنرل شعیب امجد ایک ٹی وی پروگرام میں کہہ رہے تھے کہ میں اس

میٹنگ میں شامل تھا جس میں میاں صاحب دھاکا کرنے کے حق میں نہیں تھے۔"

س: اس کے مقابلے میں اگر فوجی حکمرانوں کو دیکھیں تو انھوں نے کیا کام کیے؟

ج: "ایوب خان نے اپنی طرف سے خاصے کام کیے لیکن وہ بہ حیثیت مجموعی ملک کو تباہی کی طرف لے گیا۔ مشرف صاحب کی نیت بھی ٹھیک نہیں تھی، وہ لوکل گورنمنٹ کے ذریعے اپنی ایک لابی بنانا چاہتے تھے جیسی ایوب خان نے بنائی تھی۔ بھٹو نے بھی اثاثے قومی تحویل میں لا کے کچھ کرنے کی کوشش کی تھی۔

سوال یہ ہے کہ جب موجودہ حکمرانوں کا بھی کوئی ویژن ہی نہیں تو پھر یہ ملک کے لیے کیا کریں گے؟ کیا وہ جرائم کا خاتمہ اور معیار تعلیم بلند کر سکیں گے؟ کیا لوگ سڑکوں پر موٹر سائیکل بہتر طریقے سے چلائیں گے؟ پبلک ٹرانسپورٹ سسٹم بہتر ہو جائے گا؟ کیا فی ایکڑ پیداوار ۳۰ من سے ۵۰ من کر سکیں گے؟ یا پینے کا صاف پانی مہیا کر دیں گے؟

"میری جب بھی عمران سے بات ہو تو میں ان کی ہاں میں ہاں نہیں ملاتا۔ میں ان سے کہتا ہوں کہ جناب یہ مسائل ہیں اور یہ حقائق! اب لیڈر وہ ہے، میں اسے ایک حد تک سمجھا سکتا ہوں۔ اگر میری قائل کرنے کی استعداد نہیں، تو وہ پھر میری کمزوری ہے۔"

س: آپ نے دیکھا ہوگا کہ پچھلے دس برس میں جن ممالک نے ترقی کی ہے، ان میں بھارت سرفہرست ہے۔ اب آپ دہلی، ممبئی، بنگلور دیکھ لیں وہاں میٹرو بھی بنی ہے، پلازے بھی بنے، انڈر گراؤنڈ سسٹم بھی بنے، لیکن غربت میں کمی نہیں ہوئی۔ بچے وہاں مر رہے ہیں۔ پانی کی کمی کا بھی مسئلہ ہے، لیکن وہاں نواز شریف یا شہباز شریف حکومت میں نہیں رہے۔ چین میں بھی غربت کم کرنے کے لیے بہت کام کیا گیا ہے مگر اس وقت بھی کروڑوں چینی غریبانہ زندگی گزارتے ہیں۔ یہاں تک کہ بھارت میں تو کسان خودکشی کر رہے ہیں۔ مجھے لگتا ہے، ہم نے اپنے قومی مسائل کو اتنا بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے کہ اس سے عوام میں ناامیدی پھیل رہی ہے۔ بھارت سے جب صنعتکار آتے تو وہ ہماری موٹر وے، انڈسٹریل اسٹیٹ جو کہ پرویز الٰہی دور میں بنا، سرسبز لاہور کی صفائی اور شوکت خانم اسپتال دیکھ کر بڑے حیران ہوتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے، آپ لوگوں نے ہمیں بہت زیادہ ناامید کر رکھا ہے۔

ج: "دیکھیے بھارت ہم سے آٹھ گنا بڑا ہے۔ یہاں اگر چار یا پانچ قومیں بستی ہیں، تو وہاں ڈیڑھ سو قومیتیں ہیں۔ ہمارا ایک مذہب ہے ان کے ہاں پانچ چھ مذاہب ہیں۔ ان کے مسائل بھی ہم سے دس گنا زیادہ ہیں پھر بھی وہ ہم سے بہتر کارکردگی دکھا رہے ہیں۔ ہمارے لوگ بھی محنتی ہیں، لیکن اپنے ملک میں خاص کارکردگی نہیں دکھا پاتے۔ البتہ بیرون ملک جا کر کارہائے نمایاں دکھاتے ہیں۔ چین ہم سے ۴۰ گنا بڑا ہے۔ ان کے بے پناہ مسائل ہیں۔ مثلاً ان کے کھانے مختلف ہیں اور رسم و رواج بھی لیکن وہ تو بھارت سے بھی زیادہ ترقی کر گئے۔ اب وہ دنیا کی بہت بڑی معیشت بن چکے۔ بھارت میں یقیناً غربت ہے، لیکن وہاں آپ جائیں تو جو شخص آپ کو چائے پلائے گا، وہ بھی انگریزی اسکول میں اپنے بچے پڑھا رہا ہوگا۔

"اگر ایک ملک کا تعلیمی معیار بلند ہو جائے تو اس کی آبادی بہت بڑا اثاثہ بن جاتی ہے۔ آپ پھر لاکھوں لوگ یورپ بھیج سکتے ہیں۔ چین اور بھارت میں مسائل ہیں اور وہاں نواز شریف حکمران نہیں رہے۔ میرا یہ کہنا ہے کہ پاکستان کم از کم بھارت سے کہیں زیادہ آگے ہوتا اگر ہماری قیادت ایماندار ہوتی۔ اب تو بنگلہ دیش بھی ہم سے آگے نکل گیا ہے۔"

س: آپ کو کیا لگتا ہے کہ مڈٹرم الیکشن ہو جائیں گے؟

ج: "میرا خیال ہے کہ لوگوں میں بددلی پھیل چکی۔ اپنی طرف سے تو حکومت نے بڑی چالاکی سے دھرنے جاری رہنے دیے، مگر دو ڈھائی مہینے میں ان کی کارکردگی ہر کسی کو معلوم ہو گئی۔"

س: جاوید ہاشمی کی ہار سے کوئی فرق پڑے گا؟

ج: "میں سمجھتا ہوں کہ جاوید ہاشمی نے بہت زیادتی کی۔ ان کا یہ کہنا بالکل غلط تھا کہ فوج آ جائے گی۔ وہ عمران خاں کے حلقے میں کبھی نہیں رہے۔"

س: لیکن وہ پی ٹی آئی کے صدر منتخب ہوئے تھے؟

ج: "اس لیے کہ پی ٹی آئی میں وہ نمایاں عوامی شخصیت کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس وقت لوگ کہتے تھے کہ آپ کے پاس ہے کون؟ تو ان کو صدر بنا دیا گیا۔"

س: لیکن ہارون الرشید اور بہت سارے صحافیوں نے لکھا ہے کہ عمران خان بہت سادہ ہیں؟

ج: "میں بہت میٹنگوں میں عمران خاں کے ساتھ رہا ہوں۔ انھوں نے کئی سوالات کے جواب دیے تھے۔ جب ہم اسلام آباد پہنچے اور بیٹھ گئے تو ہم بار بار پوچھتے رہے کہ آگے کیا ہوگا؟ اس سوال پہ عمران خاں خاموش ہو جاتے اور کہتے، ان شاء اللہ ٹھیک ہوگا۔ انھوں نے یہ کبھی نہیں کہا تھا کہ فوج آ جائے گی۔"

س: یہ بتائیے، شروع سے طے شدہ تھا کہ وزیراعظم سے استعفا لیں گے؟

ج: "نہیں نہیں، پہلے تو چار حلقوں کا ایشو تھا۔ استعفا کا معاملہ درمیان میں آ گیا۔"

س: لیکن جاوید ہاشمی کہتے ہیں، ہمیں بتایا گیا کہ آگے قادری صاحب جائیں گے اور ہم پیچھے ہوں گے؟

ج: "میں اس میٹنگ میں نہیں تھا وہ جو کنٹینر پر ہوئی۔ مگر آئیڈیا یہی تھا کہ ہم کوئی غیر جمہوری چڑھائی نہیں کریں گے۔ یہ نہیں تھا کہ ہم پرائم منسٹر ہاؤس کے اندر گھس جائیں گے، ایسا کچھ نہیں تھا، لیکن اس قسم کے معاملات میں کبھی کبھار کچھ فیصلے موقع پر ہوتے ہیں۔ یہ فیصلہ اگر ہوا، تو اتنا اچھا نہیں تھا، لیکن کیا ایک وفادار آدمی اس بات پر مشتعل ہو جائے کہ پہلے انھوں نے کہا تھا کہ یہیں رہیں گے اور آگے نہیں جائیں گے۔"

س: آپ کو لگتا ہے کہ الیکشن جلدی ہوں گے اور اصلاحات کے بغیر؟

ج: "میری دعا ہے کہ وطن عزیز میں ایسا نظام آ جائے جو پائیدار ہو۔ موجودہ حکومت اُسے تشکیل نہیں دے سکتی۔ عوامی گورنمنٹ کا پتا نہیں کیسے آئے گی۔ اللہ کرے کہ عدالتیں کوئی بڑا قدم اٹھا لیں۔"

س: الیکشن آپ کو ہوتے نظر آ رہے ہیں؟

ج: "موجودہ حکومت چلتی نظر نہیں آ رہی۔ اتنی زیادہ فرسٹریشن ہے کہ یہ خود ہی تھک جائیں گے۔ ایک خبر یہ بھی ہے کہ ان کے اندر بھی فرسٹریشن بڑھ رہی ہے۔ جب شیر کمزور ہوتا یا بیمار ہو کے ذرا لڑکھڑاتا ہے تو پھر مخالف کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کل دوست محمد کھوسہ جو ان کا ستایا ہوا ہے، وہ یہ کہہ رہا تھا کہ پانچ آدمی ان کے ساتھ ہیں۔ باقی

سارے بھی تکلیف میں ہیں۔ شاید دو چار مہینے میں کوئی فارورڈ بلاک بن جائے۔"

س: آپ تحریک انصاف میں کس عہدے پہ فائز ہیں؟

ج: "میں کور کمیٹی کا رکن ہوں۔ یہ ارکان فیصلہ سازی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس کمیٹی میں ۳۵ ارکان شامل ہیں۔"

ہمارا انٹرویو چار گھنٹوں پر محیط تھا جس میں قومی اہمیت کے بڑے بڑے مسائل زیر بحث آئے اور جناب تسنیم نورانی نے اپنے تجربات کی روشنی میں ان کا حل پیش کیا۔ وہ دن ملتان میں ضمنی انتخابات کا تھا اور ۷ بجے شام کے قریب جاوید ہاشمی کا یہ اہم بیان آ گیا تھا کہ ابتدائی نتائج ان کے خلاف ہیں اور اگر عامر ڈوگر جیت گئے تو میں انھیں مبارک باد پیش کروں گا۔ انھوں نے فی الواقع جمہوری اسپرٹ کا مظاہرہ کیا تھا۔ ان کا انٹرویو اردو ڈائجسٹ اکتوبر کے مہینے میں شائع ہوا۔ اس میں ہمارا موقف تھا کہ انھوں نے ایمپائر کی انگلی کی نشاندہی کر کے ملک پر بہت بڑا احسان کیا اور پاکستان ٹیکنوکریٹس کی حکومت سے محفوظ رہا۔ جناب تسنیم نورانی کا نقطہ نظر ہم سے مختلف تھا جو ان کے انٹرویو میں پوری وضاحت سے موجود ہے۔ ہمیں بھرپور احساس ہے کہ ان کی صلاحیتوں سے قوم کو فائدہ اٹھانا چاہیے۔ ہماری بڑی دعا ہے کہ عمران خاں اپنے اندر قیادت کے اوصاف پیدا کریں اور نوجوانوں کو اعلیٰ نصب العین اور اعلیٰ اخلاق سے مزین کرنے کا راستہ منتخب کریں۔ یہ ان پر بڑی ذمے داری عائد ہوتی ہے۔ بدنظمی اور بے راہروی سے قوموں کو عروج نہیں ملتا اور زوال ان کا مقدر بن جاتا ہے۔ ◆◆◆

محترمی ومکرمی جناب ....

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ!

* کیا آپ کے پاس ایک قرآن مجید ہے؟

تمام مسلمان بہن بھائیوں اور خصوصاً آپ سے التجا ہے کہ آپ کے پاس اگر ایک سے زیادہ مترجم قرآن مجید، قائدے، سپارے، بخاری شریف یا حدیث کی کوئی کتاب یا دیگر اسلامی کتابیں موجود ہوں تو ضائع نہ کریں بلکہ ادارہ آمنہ جنت کی لائبریری کو عطیہ کریں۔ جب تک طالبات ان کو پڑھتی رہیں گی ثواب بھی آپ کو ملتا رہے گا اور یہ صدقہ جاریہ ہے۔

* اپنے والدین اور مرحومین کے بلند درجات کے لیے؟

ادارہ کو تفاسیر قرآن کریم، کتب حدیث اور دیگر اسلامی کتابیں خود تشریف لا کر پہنچا دیں یا ان کی قیمت بذریعہ منی آرڈر بنام ادارہ ارسال فرما دیں۔ ہم تفسیر قرآن کریم بازار سے لے کر رسید آپ کو بھجوا دیں گے۔ ان شاء اللہ

* دعوت

آپ کو دعوت دی جاتی ہے کہ آپ ماسوائے اتوار کے کسی بھی دن کسی جب آپ کو آسانی ہو، ادارے کا وزٹ فرمائیں، ہمارے کام تعلیم القرآن وعصری تعلیم کو چیک کریں۔ اگر دل گواہی دے کہ کام بطریق احسن سے ہو رہا ہے تو پھر تفاسیر قرآن کریم وکتب حدیث عنایت فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

* نوٹ

منی آرڈر یا کتابیں بنام ادارہ ارسال فرمائیں۔ دستی دیتے وقت ادارے کی رسید وصول کریں۔ شخصی نام پر ہرگز ارسال نہ فرمائیں۔ شکریہ

* بغیر نمود و نمائش

تعلیم القرآن، دین کی نشر واشاعت اور انسانیت کی فلاح کے لیے، بغیر نمود و نمائش دیے گئے عطیات کا ادارہ خیر مقدم کرتا ہے۔ اپنے عطیات بذریعہ چیک یا ڈرافٹ ارسال کرنا چاہیں تو ڈرافٹ یا چیک آمنہ جنت فاؤنڈیشن اکاؤنٹ نمبر 02745 ایم سی بی چونیاں برانچ نمبر 0240 کے نام بھجوائیں۔ آن لائن بھی جمع کرا سکتے ہیں۔

اس صورت میں مطلع ضرور کریں۔

آن لائن اکاؤنٹ ایم سی بی PK86MUCB0673440401002745 ٹائٹل اکاؤنٹ آمنہ جنت ویلفیئر فاؤنڈیشن ایم سی بی چونیاں برانچ

نوٹ: ادارہ گورنمنٹ سے منظور شدہ ہے۔ ادارے کو دیے جانے والے تمام عطیات انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں، مزید رابطے کے لیے:

پرنسپل رضیہ پروین: آمنہ جنت فاؤنڈیشن
ماڈل اسکول چونیاں ضلع قصور
فون نمبر: 0322-7614497 -0300-4735932

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں نے سنٹرل ماڈل اسکول لوئر مال لاہور سے میٹرک کے بعد آئی کام کرنے کی خاطر ہاشمی میموریل کالج میں داخلہ لیا۔ میرے دو دوستوں سید محمد رضا اور راشد بٹ نے گورنمنٹ کالج لاہور اور ایف سی کالج کی راہ لی۔ یوں ہماری کئی برس کی رفاقت جدائی میں بدل گئی۔

مئی ۱۹۹۰ء کی تعطیلات موسم گرما میں ہم تینوں اکٹھے ہوئے تو سوچا کہ کیسے ان چھٹیوں کو بامقصد تفریح کر کے گزارا جائے؟ پہلے تو مری اور ناران کاغان جانے کا پروگرام بنا پھر رضا نے یہ تجویز دی کہ کیوں نا آزاد کشمیر جایا جائے؟ ان دنوں بڑے تواتر کے ساتھ اخبارات و رسائل، ریڈیو، ٹی وی اور خود اردو ڈائجسٹ

یادگار لمحے جو مثل جنت مقام پر گزرے

آزاد کشمیر میں پندرہ دن

ایک لاہوری نوجوان کے قلم سے کشمیری علاقوں و معاشرت کی دلچسپ جھلکیاں، جس نے چوبیس برس قبل اس سرسبز و شاداب سرزمین پر سیاحت کرتے ہوئے بھرپور لطف اٹھایا

طیب اعجاز قریشی

کیل میں اشاروں کی زبان میں محوِ گفتگو کشمیری

کیرن میں بنی جھونپڑیوں کا خوبصورت منظر

میں کشمیر کی خبریں و تحریریں تواتر سے شائع ہو رہی تھیں۔ ان میں ایک طرف تو کشمیر کی جنت نظیر خوبصورتی کا ذکر ہوتا تو دوسری جانب کشمیریوں پہ ہونے والے بھارتی مظالم کا تذکرہ رونگٹے کھڑے کر دیتا۔ پاکستان میں ہر طرف ایک ہی نعرہ تھا کہ کشمیر ہماری شہ رگ ہے۔ جبکہ بھارتی سیاستدان کشمیر کو بھارت کا اٹوٹ انگ قرار دے کر اپنے عوام کو بھڑکانے کی سعی کرتے۔

کنٹرول لائن پر پاکستانی اور بھارتی افواج کے مابین جھڑپیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ خاص طور پر چکوٹھی سیکٹر آئے دن خبروں کا موضوع بنا رہتا۔ ان دنوں ابھی تک "آزاد میڈیا" کی برکات ہم تک نہ پہنچی تھیں لہٰذا پی ٹی وی اور اخبارات کے ذریعے آئے روز مقبوضہ کشمیر میں ہڑتالوں، کرفیو، پتھراؤ اور بھارتی فوج کے مظالم کا ذکر شد و مد سے کیا جاتا۔

بہرحال مجھے رضا کی یہ تجویز پسند آئی اور میں نے اس کا تذکرہ اپنے چچا محترم الطاف حسن قریشی سے کیا۔ میں بچپن ہی سے اپنے چچا الطاف حسن، تایا گل حسن اور ماموں محترم ضیاء الرحمٰن کے بہت قریب تھا جو اردو ڈائجسٹ سے طویل عرصہ وابستہ رہے۔ میں والد محترم کے ساتھ ساتھ ان بزرگوں کی خدمت کرنے اور ان کے ساتھ وقت گزارنے میں خوشی محسوس کرتا۔

چچا الطاف نے اپنے ایک دوست، چودھری یوسف کو مظفر آباد فون کر کے ہمارے ارادے سے آگاہ کیا۔ چودھری صاحب آزاد کشمیر حکومت میں سیکرٹری تعلیم کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ انھوں نے سیاحتی دورے سے متعلق تمام انتظامات کرنے کا وعدہ کر لیا۔ یوں ہم دوستوں کو بظاہر مشکل لگنے والا معاملہ محترم چچا کی شفقت سے حل ہو گیا۔ وقت نے پھر ثابت

کیا کہ کشمیر کا ہمارا سفر یادگار ثابت ہوا۔

ان دنوں میرے بہنوئی اور پھوپھی زاد بھائی فیضان الرحمٰن اٹک آئل کمپنی میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے ۔ کھوڑ آئل فیلڈ کے انتظامی معاملات اُنھی کی زیرنگرانی تھے۔ انگریزوں کے زمانے کی اس آئل فیلڈ میں افسروں اور ملازمین کے لیے نہایت عمدہ انتظامات کیے گئے تھے۔ اسکول، اسپتال، ملازمین کی رہائش گاہیں اور افسروں کے لیے ایکڑوں پر محیط بنگلے، بڑی بڑی گاڑیاں اور کلب جن میں سوئمنگ پول، ٹینس، اسکواش کورٹس، لائبریری اور سنوکر جیسی گیمز اور آسائشیں موجود تھیں۔ ہم بھائی اکثر گرمیوں کی چھٹیوں میں ان کے ہاں جاتے اور خوب سیر سپاٹا کیا کرتے۔ اس بار بھی دوستوں کے ہمراہ پہلا قیام کھوڑ ہی میں ہوا۔

لاہور سے بذریعہ فلائنگ کوچ راولپنڈی پہنچے اور پھر پیرودھائی بس اسٹینڈ سے فتح جنگ جانے والی بس میں بیٹھ کر کھوڑ پہنچے۔ رات ہم نے وہیں قیام کیا۔ اگلے روز جیپ ہمیں راولپنڈی بس اسٹینڈ چھوڑ گئی جہاں سے ہم مظفرآباد جانے والی بس پر سوار ہوئے۔ مری تک کا راستہ تو آرام سے کٹ گیا۔ سڑک اتنی دشوار گزار نہ تھی۔ اب تو تیز ایکسپریس وے بننے کی وجہ سے مری کا سفر نہایت آرام دہ ہو گیا ہے۔

مری کے علاقے 'سنی بینک' پہنچ کر کچھ دیر آرام کیا۔ پھر کوہالہ کی طرف سفر شروع ہو گیا۔ راستہ انتہائی اعصاب شکن اور مکمل طور پر ڈھلوانی تھا۔ ایک طرف دیوہیکل پہاڑوں کا طویل سلسلہ اور دوسری جانب انتہائی گہری کھائیاں! بس بھی پرانی طرز کی تھی جس نے سفر کو مزید دشوار بنا دیا۔ اس لیے ہم پہ کچھ خوف بھی سوار رہا۔ خیر اللہ اللہ کر کے بخیر و عافیت دریائے جہلم کے پل

دومیل کا مقام جہاں دریائے جہلم اور دریائے نیلم کا ملاپ ہوتا ہے

شارداپیٹھ نامی مندر کے آثار جو ہندوؤں کا متبرک مقام ہے

پر پہنچے۔ اس پل کے ایک طرف پاکستان اور دوسری جانب آزاد کشمیر واقع ہے۔ وہاں سے مظفرآباد جانے کے لیے بس بائیں طرف مڑ گئی۔

اب تو خیر مری سے کوہالہ تک سڑک بہت بہتر ہو چکی، مگر ۴۴ سال پہلے نہ صرف یہ خستہ حال تھی بلکہ بسیں بھی بہت کم چلتی تھیں۔ چناں چہ بس میں مسافر زیادہ ہونے کی وجہ سے مجھے دروازے کے ساتھ نصب ایک اسٹول پر بیٹھنا پڑا۔

مظفرآباد میں ہمارا قیام ایم ایل اے ہاسٹل میں تھا۔ مشہور جگہ ہونے کی وجہ سے وہاں پہنچنے میں خاص دقت پیش نہ آئی۔ کمرے انتہائی آرام دہ تھے۔ ہماری راہنمائی کے لیے ایک انفارمیشن آفیسر، عندلیب بٹ کی ڈیوٹی لگائی گئی جو چند ہفتے قبل ہی تعینات ہوئے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ موصوف کی شادی بھی کچھ عرصہ قبل ہوئی ہے۔

ایم ایل اے ہوسٹل میں ہمارا قیام بطور سرکاری مہمان تھا جس کی وجہ سے ہمیں خاصا پروٹوکول ملا۔ وہیں ہماری ملاقات ایک ترک صحافی 'شیرف (Sheriff)' سے ہوئی جو ترکی کے ایک مشہور روزنامے سے منسلک تھے۔ وہ کشمیری مہاجرین کے حوالے سے اپنے اخبار کے لیے مضمون لکھ رہے تھے۔ ان کی وساطت سے میں پہلی بار ترکی اور ترک تہذیب و ثقافت سے آشنا ہوا۔

کشمیر پہنچنے کے اگلے ہی دن کچھ لوگ ہمیں ملنے آ گئے۔ انھوں نے ہمیں کشمیری مہاجرین کی مشکلات سے آگاہ کیا۔ ساتھ ہی ساتھ اردو ڈائجسٹ اور محترم الطاف حسن قریشی کی ان کوششوں کو سراہا کہ جن کے ذریعے کشمیری مہاجرین کے مسئلے کو اجاگر کیا گیا۔ اگلے دن ہم مظفرآباد میں واقع مہاجرین کے کیمپ گئے۔ ہماری ملاقات ان مہاجروں سے ہوئی جو عمر کے مختلف ادوار سے

بھی ساتھ لے لیا تھا کیونکہ اس نے بھی یہ وادی نہیں دیکھی تھی۔ دونوں کا تعلق لاہور سے تھا اور وہ شادی کے بعد کشمیر منتقل ہوئے تھے۔ چکار پہاڑ کی چوٹی پر پہنچے تو خاصی خنکی کا احساس ہوا۔ وہاں ہمارے لیے کھانے کا عمدہ انتظام کیا جا چکا تھا۔

وادی نیلم میں آمد

اگلے دن ہم نے وادی نیلم کی سیاحت کا پروگرام بنایا۔ سیکرٹری تعلیم اور ڈائریکٹر انفارمیشن بخاری صاحب بھی ہمارے ہمراہ تھے۔ ایک جیپ میں ہم اور سیکرٹری صاحب سوار ہوئے۔ دوسری میں ڈائریکٹر صاحب اور دیگر صاحبان بیٹھ گئے۔

مظفرآباد کے شمال مشرق میں واقع وادی نیلم کمان کی شکل میں دو سو کلومیٹر تک پھیلی ہوئی ہے۔ یہ وادی کاغان کے پہلو بہ پہلو چلتی ہے۔ تیرہ ہزار فٹ بلند برف پوش پہاڑ دونوں کو جدا کرتے ہیں۔

آزاد کشمیر کے ضلع نیلم کا بیشتر علاقہ اسی وادی پر مشتمل ہے۔ اس ضلع کی دو تحصیلیں ہیں: اٹھمقام اور شاردا۔ وادی نیلم حسین فطری مناظر، فلک بوس پہاڑوں، اٹھکیلیاں کرتے جھرنوں، سرسبز جنگلوں، شفاف پانی سے لبریز ندی نالوں اور دریائے نیلم کی وجہ سے سیاحوں کے لیے بڑی پرکشش حیثیت رکھتی ہے۔

مظفرآباد سے یہ براہ نیلم روڈ منسلک ہے۔ یہ سڑک کیل تک جاتی ہے۔ مظفرآباد سے اٹھمقام تک سڑک پکی ہے پھر کچے راستے کا آغاز ہوتا ہے۔ موسم سرما میں برف باری کے باعث نیلم روڈ اکثر بند ہو جاتی ہے۔

ہم سب سے پہلے اٹھمقام پہنچے جو مظفرآباد سے ۸۴ کلومیٹر دور واقع ہے۔ یہ ضلع نیلم کا صدر مقام ہے۔ ۴۷۲۰ فٹ بلندی پہ بنے اس قصبے کی آبادی کم و بیش بیس ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔

بھارتی فوج اس تحصیل کو اکثر نشانہ بناتی ہے۔ اسی لیے علاقے میں کئی گھر تباہ شدہ بھی نظر آئے۔ ایک جگہ رک کر سیکرٹری صاحب نے زیرتعمیر ایک اسکول کا جائزہ لیا جو نقشے کے بالکل برعکس تعمیر ہوا تھا۔ وہ کافی برہم ہوئے اور ٹھیکیدار کی خوب سرزنش کی۔ راستے میں مچھلیوں کا ایک فارم دیکھا۔ وہاں مچھلیوں کی افزائش کر کے انھیں دریائے جہلم میں چھوڑا جاتا تھا۔ یہ فارم پہاڑ پر کچھ اونچائی پہ واقع تھا۔

اندھیری اور پراسرار رات

اب ہماری منزل کیرن گاؤں تھی۔ یہ دیہہ دریائے نیلم کے کنارے پانچ ہزار فٹ بلندی پر واقع ہے۔ دریا کے قریب ہی ایک بلند پہاڑ ہے۔ اس باعث وہاں دن میں بھی اندھیرا چھایا رہتا ہے۔ دریا پار مقبوضہ کشمیر کا علاقہ تھا۔ وہاں آباد ہونے والا گاؤں بھی کیرن کہلاتا ہے۔ کنار دریا ہی ریسٹ ہاؤس بنا ہوا ہے۔ وہاں پہاڑ اور دریا کے قرب کی وجہ سے قدرے خنکی محسوس ہوئی۔

دریا کا پاٹ کافی چوڑا تھا۔ بیچ دریا میں کچھ درخت لگے دکھائی دیے۔ یہ دریا پاک بھارت سرحد کا کام دیتا ہے۔ کیرن گیسٹ ہاؤس کے انچارج نے گرمجوشی سے ہمارا استقبال کیا۔ ہم سب ستانے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ دوسری جانب پہاڑ کی چوٹی پر بھارتی چوکی نظر آ رہی تھی...... گویا ہم اس وقت بھارتیوں کے نشانے کی زد میں تھے۔

رات کو کھانے کے لیے کمرۂ طعام پہنچے تو وہ انتہائی مسحورکن خوشبو سے مہکا ہوا تھا۔ مہک کا مرکز کمرے سے

منسلک باورچی خانہ تھا۔ محفل کے آداب ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ہم نے سیکرٹری صاحب سے معذرت کی اور باورچی خانے میں چلے گئے۔ وہاں لکڑیوں کی آگ پر کھانا پک رہا تھا۔ معلوم ہوا' یہ لکڑیوں کے دھوئیں اور پکتے کھانے کی خوشبو تھی جس نے ہمیں وہاں جانے پر مجبور کیا۔

کھانا انتہائی لذیذ تھا۔ بعدازاں چائے پینے کے دوران سیکرٹری اور ڈائریکٹر صاحب ہمیں رات گئے تک لطیفے اور اپنی زندگی کے ناقابل فراموش واقعات سناتے رہے جو انتہائی دلچسپ اور حیران کن تھے۔ ہمیں بوریت کا بالکل احساس نہ ہوا۔

ہمارے پاس دو کمرے تھے جن میں ہم تین دوستوں کو قیام کرنا تھا۔ ہر کمرے میں دو بستر تھے۔ دریا کا سناٹا اور دشمن کی چوکی...... ان تمام عوامل کی وجہ سے یہ فیصلہ نہیں ہو پایا کہ کون تنہا سوئے گا۔ آخرکار میں نے ہمت کا مظاہرہ کیا اور اکیلے سونے کا فیصلہ اس شرط پر کیا کہ میں بتی جلا کے سوؤں گا اور سب میرا مذاق نہیں اڑائیں گے۔

ابھی چند گھنٹے ہی گزرے تھے کہ اچانک بجلی چلی گئی جس سے کمرے کا ماحول پراسرار ہو گیا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ باہر سے آنے والی درندوں کی آوازوں اور تاریکی نے مجھے خوفزدہ کر دیا۔ مجبوراً اندھیرے میں ٹارچ لیے رضا اور راشد کے کمرے پر دستک دی۔ چند لمحوں بعد رضا نے دروازہ کھولا' تو میں ٹارچ اور گدا ہاتھ میں لیے کھڑا تھا۔ وہ رات ہم تینوں نے ایک ہی کمرے میں گزاری۔

اگلی صبح جب کمرے سے باہر نکلے تو ایک لڑکے اور لڑکی کو دریا کنارے بیٹھے دیکھا۔ ہم نے انچارج گیسٹ ہاؤس سے ان کے بارے میں استفسار کیا۔ پتا چلا کہ دونوں کی ابھی شادی ہوئی ہے اور ان کے کافی رشتے دار مقبوضہ کشمیر میں رہتے ہیں۔ یہ اُن کا انتظار کر رہے ہیں کہ شاید دریا پار انھیں کوئی عزیز نظر آ جائے اور یہ اُسے اپنی شادی کے متعلق بتا سکیں کیونکہ ان دنوں ٹیلی فون کی سہولت موجود نہ تھی۔ خوش قسمتی سے اسی دن ان کی "ملاقات" اپنے رشتہ داروں سے ہو گئی۔ اشاروں کی زبان میں انسان کیا کچھ کہہ سکتا ہے' یہ ہمیں اس دن پتا چلا۔

ہماری اگلی منزل: شاردا

ہم پھر شاردا کی سمت روانہ ہوئے۔ راستے میں کافی اونچائی پر جا کر ایک بریڈنگ فارم دیکھا۔ وہاں حکومت آزاد کشمیر کے محکمہ جنگلی حیات نے پرندوں کو مصنوعی مگر قدرتی ماحول فراہم کیا ہوا تھا۔ ان کے لیے بڑے بڑے پنجرے بنائے گئے جن میں درخت بھی لگے تھے۔ وہاں قیمتی بریڈنگ کے بعد پرندوں کو جنگلوں میں چھوڑا جاتا۔ پرندے بیرون ممالک سے منگوائے گئے تھے جو علاقے کی خوبصورتی میں مزید اضافے کا باعث بنتے۔

ہماری واپسی کے بعد اس علاقے میں بھارتی فوج نے شدید گولہ باری کی اور سڑک پر ٹریفک بالکل مفلوج کر دی۔ اس وجہ سے کیرن بائی پاس روڈ بنائی گئی۔ آج کل یہی سڑک زیر استعمال ہے۔

دودنیال نامی مقام پہ پہنچنے پر پتا چلا کہ کچھ دیر پہلے مجاہدین کی ایک جماعت وہاں گزری ہے۔ ہم جیپ سے اُترے اور لائن آف کنٹرول کی طرف چل پڑے تاکہ مجاہدین سے ملاقات کر سکیں۔ پیدل چلنے کا یہ راستہ پہاڑی کے دامن میں واقع تھا۔ پہاڑ چنار کے درختوں سے لدا ہوا تھا۔ دوسری طرف شفاف پانی کا نالہ تھا اور پھر پہاڑ شروع ہو جاتا۔ یہ منظر انتہائی دلکش تھا۔ دور برف پوش پہاڑ نظر آ رہے تھے۔

ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت کے بعد جب ہم اپنی منزل پہ پہنچے تو پتا چلا کہ تھوڑی دیر قبل مجاہدین کا قافلہ مزید آگے روانہ ہو چکا۔ مئی کے مہینے میں بھی وہاں اچھی خاصی سردی تھی۔ راستے میں فوجی کیمپ نظر آئے جن کے اردگرد خاردار تاریں نصب تھیں۔ اور ان پر ٹن کے بے شمار خالی ڈبے لٹک رہے تھے۔ مدعا یہ تھا کہ اگر دشمن داخل ہونے کی کوشش کرے تو ڈبوں کے شور سے پہریدار ہوشیار ہو جائے۔

شاردا سے کچھ دور پہلے ایک نالہ آیا جس میں بہتے پانی کی رفتار انتہائی تیز تھی۔ ہم جیپوں سے اتر آئے اور اس پل کے ذریعے پیدل نالہ عبور کیا جو درختوں کے دو تنے جوڑ کر بنایا گیا تھا۔ ہمارا ایک ساتھی پل سے گزرتے ہوئے نالے میں گرنے سے بال بال بچا۔ تھوڑے ہی فاصلے پر نالہ دریائے جہلم میں ضم ہو رہا تھا جو اُس وقت اپنے جوبن پر تھا۔

شاردا کا قصبہ مظفرآباد سے ۱۳۶ کلومیٹر دور ہے۔ یہ ۲۵۰۰ فٹ کی بلندی پر واقع اور دریائے نیلم کے کنارے ہی آباد ہے۔ اس وادی کا یہ نام ہندوؤں کی دیوی سرسوتی کے نام پر رکھا گیا جو شاردا بھی کہلاتی ہے۔ اسی نام کا ایک پہاڑ بھی گاؤں کے نزدیک واقع ہے۔

دراصل ماضی میں شاردا بدھ مت اور ہندو مت کی مذہبی تعلیم کا بڑا مرکز تھا۔ اسی لیے علاقے میں کئی پرانے مندروں کے آثار موجود تھے۔ ان میں سب سے مشہور ''شاردا پیٹھ'' نامی مندر سرسوتی دیوی کے لیے مخصوص تھا۔

مقامی طور پر یہ بھی مشہور ہے کہ شاردا اور ناردا نامی پہاڑوں کے نام دو ہندو بہنوں کے ناموں پر رکھے گئے۔ شاردا آزاد کشمیر میں ہے اور ناردا جموں و کشمیر میں۔ نالے سے لے کر شاردا تک کا سفر تقریباً تین چار کلومیٹر طویل رہا۔ سڑک دریائے نیلم کے بائیں جانب تھی اور شاردا دائیں جانب۔ ہوا میں معلق ایک پل ان کو آپس میں ملا رہا تھا جس پر سے لوگ پیدل جا سکتے تھے۔ ہمیں بھی گاڑیاں سڑک ہی پر کھڑی کرنا پڑیں۔ رات کے پچھلے پہر جب پانی کا زور کم ہوا تو گاڑیوں پر سوار ہو کر نالہ عبور کیا گیا۔

شاردا میں ایک یوتھ ہوسٹل واقع تھا جو تب ہمیں بالکل خالی ملا۔ وہاں سامان رکھنے کے بعد ہم علاقے کی سیر کرنے نکل پڑے۔ قریبی پہاڑ کی چوٹی پر بدھ مت کے زمانے کی ایک درسگاہ واقع تھی۔ چاروں طرف بدھا کے اشکال پتھروں پر بنی تھی۔ وہاں تک پہنچنے کے لیے بڑے بڑے پتھروں کی سیڑھیاں بنائی گئی تھیں۔ ہم یہ سوچ کر دنگ رہ گئے کہ اتنے بڑے پتھر آخر وہاں تک کیسے پہنچائے گئے؟ ڈوگرہ راجا کا ایک قلعہ بھی دیکھا جو شکست و ریخت کے باعث کھنڈر بن چکا تھا۔ وہیں زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا کہ پانی سے چلنے والی چکی سے کس طرح آٹا پیسا جاتا ہے۔

ہوا میں معلق پل سے گرد و پیش کا نظارہ بہت خوبصورت تھا۔ اگرچہ وہاں واضح طور پہ لکھا تھا کہ تصویر اُتارنا منع ہے مگر منظر کی خوبصورتی دیکھتے ہوئے ہم نے ایک تصویر بنوائی تو ڈیوٹی پر متعین گارڈ دوڑتا ہوا آیا۔ اسی اثنا میں قریب کھڑے ساتھی اُستاد کے بتانے پر کہ یہ سیکرٹری تعلیم کے مہمان ہیں' اُس نے ہمیں تصویریں بنانے کی اجازت دے دی۔ سنا ہے

آج کل وہاں فوجی چوکی بن چکی مگر تب علاقے میں پاک فوج موجود نہ تھی۔

کیل: سفر کا آخری پڑاؤ

اب ہماری منزل کیل گاؤں تھا۔ مظفر آباد سے ۱۵۵ کلومیٹر دور یہ دیہہ ۶۸۷۹ فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ لائن آف کنٹرول اس کے بالکل نزدیک ہے۔ علاقے میں جنگلات کی کثرت ہے جہاں ریچھ اور تیندوے بھی گھومتے نظر آتے ہیں۔ موسم سرما میں شدید برف باری کے باعث کیل تک پہنچنا تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے۔

کیل جاتے ہوئے پاک فوج کے قافلے سے ہمارا آمنا سامنا ہوا۔ فوجی ٹرک موسم سرما کے لیے راشن لے جا رہے تھے۔ جس جگہ ہمارا ٹکراؤ ہوا' وہاں سے صرف ایک گاڑی گزر سکتی تھی۔ چناں چہ ہمیں اپنی جیپیں تقریباً آدھا کلومیٹر پیچھے کرنا پڑیں تاکہ ٹرک گزر سکیں۔ ہم بالکل سڑک کنارے پر تھے اور نیچے عمیق گہرائی میں دریائے نیلم پھرا موجیں مار رہا تھا۔

کیل پہنچے تو بھارتی گولہ باری نے ہمارا استقبال کیا۔ ہم آپس میں بحث کرنے لگے کہ یہ فائر کس ہتھیار کا ہے؟ رضا کے بقول توپ کا گولہ تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ مارٹر کا فائر تھا۔ وہیں ہم نے ایک اسکول کا سائنس ڈیپارٹمنٹ دیکھا تو حیران رہ گئے۔ وہ معیار میں ہمارے اسکول کے شعبہ سائنس سے کسی طور کم نہ تھا۔ کیل میں اس وقت بھی پاک فوج کافی تعداد میں موجود تھی۔ آگے ایک ہائیڈل پاور پلانٹ بھی فوج کے تعاون سے نصب کیا گیا تھا مگر راستہ صاف نہ ہونے کی وجہ سے ہم آگے نہیں جا سکے۔

☆☆

وادی نیلم میں سفر کرتے جابجا انار کے درخت بکثرت نظر آئے۔ اس وقت تو سڑک عمدہ حالت میں نہیں تھی' اب سنا ہے کہ وہ پہلے سے بہتر ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ کیل تک سڑک تعمیر کرتے ہوئے راہ میں کئی چھوٹے بڑے گلیشیئر بھی آئے۔ پاکستانی ہنرمندوں نے جانفشانی سے گلیشیئر اور پہاڑ کاٹ کر راستہ بنا لیا۔ شاعر مشرق نے ایسے دلیر و جری مسلمانوں کے متعلق فرمایا ہے:

یہ غازی یہ تیرے پُراسرار بندے
جنھیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

شاید یہ اس سفر کے اثرات تھے کہ میرے دونوں دوست بعد میں پاک فوج میں شامل ہو گئے اور آج اعلیٰ عہدوں پر فائز مادر وطن کی حفاظت میں مصروف عمل ہیں۔ وہ دشمن کی مکروہ چالوں کا منہ توڑ جواب دینے میں اپنا اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ قارئین سے درخواست ہے کہ اپنے بچوں کو ملک کی سیر کرائیں تاکہ ان میں وطن سے محبت پروان چڑھے اور وہ دشمنوں کے پروپیگنڈہ سے متاثر ہوئے بغیر اپنی مٹی کی اصل خوشبو سے لطف اندوز ہو سکیں۔ یقین کیجیے ہمارا وطن بہت خوبصورت ہے اور ہمارے لوگ بڑی محبت کرنے والے ہیں، ان کی طرف ذرا قدم تو بڑھائیے۔

◆◆◆

آج کل وہاں فوجی چوکی بن چکی مگر تب علاقے میں پاک فوج موجود نہ تھی۔

کیل: سفر کا آخری پڑاؤ

اب ہماری منزل کیل گاؤں تھا۔ مظفر آباد سے ۱۵۵ کلومیٹر دور یہ دیہہ ۶۸۷۹ فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ لائن آف کنٹرول اس کے بالکل نزدیک ہے۔ علاقے میں جنگلات کی کثرت ہے جہاں ریچھ اور تیندوے بھی گھومتے نظر آتے ہیں۔ موسم سرما میں شدید برف باری کے باعث کیل تک پہنچنا تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے۔

کیل جاتے ہوئے پاک فوج کے قافلے سے ہمارا آمنا سامنا ہوا۔ فوجی ٹرک موسم سرما کے لیے راشن لے جا رہے تھے۔ جس جگہ ہمارا ٹکراؤ ہوا' وہاں سے صرف ایک گاڑی گزر سکتی تھی۔ چناں چہ ہمیں اپنی جیپیں تقریباً آدھا کلومیٹر پیچھے کرنا پڑیں تاکہ ٹرک گزر سکیں۔ ہم بالکل سڑک کنارے پر تھے اور نیچے عمیق گہرائی میں دریائے نیلم پھرا موجیں مار رہا تھا۔

کیل پہنچے تو بھارتی گولہ باری نے ہمارا استقبال کیا۔ ہم آپس میں بحث کرنے لگے کہ یہ فائر کس ہتھیار کا ہے؟ رضا کے بقول توپ کا گولہ تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ مارٹر کا فائر تھا۔ وہیں ہم نے ایک اسکول کا سائنس ڈیپارٹمنٹ دیکھا تو حیران رہ گئے۔ وہ معیار میں ہمارے اسکول کے شعبہ سائنس سے کسی طور کم نہ تھا۔ کیل میں اس وقت بھی پاک فوج کافی تعداد میں موجود تھی۔ آگے ایک ہائیڈل پاور پلانٹ بھی فوج کے تعاون سے نصب کیا گیا تھا مگر راستہ صاف نہ ہونے کی وجہ سے ہم آگے نہیں جا سکے۔

☆☆

وادی نیلم میں سفر کرتے جابجا انار کے درخت بکثرت نظر آئے۔ اس وقت تو سڑک عمدہ حالت میں نہیں تھی' اب سنا ہے کہ وہ پہلے سے بہتر ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ کیل تک سڑک تعمیر کرتے ہوئے راہ میں کئی چھوٹے بڑے گلیشیئر بھی آئے۔ پاکستانی ہنرمندوں نے جانفشانی سے گلیشیئر اور پہاڑ کاٹ کر راستہ بنا لیا۔ شاعر مشرق نے ایسے دلیر و جری مسلمانوں کے متعلق فرمایا ہے:

یہ غازی یہ تیرے پُراسرار بندے
جنھیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

شاید یہ اس سفر کے اثرات تھے کہ میرے دونوں دوست بعد میں پاک فوج میں شامل ہو گئے اور آج اعلیٰ عہدوں پر فائز مادر وطن کی حفاظت میں مصروف عمل ہیں۔ وہ دشمن کی مکروہ چالوں کا منہ توڑ جواب دینے میں اپنا اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ قارئین سے درخواست ہے کہ اپنے بچوں کو ملک کی سیر کرائیں تاکہ ان میں وطن سے محبت پروان چڑھے اور وہ دشمنوں کے پروپیگنڈہ سے متاثر ہوئے بغیر اپنی مٹی کی اصل خوشبو سے لطف اندوز ہو سکیں۔ یقین کیجیے ہمارا وطن بہت خوبصورت ہے اور ہمارے لوگ بڑی محبت کرنے والے ہیں، ان کی طرف ذرا قدم تو بڑھائیے۔

◆◆◆

اُردو ڈائجسٹ 60 2014ء

جسم کی سب سے لمبی عصب کا درد

عرق النسا

تیس سے پچاس سال کے مرد و زن
کو نشانہ بنانے والی انوکھی بیماری

صبا شفیق

دور جدید میں شیاٹیکا (عرق النسا) کا درد عام ہو چکا۔ اس درد میں زیادہ تر خواتین مبتلا ہوتی ہیں، اسی لیے اسے عرق النسا کہا جانے لگا۔ اسی نام کی وجہ سے لوگوں میں یہ غلط فہمی پھیل گئی کہ مرد اس تکلیف میں مبتلا نہیں ہوتے۔ ایسا نہیں ہے، مرد بھی اس درد کا شکار ہوتے ہیں مگر خواتین کی نسبت ان کی تعداد کم ہے۔ یہ درد پیڑو (Pelvis) سے شروع ہو کر ٹانگ کے پچھلے حصے سے ہوتا ہوا ٹخنے تک جاتا ہے۔

یہ ایک عصبی درد ہے کیونکہ یہ پیڑو سے شروع ہونے والی ایک عصب (Nerve) شیاٹیکا (Sciatic) میں جنم لیتا ہے۔ یہ انسانی جسم میں پائی جانے والی سب سے لمبی عصب ہے۔ یہ ریڑھ کی ہڈی سے نکل کر پیر کی ایڑی تک جاتی ہے۔

درد عموماً ایک ٹانگ میں ہوتا ہے اور اس کی شدت کم یا زیادہ ہوتی رہتی ہے۔ تکلیف میں مبتلا مریض مسلسل بے چینی کا شکار رہتا ہے۔ بعض اوقات متاثرہ ٹانگ بھاری ہو جاتی ہے اور مریض کے لیے اس پر بوجھ ڈالنا مشکل ہو جاتا ہے۔ متاثرہ ٹانگ میں کمزوری محسوس ہوتی ہے۔ اکثر ٹانگ سن ہو جاتی ہے۔ بیٹھنے اور کھڑے رہنے سے بھی درد کی شدت بڑھتی ہے۔
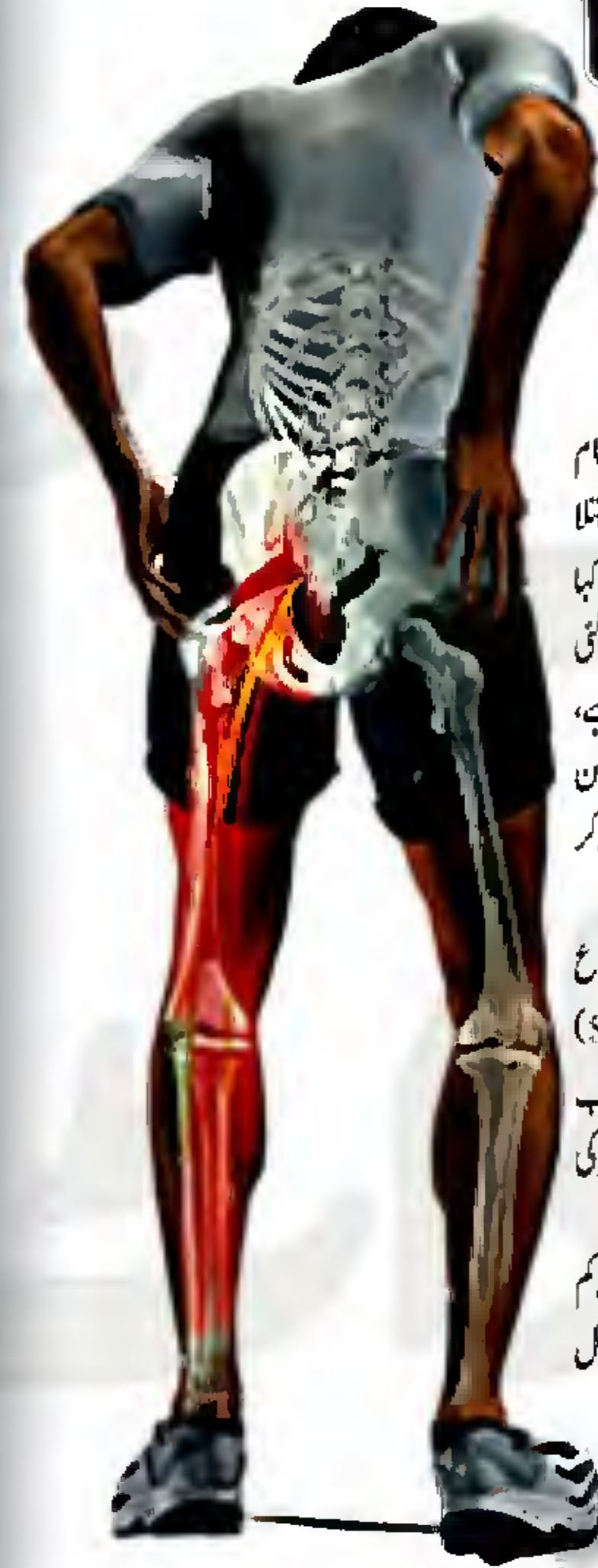
اس درد کا خطرہ عموماً درمیانی عمر میں زیادہ ہوتا ہے۔ امریکن اکیڈمی آف آرتھوپیڈک سرجنز کے مطابق تیس سے پچاس برس کی عمر میں مریض اس کا زیادہ نشانہ بنتے ہیں۔ شیاٹیکا کی تکالیف مختلف وجوہ کی بنا پر جنم لیتی ہے۔ لہٰذا علاج سے قبل تشخیص بے حد ضروری ہے۔

کمر کو شدید جھٹکا لگنے، ریڑھ کی ہڈی کے مہرے بل جانے، مہروں کے درمیان خلا کم یا زیادہ ہونے، کولھے کے پٹھوں کی سوزش، قبض، زیادہ دیر نم دار جگہ پر بیٹھنے، بہت زیادہ بوجھ اٹھانے، اعصابی تناؤ، مسلسل ایک ہی کروٹ لیٹے رہنے، غلط طریقوں سے چلنے، بیٹھنے، اٹھنے، کسی حادثے کے باعث، غرض وہ تمام عوامل جو شیاٹیکا عصب پر بوجھ ڈالیں اور تناؤ کا باعث بنیں، وجہ درد بن سکتے ہیں۔ عمر کے ساتھ ہونے والی جسمانی توڑ پھوڑ بھی اس میں اضافے کا سبب بنتی ہے۔ نیز اونچی ایڑی پہننے والی خواتین، نرم گدوں پر سونے والے اور فربہ لوگ بھی اس درد کا شکار آسانی سے ہو جاتے ہیں کیونکہ ان کی شیاٹیکا عصب پہ مسلسل دباؤ پڑتا رہتا ہے۔

شیاٹیکا کا مریض عموماً ٹانگ گھسیٹ کر چلتا ہے۔ متاثرہ ٹانگ میں اکثر بل بھی پڑ جاتا ہے اور نسیں اکڑ جاتی ہیں۔ مریض کرسی پر ٹانگ لٹکا کر بیٹھا ہو اور گھٹنے کو دبایا جائے تو اُسے ناقابل برداشت درد محسوس ہوتا ہے۔ بیچارا ٹانگ کو بآسانی پیٹ کی طرف موڑ نہیں سکتا کیونکہ کھچاؤ سے مزید تکلیف ہوتی ہے۔ ذرا سی بھی ٹھنڈک درد بڑھا دیتی ہے۔

عرق النسا کے درد میں جس قدر دوا کی ضرورت ہوتی ہے، اتنا ہی پرہیز اور احتیاط بھی درکار ہے۔ دوا، پرہیز اور احتیاط سے عموماً چھے ہفتوں میں مریض صحت یاب ہو جاتا ہے۔ سب سے پہلے تو مریض کو اپنے اٹھنے، بیٹھنے، چلنے اور سونے کے طریقے بدلنے چاہئیں۔ مثال کے طور پر وہ بیٹھنے اور سونے کے دوران اپنی پوزیشن بدلتا رہے۔ زیادہ دیر کھڑے ہونے اور زیادہ دیر بیٹھنے سے گریز کرے۔ سیدھا سوتے وقت تکیہ اپنے گھٹنوں کے نیچے رکھے۔ کروٹ لے کر لیٹے تو ٹانگیں ذرا موڑ کر گھٹنوں کے درمیان تکیہ رکھ کے سوئے۔ اس سے ریڑھ کی ہڈی اور اعصاب پر کم دباؤ پڑتا ہے۔ بیٹھتے وقت کرسی کے پیچھے تکیہ اور کشن وغیرہ رکھے تاکہ کمر کو سہارا ملتا رہے۔

عرق النسا سے چھٹکارا پانے میں غذا کا کردار بہت اہم ہے۔ مریض ایسی غذا کھائے جو غذائیت سے بھرپور ہو اور خصوصاً اُسے قبض سے بچائے۔ اس بیماری کے باعث شیاٹیکا عصب پر مزید دباؤ پڑتا ہے۔ کیلشیم و وٹامن سے بھرپور غذا اعصاب اور پٹھوں کو تقویت بخشتی اور درد سے بچاتی ہے۔ پوٹاشیم بھی پٹھوں میں لچک پیدا کرنے میں معاون بنتا ہے۔ چنانچہ دہی، دلیہ، مغزیات، پھل اور تازہ سبزیاں اپنی غذا میں شامل رکھیے۔ گاجر اور چقندر کا رس نوش کیجیے۔ یہ شیاٹیکا سے جلد نجات دلانے میں مدد کرے گا۔ پانی خوب پیجیے۔ ادرک، لہسن، ہلدی کو اپنی غذا میں شامل رکھیے۔ یہ جڑی بوٹیاں سوزش کم کر کے درد سے آرام دیتی ہیں۔ تلسی، روز میری، بابونہ وغیرہ کی چائے بھی اس مرض میں مفید ہے۔

شیاٹیکا کا علاج بس لیٹے رہنے نہیں بلکہ خود کو متحرک رکھنے میں مضمر ہے۔ کیونکہ اس سے اعصاب اور پٹھوں کو خون اور غذائی اجزا کی فراہمی بہتر طریقے سے ہوتی ہے۔ روزانہ ۲۰ سے ۳۰ منٹ تک پیدل ضرور چلیے۔ ورزش بھی

آرام دینے میں معاون ہوتی ہے۔ بشرطیکہ ماہر ڈاکٹر یا فزیوتھراپسٹ باقاعدہ تشخیص کے بعد اسے تجویز کرے۔ اس مرض میں غلط ورزش درد بڑھا دیتی ہے۔ لہٰذا احتیاط بہت ضروری ہے۔ مگر کچھ ورزشیں تمام مریضوں کے لیے مفید ثابت ہوتی ہیں۔ ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ کمر کے بل لیٹ جائیے اور اپنی بائیں ٹانگ سینے تک موڑ کر لائیے اس طرح کہ گھٹنا آپ کے سینے کو چھو لے۔ اب ۱۰ تک گنتی گنیے۔ پھر دوسری ٹانگ کے ساتھ یہ عمل دہرائیے۔ یہ ورزش دونوں ٹانگوں کے ساتھ تقریباً پانچ بار دہرائیے پھر دونوں ٹانگیں اکٹھی سینے تک لے جائیے۔

۲۔ کمر کے بل لیٹیے اور اپنی ٹانگیں دیوار پر بالکل سیدھی اپنے سامنے اٹھائیے۔ اس حالت میں ۱۵ سیکنڈ تک رہیے۔ یہ ورزش بھی پانچ بار دہرائیے۔ ورزش کے علاوہ سانس کی مشقیں، یوگا، آکوپنکچر اور آکوپریشر بھی شیاٹیکا کے علاج میں معاون ہیں۔ اگر وجہ ایسی ہو جسے آپریشن کے ذریعے دور کیا جا سکے (جیسا کہ مہروں کے درمیان پٹھے دب جانا' ڈسک سرک جانا وغیرہ) تو وہ بھی تجویز کیا جاتا ہے۔ ایپی ڈیورل سٹرائیڈ انجکشن (Epidural Steriod Injection) بھی درد سے نجات پانے میں مفید ہے۔ مگر اس کا اثر چند ہفتے یا مہینے تک رہتا ہے۔ مگر یہ ہر ایک پر اثر نہیں کرتا اور اس کے مضر اثرات بھی ہیں۔ مثلاً پٹھوں اور اعصاب کی کمزوری۔

مساج یا مالش بھی شیاٹیکا کا ایک مستند علاج ہے۔ اگر فزیوتھراپسٹ یا کسی ماہر سے کرایا جائے تو چند دن میں درد جاتا رہتا ہے۔ زیتون کے تیل کی مالش بہتر ہے۔ ایک مفید نسخہ یہ ہے کہ سرسوں کے تیل میں چند لہسن کے جوئے جلا لیجیے۔ پھر اس تیل سے مالش کیجیے۔ مزید برآں روزانہ نہار منہ لہسن کے دو جوئے گرم دودھ کے ساتھ کھائیے۔

وزن اٹھانے، مشقت والا کام کرنے اور نم آلود اور ٹھنڈی جگہوں پر بیٹھنے سے پرہیز کیجیے۔ سب سے بڑھ کر ذہنی دباؤ اور پریشانی سے خود کو بچائیے تو آپ جلد اس درد سے نجات حاصل کر لیں گے۔ ◆◆◆

آج اور کل

وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا
جو آج خود افروز و جگر سوز نہیں ہے
وہ قوم نہیں لائق ہنگامۂ فردا
جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے!

ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام

لا کر برہمنوں کو سیاست کے پیچ میں
زناریوں کو دیرِ کہن سے نکال دو
وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روحِ محمدؐ اس کے بدن سے نکال دو
فکرِ عرب کو دے کے فرنگی تخیلات
اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو
افغانیوں کی غیرتِ دیں کا ہے یہ علاج
مُلّا کو ان کے کوہ و دمن سے نکال دو
اہلِ حرم سے ان کی روایات چھین لو
آہو کو مرغزارِ ختن سے نکال دو
اقبالؔ کے نفس سے ہے لالے کی آگ تیز
ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو!

(علامہ محمد اقبال)

قلبِ انسان منور کر دینے والی

نورِ نبوت کی کرنیں

جنہوں نے بیٹی کو زندہ دفن کرنے والے سنگدل باپ کی کایا پلٹ ڈالی اور بیٹیوں کو سر کا تاج بنا دیا

عبدالغفار نواب شاہی

پچھلی سردیوں کی بات ہے' میں مسجد میں نماز فجر ادا کر کے حسب معمول گھر پہنچا۔ میرے تمام گھر والے چھپر تلے بنے چولھے کے گرد بیٹھے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ بیٹھ گیا اور موسم سرما کا (باجرے کے موٹے آٹے سے بنا) مشروب گھونٹ گھونٹ پینے لگا۔ ساتھ ساتھ آگ پر ہاتھ بھی سینکتا رہا۔

میری داہنی طرف کچھ ہی دور ڈیڑھ سالہ میری بیٹی فہمیدہ بھی اس مشروب سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ وہ اس کے پیٹ میں جانے کے بجائے چہرے ہاتھوں اور کپڑوں کی نذر زیادہ ہو رہا تھا۔ جب باپ بیٹی کی نظروں کا تبادلہ ہوا تو دونوں جانب محبت جوش مارنے لگی۔ اگلے لمحے فہمیدہ میری گود میں تھی۔ میں نے بھی بیٹی کو اپنی بانہوں میں لے لیا۔ مشروب سے لت پت فہمیدہ چند سیکنڈ بیٹھنے کے بعد واپس اپنی فرشی نشست پر چلی گئی۔ مگر میرا سفید جوڑا فہمیدہ کے ہاتھوں بری طرح خراب ہو گیا۔

میں نے پیار بھری سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے اُسے کہا "آپ نے میرا جوڑا خراب کر دیا۔" یقین جانیے' وہ ڈیڑھ سالہ بچی میری بات سمجھ کر بار بار اپنے ننھے منے ہاتھوں سے میرے کپڑوں پر لگا مشروب صاف کرنے لگی۔ سفید جوڑے نے صاف کیا ہونا تھا، مزید خراب ہو گیا۔ مگر تب باپ بیٹی کی محبت کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر کا مظہر دیکھ کر فرشتوں نے بھی ہم پر رشک کیا ہو گا۔

فہمیدہ کا پیار بھرا طرزِ عمل دیکھ کر یکایک مجھے چودہ سو سال پہلے کی ایک ننھی عرب بچی کا قصہ یاد آنے لگا۔ تب آنکھوں میں آنسوؤں کا ایک سمندر رواں ہو گیا۔ زمانہ جاہلیت میں عرب اپنی بچیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے۔ جب آپ ﷺ کو نبوت ملی تو یہ رسم بد ہمیشہ کے لیے

دفن ہوگئی۔ وہ قصہ یہ ہے:

خاتم الانبیا رحمۃ للعالمین ﷺ مسجد میں تشریف فرما تھے۔ ایک شخص آ کر کہنے لگا "اے اللہ کے رسولؐ! زمانہ جاہلیت میں ہم بتوں کی عبادت کیا کرتے تھے اور اپنی بیٹیوں کو قتل کر دیتے۔ میری ایک بچی تھی۔ وہ بھی بتوں کی عبادت کرنے لگی۔ جب میں اسے بلاتا' وہ خوشی خوشی میرے پاس آتی۔ ایک دن میں اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ قریب ایک کنواں تھا' وہاں پہنچ کر میں نے اسے پکڑ کر کنوئیں میں ڈال دیا تاکہ اُسے مار سکوں۔ تب وہ چلاتے ہوئے کہہ رہی تھی "اے میرے ابو اے میرے ابو۔"

یہ ماجرا سن کر رحمت للعالمین ﷺ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا "پھر سناؤ۔"

اس شخص نے وہی قصہ سنایا۔ اس بار آپ ﷺ اتنا زیادہ روئے کہ داڑھی مبارک آنسوؤں سے تر ہوگئی۔

قارئین کرام، یہ ڈھکی چھپی بات نہیں' قبل از اسلام دنیا کی کئی اقوام میں باپ لڑکی کو اپنے لیے موجب عار و ذلت سمجھتے تھے۔ چناں چہ اسے زندہ دفن کر دیا جاتا۔ مگر آج میرے جیسے کروڑوں مسلمانوں بلکہ تمام انسانوں کی گود میں کئی فہمیدائیں نہ صرف جی رہی ہیں بلکہ ان کے وجود کو باعث خوشی و مسرت جانا جاتا ہے۔

ایک صاحب مجھ سے کہنے لگے "مجھے اللہ پاک نے بیٹی دی ہے۔ میں نے اسے بیت اللہ میں رو رو کر خدا کریم سے مانگا ہے۔"

اس باپ کو یہ حوصلہ کہاں سے ملا؟ ایک بچی باپ کے ظالم ہاتھوں سے کنوئیں کی نذر ہوگئی...... دوسری بچی پانے کی خاطر باپ کے ہاتھ سایہ بیت اللہ تلے اُٹھے رہے۔ پہلی بچی کی چیخ پکار بیکار گئی، آج دوسری بچی کے ناز برداشت کیے جا رہے ہیں۔

اب فہمیدہ کے ہاتھوں تکنے والی آکروگی کو محبت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ منہ میں پیار کی گھٹی ڈالی جاتی اور اُسے گھر کی زینت سمجھا جاتا ہے۔ محبت کے اس بیج کو بوئے ہوئے چودہ سو سال گزر گئے...... مجال ہے' ان محبتوں میں ذرا برابر کمی آئی ہو۔ اب مسلمان تو مسلمان غیر مسلموں کے ہاں بھی بچیوں نے عزت پالی۔

ایک زمانہ وہ تھا جب روئے ارض پر سنگ دل انسانوں کی کثرت تھی۔ خودغرضی اور تکبر کے مارے یہ انسان اپنے بچوں کو بھی مارنے سے نہ چوکتے۔

آخر کیا بات ہے کہ تب بیٹی کا وجود بار گزرتا تھا اور آج وہ باعث مسرت ہے؟ اُس وقت کی بیٹی کا چلنا پھرنا باپ کی غیرت کو للکارتا تھا مگر آج باعث رونق و افتخار بن چکا؟

قارئین! ذرا غور فرمائیے' ان فہمیداؤں کی قسمت کیسے بدلی' محبت کی یہ تخم ریزی کس نے کی؟ دن رات بدلے نہ زمانہ' رات کا اندھیرا کم ہوا نہ سورج کی روشنی پھر آخر یہ انقلاب کیسے آیا؟ ننھی بچیوں کو جینے کا حق کس نے دیا؟ ان کی ڈوبتی ناؤ کو کنارہ اور موت کو زیست کا پروانہ کس نے دیا؟ اپنے سفاک ہاتھ نہیں فہمیداؤں کے ہاتھ حنا سے سرخ' زمین کا پیٹ نہیں ماؤں کی گود آباد' کنوئیں اور گڑھے نہیں اسکول اور مدارس آباد کرنے کا سبق کس نے دیا؟ کیسے آئی یہ بہار اور کہاں گیا وہ موسم خزاں جس کے اثر سے درختوں کے پتے نہیں معصوم بچیوں کا جسم جھڑتا تھا' درختوں کی شاخیں نہیں ماؤں کی گودیں خالی ہوا کرتی تھیں۔ کیسی تھی وہ خزاں جس کی باد مخالف کا نشانہ گلاب و چنبیلی نہیں حوا کی بیٹی ہوا کرتی تھی؟ خانہ خدا کو لات و عزیٰ جیسے ناپاک بتوں سے آباد کیا گیا اور ارض خدا کو حوا کی بیٹی سے محروم......!

جب دنیا والے انصاف کرنے سے قاصر ہو گئے' اللہ جل شانہ نے خاتم الانبیا، محسنِ رحمت ﷺ کو مبعوث فرمایا۔ سیرت و صورت کے پیکر محسن انسانیت ﷺ نے بے حس لوگوں کی مردہ رگوں میں روح پھونکی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ آج کی فہمیدہ دل کی دھڑکن اور گھر کی زینت بن چکی...... اُسے ماں' بیٹی' بہن اور بیوی جیسے عظیم رشتوں کے ساتھ جینے کا حق مل گیا۔ آج فہمیدائیں اپنا سر اونچا کیے ہنسی خوشی زندگی بسر کرتی۔ اسی سلسلے میں آقائے نامدار حضرت محمد ﷺ کی چند احادیث مع تشریح ملاحظہ فرمائیے۔

لڑکیوں کی پرورش کا ثواب

۱۔ حضرت عقبہ بن عامرؓ بیان کرتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے سنا کہ جس شخص نے تین بیٹیوں کی پرورش کی، ان کے لیے دکھ تکلیف پر صبر کیا اور انھیں اپنے مال میں سے کپڑے پہنائے تو یہ لڑکیاں اس کے لیے دوزخ سے آڑ بن جائیں گی۔

۲۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ جس کی تین بیٹیاں ہوں۔ ان کو وہ ٹھکانا دے' ان کی کفالت کرے اور ان پر شفقت رکھے تو ضرور اس پہ جنت واجب ہوگی۔ ایک شخص نے عرض کیا "یارسول اللہ ﷺ اگر کسی کی دو ہی بیٹیاں ہوں۔ اور وہ ان کے ساتھ حسن سلوک کرے تو کیا اس کا بھی یہی درجہ ہے؟" آپؐ نے فرمایا "دو بیٹیوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا بھی یہی درجہ ہے۔"

بچی صنف نازک سے تعلق رکھتی ہے۔ آج بھی خصوصاً باپ یہ سوچ کر بیٹیاں نہیں چاہتے کہ انھیں پال پوس کر بڑا کرو مگر وہ بیاہ کے دوسرے گھر چلی جاتی ہیں۔ ایسے گھرانے بچیوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے میں کوتاہی برتتے ہیں۔ آج بھی جاہل لوگ لڑکی کو دوسرے کے گھر کا کوڑا کہتے ہیں۔ زمانہ جاہلیت میں تو بچیوں کو عرب زندہ درگور کر دیتے تھے۔ ان باتوں کے پیش نظر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بچیوں کی پرورش کی بہت زیادہ ترغیب دی۔ نیز ان کی پرورش پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بڑے اجر و ثواب کا وعدہ فرمایا۔

بہنوں کی پرورش کا ثواب

ا۔حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے' رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "جس کسی کی تین بیٹیاں یا تین بہنیں ہوں اور وہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرے تو (ان کے ساتھ حسن سلوک کی وجہ سے) وہ جنت میں ضرور داخل ہوگا۔"

سابقہ احادیث کے برعکس اس حدیث شریف میں بیٹیوں کے ساتھ بہنوں کا بھی ذکر ہے۔ یعنی ان کے ساتھ بھی اچھا سلوک کیا گیا' تو بھائی ضرور جنت میں داخل ہوگا۔ ان احادیث میں رسول اللہ ﷺ نے حسن سلوک کو لڑکیوں کا صرف حق ہی نہیں بتایا بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر داخلہ جنت اور دوزخ سے نجات کا اعلان فرمایا۔ ایک حدیث میں یہ خوش خبری بھی سنائی کہ لڑکیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے والے اہل ایمان قیامت کے دن اس طرح میرے قریب اور بالکل ساتھ ہوں گے جس طرح ایک ہاتھ کی باہم ملی ہوئی پانچوں انگلیاں ہوتی ہیں۔

واپس آئی لڑکی پر خرچ کرنے کی فضیلت

علی بن رباحؒ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے سراقہؓ بن جعشم سے فرمایا: میں تمھیں سب سے بڑا صدقہ نہ بتا دوں؟ انھوں نے عرض کیا' یارسول اللہ ﷺ ضرور ارشاد فرمائیے۔ فرمایا "تیری بیٹی تیرے پاس آ جائے

طلاق کے بعد یا شوہر کی وفات کے بعد اور تیرے علاوہ کوئی کمائی کرنے والا نہ ہو تب تو نے اس مجبور اور محتاج پر خرچ کیا تو یہ سب سے بڑا صدقہ ہوگا۔

لڑکی کے لوٹ آنے سے مراد یہ ہے کہ خاوند چل بسے، اُسے طلاق ہو جائے یا کوئی اور ایسا عارضہ پیش آئے جس کی وجہ سے لڑکی واپس آئے۔ تب اس پر خرچ کرنا افضل ترین صدقہ ہوگا۔

یہ افضل اس لیے ہے کہ اوّل یہ صدقہ ہے دوسرے مصیبت زدہ کی امداد ہے تیسرے اس میں صلہ رحمی ہے۔ چوتھے اولاد کی خبرگیری ہے اور پانچویں غم زدہ کی دلداری ہے۔ اور سب سے بڑھ کر حضور ﷺ کی حدیث میں ایسا کرنے کا حکم ہوا ہے۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ اعمال ہیں۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو شخص کسی مصیبت زدہ کی فریادرسی کرے، اس کے لیے مغفرت کے بہتر درجے لکھے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک میں اس کے تمام امور کی اصلاح و درستی ہے اور بہتر درجے قیامت میں اس کی ترقی کا سبب ہیں۔ دوسری روایت میں ہے کہ ام المومنین حضرت اُم سلمہؓ نے حضور ﷺ سے دریافت کیا کہ میرے پہلے خاوند ابوسلمہ کی جو اولاد میرے پاس ہے ان پر خرچ کرنے کا کیا مجھے ثواب ملے گا؟ وہ تو میری ہی اولاد ہیں۔

حضور ﷺ نے فرمایا "ان پر خرچ کیا کرو اس کا تمھیں ثواب ملے گا۔"

یہ ہیں وہ نورِ نبوت کی کرنیں جن کی شعاعوں سے انسان کا قلب منور ہوا۔ جنھوں نے انسان کو انسانیت سکھائی اور لاکھوں فہیداؤں کو جینے کا حق دے ڈالا:

(مضمون نگار کورنگی کراچی کی جامعہ دارالعلوم سے بطور استاد وابستہ ہیں)

◆◆◆

بیٹے! یہ تم نے کیا کیا؟

فارسی مثنوی "رموزِ بے خودی" میں حضرت علامہ محمد اقبال نے اپنے بچپن کا ایک اہم واقعہ لکھا ہے۔ ایک ضدی فقیر دروازے پر بار بار صدا لگا رہا تھا اور کسی صورت ٹلنے کا نام نہ لیتا۔ ان کو جو غصہ آیا تو اس کے سر پر ایک ڈنڈا رسید کر دیا۔ فقیر لڑکھڑایا اور اس کی جھولی میں جو کچھ تھا، وہ نیچے گر پڑا۔ والد شیخ نور محمد نے جب یہ دیکھا تو تڑپ اٹھے اور سخت آزردہ ہوئے۔

شیخ نور محمد: یہ تم نے کیا کیا؟

اقبال: یہ یہاں سے ٹلتا کیوں نہیں تھا؟

شیخ نور محمد: بیٹے! کل آنحضور ﷺ کی امت میدانِ حشر میں جمع ہوگی اس میں ملتِ بیضا کے غازی، عالم، شہید، زاہد، عاشق، گنہگار سب ہی شامل ہوں گے تو اس مظلوم فقیر کے نالے بلند ہوں گے۔ بیٹے! جب تیرے لیے مرکب کے بغیر راستہ چلنا مشکل ہوگا اس وقت حضورؐ مجھے کہیں گے، اللہ نے ایک مسلمان بچہ تیرے سپرد کیا تھا کہ تو اسے صحیح تعلیم و تربیت دے۔ لیکن اس بچے نے میرے دین سے کوئی استفادہ نہ کیا اور تو ایک کام بھی نہ کر سکا یعنی تو مٹی سے بنے ہوئے پتلے کو آدمیت کا سبق نہ دے سکا۔ تب میں اس کا کیا جواب دوں گا؟

بیٹے! ذرا خیال کر کہ امت خیر البشرؐ کے اجتماع کے سامنے میری کیا حالت ہوگی۔ خدا کے لیے میری سفید ریش کالی نہ کر، میری امید و بیم کی کیفیت کا خیال کر، اپنے باپ پر اتنے ستم نہ ڈھا اور آقائے کائنات کے سامنے اس بندۂ عاجز کو رسوا نہ کر۔

(مکالماتِ اقبال، پروفیسر سعید راشد (علیگ)

جب گورنر کو قانون کے سامنے سر جھکانا پڑا

اسلامی عدل و انصاف کے بے مثال واقعات

محمود احمد ظفر

تاریخ اسلام میں قاضیوں کا کردار بڑا تابناک رہا ہے۔ وہ عدل و انصاف کے تقاضے پورے کرنے میں کسی بڑی شخصیت کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ آج کل کے تو کئی جج حاکم وقت کا اشارہ پاتے ہی حق و انصاف کا خون کرتے اور سمجھتے ہیں کہ عدل سے کام لیا۔ تاریخ اسلام میں قاضی سوار بن عبداللہ گزرے ہیں۔ علم میں ممتاز اور حق و انصاف کے معاملے میں جری۔

ان کے زمانے میں بصرہ کا کوتوال (آئی جی پولیس) عقبہ بن مسلم الھنائی اپنے ظلم و ستم کے باعث مشہور تھا۔ اس نے ایک شخص کو جو دریا سے ہیرا نکال کر لایا تھا، گرفتار کیا اور اس سے ہیرا چھین لیا۔ اس شخص کی بیوی نے قاضی بصرہ، سوار بن عبداللہ کو درخواست دی۔ قاضی سوار نے کوتوال سے جواب طلب کیا۔ اس نے قاضی سوار کو برا بھلا کہا کہ کیونکہ کوتوال ہونے کا نشہ جو دماغ پر تھا۔ قاضی سوار نے اسے لکھا:

"طاقت کے نشے نے تمھیں ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیا ہے۔ تم اب سچ اور جھوٹ

کے مابین تمیز نہیں کر سکتے۔ تم سیدھی راہ پر نہیں آئے، تو خلیفہ کو سارے حالات لکھ بھیجوں گا۔"

بادشاہ تک معاملہ پہنچنے کا سن کر کوتوال کے حواس ٹھکانے پر آئے۔ اس نے نہ صرف شہری کو رہا کیا بلکہ ہیرا بھی اسے واپس کر دیا۔

انھی قاضی سوار کا ایک اور واقعہ ہے کہ ایک بار مشہور عباسی خلیفہ ابوجعفر منصور کے دربار میں تشریف لائے اور کہا "السلام وعلیکم یا امیرالمومنین ورحمتہ وبرکاتہ۔"

خلیفہ نے جواب دیا "وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ وبرکاتہ، ابوعبداللہ! قریب آؤ۔"

انھوں نے کہا: "امیرالمومنین! سلف کے طریق پر قریب آؤں یا آج کل رائج طریقے پر؟"

خلیفہ نے کہا: "نہیں، سلف کے طریقے پر۔"

قاضی سوار رحمہ اللہ آگے بڑھے اور اپنی جگہ بیٹھ گئے...... ابوجعفر کا انھوں نے ہاتھ نہیں چوما۔ اسی وقت ابوجعفر کو چھینک آ گئی۔ اس نے 'الحمدللہ' نہیں کہا۔ قاضی صاحب نے یرحمک اللہ کہہ کر جواب نہ دیا۔ خلیفہ کو دوبارہ چھینک آئی۔ اب اس نے "الحمدللہ" کہا تو انھوں نے "یرحمک اللہ" کہہ دیا۔ جب قاضی مجلس سے اٹھ کر چلے گئے تو منصور انھیں دیکھتا رہا اور ان کے جانے کے بعد کہا:

"اتـزعـمـون ان هـذا يحـابـي؟ والـلـه! مـاحـابـي فـي عطـسـتـه۔" (کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ کسی معاملے میں جانب داری کریں گے جب کہ یہ چھینک میں بھی میری رعایت نہیں کر سکے؟ (اخبار القضاۃ ج ۲ ص ۸۸)

☆☆

ایک دفعہ خلیفہ ابوجعفر منصور نے قاضی سوار کو کسی معاملے میں حکم لکھ کر بھیجا۔ قاضی صاحب نے پڑھا تو وہ حق و انصاف کے یک قلم خلاف تھا۔ انھوں نے حکم نافذ کرنے سے انکار کر دیا۔ خلیفہ بڑا ناراض ہوا اور انھیں قاضی کے عہدے سے فارغ کرنا چاہا۔ مگر درباریوں نے کہا "قاضی سوار رحمہ اللہ کا عدل و انصاف اور حق پرستی آپ کی خلافت کے باعث زینت ہے۔" یہ سن کر خلیفہ خاموش ہو گیا۔ (اخبار القضاۃ ج ۲ ص ۶۰)

باغ کا قضیہ

اس دور کے جری قاضی آج جنم لے لیں تو لوگوں کو حصول انصاف میں کوئی مشکل پیش نہ آئے۔ زمانہ قدیم کی اسلامی حکومتوں میں قاضی کی خاص حیثیت تھی۔ وہ انتہائی عزت و احترام کا مستحق سمجھا جاتا۔ قاضیوں نے انتظامیہ کے خلاف فیصلے کرنے میں کوئی پس و پیش نہ کی۔ چناں چہ کتابوں میں مرقوم ہے کہ کوفہ میں عدالت کا اجلاس ہو رہا تھا۔ قاضی شریک بن عبداللہ مقدمات کی سماعت کر رہے تھے۔ باہر لوگوں کا ہجوم تھا جن کے مقدمات کی شنوائی عدالت میں ابھی ہونی تھی۔ اس ہجوم میں ایک بڑھیا بھی کھڑی تھی جس کے چہرے سے فکر و ملال ٹپک رہا تھا۔ ضعف و مسکنت کے آثار بھی نمایاں تھے۔

جب وہ اپنی باری پر قاضی کے حضور پیش ہوئی تو انھوں نے پوچھا "بی بی کیا معاملہ ہے؟"

اس نے بھرائی آواز اور نمناک آنکھوں سے کہا "حکومت وقت نے مجھ پر ظلم کیا ہے۔ میں اس کی فریاد لیے آپ کے پاس آئی ہوں۔"

قاضی صاحب نے تفصیل پوچھی تو اس نے بتایا

"دریائے فرات کے کنارے میرا کھجور کا ایک باغ تھا جو ہمیں ورثے میں ملا۔ میرے والد فوت ہوئے، تو بھائیوں نے اسے تقسیم کر دیا۔ میں نے اپنے حصے کو دیوار بنا کر علیحدہ کیا اور باغ کی نگرانی و حفاظت کے لیے ایک ملازم رکھ لیا۔ کچھ عرصہ بعد گورنر کوفہ، موسیٰ نے میرے بھائیوں کے حصے خریدے، تو میرے باغ پر حریصانہ نظریں گاڑ دیں۔ چناں چہ اس نے مجھے بھی باغ فروخت کرنے کا کہا، لیکن میں نے انکار کر دیا۔ ایک روز گورنر موسیٰ چند نوجوانوں کے ساتھ آیا اور میری تعمیر کردہ دیوار گرا دی۔"

یہ واقعہ بیان کر کے اس پریشان عورت نے کہا "اے قاضی! میں اب تیرے پاس اپنا حق لینے آئی ہوں۔ میں عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہو کر یہ اعلان کرتی ہوں کہ اپنا باغ گورنر موسیٰ کے ہاتھ ہرگز فروخت نہیں کروں گی۔"

قاضی شریک بن عبداللہ نے یہ واقعہ بڑے غور سے سنا۔ جونہی بڑھیا نے بات ختم کی تو قاضی نے لمحہ بھر کے لیے سر جھکایا پھر آواز دی: "خادم!" جب وہ حاضر ہوا تو قاضی نے ایک سمن پر اپنی مہر لگا کر اسے دی اور کہا کہ گورنر موسیٰ کو ساتھ لے کر آؤ۔ خادم جب عدالت کا سمن لیے گورنر کے گھر پہنچا اور اسے ساتھ چلنے کو کہا تو وہ لال پیلا ہو گیا۔ غصے کے باعث آنکھوں سے چنگاریاں جھڑنے لگیں۔

اس نے اسی وقت کوتوال شہر کو بلایا اور حکم دیا "فوراً قاضی شریک کے پاس جاؤ اور انھیں میری طرف سے کہو کہ تم بھی عجیب آدمی ہو، ایک بڑھیا کا جھوٹا دعویٰ تم نے تسلیم کر لیا۔ اب مجھے اس دوش بدوش کھڑا کرنے عدالت بلا رہے ہو۔ تمھیں میرے منصب کا کچھ تو لحاظ ہونا چاہیے۔"

وہ کوتوال قاضی شریک کے مزاج سے بخوبی آشنا تھا۔ اس نے عرض کی کہ آپ میری جگہ کسی اور شخص کو بھیج دیجیے لیکن گورنر نہ مانا۔ ناچار اسے جانا پڑا۔ کوتوال نے قاضی شریک کی عدالت میں حاضر ہو کر گورنر کا پیغام دیا۔ قاضی نے اسی وقت سپاہی کو بلا کر حکم دیا کہ اسے پکڑ کر جیل میں ڈال دو۔

گورنر کو جب پتا چلا کہ قاضی نے کوتوال کو جیل بھیج دیا ہے تو وہ اور سیخ پا ہوا۔ اب اس نے اپنا حاجب (نائب) قاضی کے پاس بھیجا۔ اس نے کہا: "قاضی صاحب! کوتوال تو صرف گورنر کا پیغام لے کر آیا تھا لیکن آپ نے اسے جیل بھیج دیا۔" قاضی نے اسی وقت سپاہی کو آواز دی۔ جب وہ آیا تو کہا "اس صاحب کو بھی کوتوال کے ساتھ جیل میں بند کر دو۔"

جب گورنر کو پتا چلا کہ قاضی شریک نے حاجب کو بھی جیل بھیج دیا تو زخمی سانپ کی طرح تڑپنے لگا۔ اس کی حالت دیدنی تھی۔ لیکن اسے رہائی کی کوئی صورت بھی نظر نہ آئی۔ آخر اس نے معززین شہر کو بلایا جن میں کئی لوگ قاضی شریک کے دوست احباب بھی تھے اور انھیں کہا "آپ قاضی کے پاس جائیے اور انھیں بتائیے کہ آپ نے میری توہین کی ہے۔ میں کوئی عام شہری نہیں کہ عدالتوں میں حاضری دیتا پھروں۔ پھر انھوں نے میرے پیغام بروں کو بھی جیل میں ڈال دیا۔"

معززین کوفہ اور قاضی شریک کے دوستوں نے انھیں گورنر کا پیغام پہنچایا۔ قاضی صاحب کو غصہ آ گیا۔ انھوں نے حضرات سے مخاطب ہو کر کہا: "تم لوگ مجھے

"ایسی بات کہنے آئے ہو جسے کہنے کا تمہیں کوئی حق حاصل نہیں۔" پھر انھوں نے خدام کو آواز دی اور کہا "ان سب کو پکڑ کر جیل میں ڈال دو۔"

انھوں نے حیرانی سے پوچھا کہ آخر ہمارا جرم کیا ہے؟ قاضی نے جواب دیا "تم لوگ فتنہ ہو۔ حق کی راہ میں مزاحم اور قوانین شریعت کے نفاذ میں رکاوٹ بن رہے ہو۔ تمھاری سزا قید ہی ہے تاکہ تم آئندہ کسی ظالم کے پیغام بر نہ بن سکو۔"

گورنر موسیٰ کو جب قاضی شریک کے اس حکم کا پتا چلا تو وہ غصہ سے لال بھبوکا ہو گیا۔ فوراً اپنا گھڑسوار دستہ لیے جیل خانہ پہنچا اور اپنے ان تمام ساتھیوں کو رہا کر دیا جنھیں قاضی نے جیل میں قید کیا تھا۔ اگلے روز صبح قاضی صاحب عدالت لگائے بیٹھے تھے کہ داروغہ جیل حاضر ہوا اور گزشتہ روز کی ساری روداد گوش گزار کر دی۔ بتایا کہ گورنر موسیٰ نے ان سب قیدیوں کو رہا کرا لیا جنھیں آپ نے جیل بھجوایا تھا۔

قاضی صاحب نے جونہی یہ سنا فوراً کھڑے ہوئے۔ عدالت برخواست کر دی اور گھر پہنچے۔ غلام سے کہا "میرا سامان گھر پہنچا دو۔"

غلام نے پوچھا "کیا جناب منصب عدالت چھوڑ دینا چاہتے ہیں؟"

قاضی نے جواب دیا: "بخدا امیر المومنین نے زبردستی یہ منصب اس شرط پر ہمارے سپرد کیا تھا کہ وہ یا ان کا کوئی اہلکار عدالت کے کام میں مداخلت نہیں کرے گا۔ آج یہ مداخلت ہو چکی، لہٰذا یہ منصب انھیں لوٹانے جا رہا ہوں۔"

گورنر موسیٰ کو جب یہ خبر ملی کہ قاضی شریک رحمہ اللہ نے استعفیٰ دے دیا ہے اور وہ بغداد خلیفہ کے پاس جا رہے ہیں، تو اب وہ گھبرایا۔ چناں چہ اس نے فوراً فوجی دستہ ساتھ لیا، قاضی کو بغداد کے راستہ میں جا لیا اور لگا منت سماجت کرنے۔ عرض کی "آپ واپس تشریف لے چلیے اور اپنے فرائض ادا کیجیے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ جو کچھ آپ چاہیں، وہی ہوگا۔"

قاضی نے کہا "جب تک وہ سب لوگ جیل نہیں جاتے جو کل تو نے رہا کرائے ہیں، میں ہرگز واپس نہیں جاؤں گا۔ ورنہ امیر المومنین کے دربار میں پہنچ کر جو بوجھ انھوں نے میرے کندھوں پر لاد رکھا ہے، ان کی خدمت میں رکھ دوں گا۔"

گورنر موسیٰ نے فوراً شرط مان لی اور ان سب لوگوں کو فوری طور پر جیل بھجوا دیا۔ اب قاضی صاحب نے خدام سے فرمایا کہ گورنر کی سواری کی لگام پکڑ کر انھیں میری عدالت میں حاضر کرو۔ گورنر پھر کی عدالت میں مظلوم بڑھیا کے ساتھ کھڑا کیا گیا۔ قاضی نے اس عورت سے کہا: "بی بی! فریق ثانی حاضر ہے، جو کچھ کہنا ہے، بے خوف ہو کر کہو۔"

عورت نے تمام داستان دہرائی۔ اب قاضی نے گورنر سے پوچھا: "اس خاتون نے جو دعویٰ دائر کیا ہے، اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

گورنر نے جواب دیا "یہ بالکل درست کہتی ہے۔"

قاضی نے کہا "جو دیوار آپ نے گرائی ویسی ہی نئی دیوار فوراً بنوا دیجیے۔"

چناں چہ حکم کی تعمیل کی گئی۔ بڑھیا قاضی کو دعائیں دیتی چلی گئی۔ یوں قاضی شریک بن عبداللہ نے حق و انصاف کی تاریخ میں ایک روشن باب کا اضافہ کر دیا۔ ◆◆◆

اسلامی تاریخ

ترکی

کا شہر بروصہ قدیم شہر ہے۔ اس کی بنیاد دوسری صدی قبل مسیح میں "پروسیا" نامی ایک بادشاہ نے رکھی تھی۔ اس کے نام کی مناسبت سے اسے "پروسہ" کہا جانے لگا۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ بروسہ کہلایا اور پھر بروصہ بھی کہلانے لگا۔ لیکن اس کی حیثیت طویل عرصہ عام شہر سے زیادہ نہ تھی۔ چودھویں صدی عیسوی میں اناطولیہ میں قائم عثمانی ترکوں کی پہلی سلطنت کا دارالسلطنت بننے کے بعد اسے بروصہ کہا گیا۔ لیکن یہ اعزاز اس شہر کو زیادہ عرصہ حاصل نہ رہا۔ یورپی علاقوں پر قبضہ کر لینے کے بعد دارالسلطنت کو بھی یورپ کی جانب واقع "ادرنہ" شہر منتقل کر دیا گیا۔ بعدازاں قسطنطنیہ کی فتح کے بعد اگلی پانچ صدیوں کے لیے اسی کو پہلے اسلامبول اور پھر استنبول کا نام دے کر رونق بخشی گئی۔

بروصہ ترکوں کے ماضی بعید کا امین ہے۔ ترکان عثمانیہ کے پہلے امیر، غازی عثمان کا مقبرہ وہیں واقع ہے۔ شہر کی مشہور مسجد، علو جامع یعنی مسجد اکبر چودھویں صدی عیسوی کے آخر میں تعمیر کی گئی۔ گویا اس کی تعمیر کو چھے سو سال بیت چکے۔

"علو جامع" کی چھت بیس گنبدوں سے مل کر بنی ہے۔ تقریباً وسط میں واقع ایک گنبد کی جگہ کچھ عرصہ خالی رہی۔ پھر اس پر شیشے سے اسی شکل کا گنبد بنا دیا گیا جس میں سے دھوپ گزر کر مسجد کے ہال کو اضافی روشنی بہم پہنچاتی ہے۔ شیشے کے اس گنبد کے نیچے ایک فوارہ اور برائے وضو ایک حوض واقع ہے۔ اس نے پورے زمینی رقبے کو اس طرح گھیر رکھا ہے کہ

ایک مسلمان بادشاہ کے نام

عیسائی بڑھیا کی وصیّت

مسلم حکمرانوں کا بے مثال عدل اجاگر کرتا سبق آموز واقعہ

غزالہ عزیز

وہاں نماز ادا کرنے کی گنجائش بالکل نہیں رہتی۔ اس گنبد کی تعمیر کا مصدقہ قصہ بڑا دلچسپ ہے۔

''ملوجامع'' کی تعمیر فاتح قسطنطنیہ، سلطان محمد ثانی کے والد سلطان مراد ثانی کے زمانے میں ہوئی۔ تب وہ اناطولیہ کی چھوٹی سی عثمانی سلطنت پر بروصہ سے حکومت کر رہے تھے۔ انھوں نے اپنے دارالحکومت میں تاریخی مسجد اور اس سے ملحق تعلیمی اور فلاحی عمارت بنوانے کے لیے یہ قطعہ زمین پسند کیا۔ تب اس پہ رعایا میں سے کچھ لوگوں کے گھر واقع تھے۔ سلطان نے ان سے گھر اور قطعات منہ مانگی قیمتوں پر خرید کر انھیں خوش حال کر دیا۔

لیکن ایک لاوارث عیسائی بڑھیا اڑ گئی۔ وہ اپنی کٹیا اور تھوڑی سی زمین بڑی سے بڑی قیمت پر بھی فروخت کرنے کو تیار نہ ہوئی۔ یہ زمین شاہی ماہرین تعمیرات کے نقشے کی رو سے عین وسط مسجد میں آتی تھی۔ بڑھیا کو بالجبر بے دخل کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ تھک ہار کر بڑھیا کو اس کے حال پر چھوڑ چاروں طرف سے تعمیر کا کام شروع کر دیا گیا۔

رفتہ رفتہ مسجد تعمیر ہونے لگی۔ یہاں تک کہ تقریباً مکمل ہو گئی۔ مگر بڑھیا کے قطع زمین میں کوئی تعمیر نہ کی گئی۔ اتنے میں بڑھیا پر وہ وقت آ گیا جو ہر انسان پر آکر رہتا ہے اور کسی کے ٹالے سے نہیں ٹالا جا سکتا۔

قریب المرگ بڑھیا نے اپنے پادری اور بستی کے معتبر عیسائی شہریوں کو بلا کر آخری بات یہ کہی ''میرے بعد یہ جگہ لاوارث ہونے کی وجہ سے حکومت کے قبضہ میں چلی جائے گی۔ لیکن سلطان تک میری یہ آخری خواہش ضرور پہنچا دی جائے۔ یہ کہ میری زمین کو مسجد میں شامل کر کے بھی اسے اس کا حصہ نہ بنایا جائے...... اور اس پر سورج کی روشنی کسی رکاوٹ کے بغیر پہنچتی رہے۔

شاگرد نوکر

مولوی میر حسن کے صاحبزادے ذکی شاہ راوی ہیں، ایک دفعہ حضرت علامہ محمد اقبال ہمارے گھر کے لیے سودا سلف لے کر بازار سے لوٹے تو مولوی صاحب دروازے پر کھڑے کسی سے باتیں کر رہے تھے۔

حسن: اقبال! میں نے تمھیں کتنی دفعہ کہا ہے کہ بازار سے ہمارا سودا نہ لایا کرو۔

اقبال: کیوں جناب، میرا قصور؟

میر حسن: تم میرے شاگرد ہو، نوکر نہیں۔

اقبال: جناب! میں آپ کا شاگرد نوکر ہوں۔

(مکالمات اقبال۔ انتخاب: اطیب جان، واہ کینٹ)

یعنی اس پر وہ چھت نہ ہو جو مسجد کے دوسرے حصوں پہ موجود ہے اور نہ کوئی شخص میری زمین پر نماز پڑھے گا۔''

بڑھیا کی تدفین کے بعد اس کی وصیت دربار تک پہنچا دی گئی۔ سلطان نے اس پر حرف بہ حرف عمل درآمد کا حکم دیا...... اور وہ حکم آج چھے سو برس بعد بھی برقرار چلا آ رہا ہے۔

چناں چہ عیسائی بڑھیا کی متروکہ زمین پر وضو تو کیا جا سکتا ہے، لیکن کوشش کے باوجود کوئی شخص وہاں نماز پڑھنے کی جگہ نہیں بنا سکتا۔

یہ واقعہ عیاں کرتا ہے کہ مسلمان حکمران اپنی کمزور اور بے اختیار غیر مسلم رعایا کے ساتھ کیے گئے عہد کی پاسداری کرتے اور انھیں پورا انصاف دیتے تھے۔ یہ شاہی انصاف کی درخشاں مثال ہے۔ ایسی بے شمار مثالیں اسلامی تاریخ کا حصہ ہیں جو آج بزعم خود تہذیب اور انسانی حقوق کی رکھوالی کرنے والے مغربی ممالک کے لیے طمانچے سے کم نہیں۔ ◆◆◆

جگر گوشہ رسول ﷺ

نواسہ رسول ﷺ کی حیات مبارکہ کے یادگار اور سبق آموز پہلو

عمر ابو النصر

جب نبی کریم ﷺ مدینہ منورہ میں مقیم تھے، حضرت حسینؓ شعبان ۴ھ بمطابق جنوری ۶۲۶ء میں وہیں پیدا ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ نے حسینؓ نام رکھا۔ آپؐ کی وفات کے وقت حضرت حسینؓ کی عمر سات سال، سات مہینے اور سات دن تھی۔ اس لیے انھیں رسول اللہ ﷺ کی صحبت سے اتنا فیض حاصل کرنے کا موقع نہ ملا جتنا ان کے والد، حضرت علیؓ کو ملا تھا۔

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ حسنؓ و

حسینؓ سے بہت محبت کرتے تھے اور انھیں دیکھنے کے لیے روزانہ حضرت فاطمہؓ کے گھر تشریف لے جایا کرتے۔ انھیں بلا کر پیار کرتے اور کھانا کھلاتے۔

ایک دفعہ رسول ﷺ حضرت فاطمہؓ کے گھر کے قریب سے گزرے۔ آپؐ نے حضرت حسینؓ کے رونے کی آواز سنی۔ آپؐ گھر کے اندر تشریف لائے اور بیٹی سے فرمایا "کیا تمھیں معلوم نہیں کہ مجھے اس کے رونے سے تکلیف پہنچتی ہے؟"

اسامہؓ بن زید کہتے ہیں "میں کسی ضرورت کے لیے رات کے وقت رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپؐ کوئی چیز چادر میں چھپائے ہوئے باہر تشریف لائے۔ جب میں اپنی بات پوری کر چکا تو میں نے دریافت کیا کہ یارسول اللہ آپؐ چادر میں کیا چھپائے ہوئے ہیں؟

"آپؐ نے چادر ہٹائی تو اس کے نیچے حسنؓ اور حسینؓ ظاہر ہوئے۔ آپؐ نے فرمایا "یہ دونوں میرے بچے اور میری لڑکی کے لڑکے ہیں۔ اے اللہ! میں ان دونوں سے محبت کرتا ہوں تو بھی ان دونوں سے اور ان سے محبت کرنے والوں سے محبت فرما۔"

ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ مسجد میں خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ مسجد میں داخل ہوئے۔ وہ دونوں سرخ رنگ کے کرتے پہنے ہوئے تھے اور صغر سنی کی وجہ سے چلتے ہوئے لڑکھڑا رہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ یہ دیکھ کر منبر پر سے اترے۔ ان دونوں کو گود میں لے کر اپنے پاس منبر پر بٹھا لیا اور فرمایا: "اللہ نے سچ فرمایا ہے کہ مال اور اولاد انسان کے لیے فتنہ اور امتحان ہیں۔ میں نے دیکھا کہ یہ دونوں بچے چلتے ہوئے لڑکھڑا رہے ہیں تو مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے خطبہ چھوڑ کر ان دونوں کو اٹھا لیا۔"

حضرت عمرؓ بھی آپ بھائیوں پر بہت شفقت فرماتے۔ حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ سے بہت محبت کرتے تھے اور ہمیشہ ان دونوں کو اپنے لڑکوں پر مقدم رکھتے۔ ایک دفعہ آپؓ نے لوگوں میں کچھ رقم تقسیم کی اور اس میں سے دونوں بھائیوں کو دس دس ہزار درہم دیے۔ یہ دیکھ کر آپؓ کے صاحبزادے عبداللہ بن عمرؓ نے کہا:

"آپؓ جانتے ہیں کہ میں بہت پہلے اسلام لایا اور ہجرت بھی کی۔ اس پر بھی آپؓ ان دونوں کو مجھ پر ترجیح دیتے ہیں؟"

حضرت عمرؓ نے فرمایا: "عبداللہؓ! مجھے تمھاری یہ بات سن کر بہت رنج ہوا۔ تم بتاؤ کیا تمھارا نانا ان کے نانا کے مانند ہے؟ کیا تمھاری ماں ان کی ماں کے مانند ہے؟ کیا تمھاری نانی ان کی نانی کے مانند ہے؟ کیا تمھارا ماموں ان کے ماموں کے مانند ہے؟ کیا تمھاری خالہ ان کی خالاؤں کے مانند ہے؟ کیا تمھارے چچا ان کے چچا کے مانند ہے؟ کیا تمھاری پھوپھی ان کی پھوپھی کے مانند ہے؟ سنو ان کے نانا رسول اللہ ﷺ ہیں۔ ان کی والدہ حضرت فاطمہؓ ہیں۔ ان کی نانی حضرت خدیجہؓ ہیں۔ ان کے ماموں رسول اللہ ﷺ کے صاحبزادے ابراہیمؑ ہیں۔ ان کی خالائیں رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادیاں حضرت زینبؓ، حضرت رقیہؓ اور حضرت ام کلثومؓ ہیں۔ ان کے چچا جعفرؓ بن ابی طالب ہیں اور ان کی پھوپھی اُم ہانیؓ بنت ابی طالب ہیں۔"

جب بیت المال سے مسلمانوں کے وظیفے مقرر ہوئے تو حضرت عمرؓ نے دونوں بھائیوں کا وظیفہ ان کے والد حضرت علیؓ کی طرح پانچ پانچ ہزار درہم مقرر

کیا حالانکہ اصحاب بدر کے لڑکوں کو دو دو ہزار درہم وظیفہ ملتا تھا۔

ایک مرتبہ یمن کے کچھ حلے مدینے آئے۔ حضرت عمرؓ نے انھیں لوگوں میں تقسیم کر دیا۔ لوگ وہ حلے پہن کر خوشی سے باہر نکل آئے۔ حضرت عمرؓ مسجد نبویؐ میں تشریف فرما تھے۔ لوگ آپؓ کے پاس آتے اور سلام کرتے۔ کچھ دیر بعد حضرت حسنؓ اور حسینؓ بھی اپنی والدہ حضرت فاطمہؓ کے گھر سے نکلے لیکن وہ کوئی حلہ پہنے ہوئے نہ تھے۔ انھیں دیکھتے ہی حضرت عمرؓ بے قرار ہو گئے۔ آپؓ نے لوگوں سے فرمایا: "مجھے تم لوگوں کو حلے دینے سے کوئی خوشی نہیں ہوئی۔"

لوگوں نے وجہ دریافت کی تو آپؓ نے فرمایا: "ان دونوں بچوں کی وجہ سے لوگ حلے پہنے ہوئے ہیں لیکن ان کے جسم حلوں سے خالی ہیں۔"

یہ کہہ کر اسی وقت یمن کے عامل کو فرمان لکھا کہ حسنؓ اور حسینؓ کے لیے فی الفور دو عمدہ حلے بھیج دو۔ اس نے حکم کی تعمیل کی۔ جب حلے آ گئے تو حضرت عمرؓ نے انھیں حسنؓ اور حسینؓ کو پہنایا اور فرمایا: "اب مجھے سچی خوشی حاصل ہوئی۔"

ابن خلدون اور بعض دوسرے مورخ لکھتے ہیں کہ حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ اس لشکر میں موجود تھے جس نے فتح مصر کے بعد افریقا کے دوسرے علاقوں پر چڑھائی کی تھی۔ اسلامی لشکر کے ساتھ جس میں متعدد صحابہؓ شامل تھے، یہ دونوں بھی مغرب اقصیٰ تک پہنچ گئے۔

طبری نے اپنی کتاب ،تاریخ الامم والملوک میں لکھا ہے کہ ان دونوں نے حضرت عثمانؓ کے عہد میں طبرستان کے خلاف جہاد میں حصہ لیا۔ یہ جہاد ۳۰ھ بمطابق ۶۵۰ء میں ہوا۔

ان واقعات سے پتا چلتا ہے کہ حضرت حسنؓ اور حسینؓ، دونوں بھائی ہر وقت اسلام کی حمایت میں دشمنوں کے سامنے سینہ سپر رہتے اور ہر شہر و قصبہ پر اسلامی علم گاڑنے میں پیش پیش تھے۔

حضرت عثمانؓ کے عہد میں جب اسلام کے اندر پہلی بار فتنہ برپا ہوا اور باغیوں نے آپؓ کے گھر کا محاصرہ کر لیا تو حضرت حسینؓ بھی ان معدودے چند نوجوانوں میں سے تھے جنھوں نے جان کی پروا نہ کرتے ہوئے ان کا مقابلہ کیا۔ اس واقعے کی تفصیل یوں ہے کہ جب باغیوں نے حضرت عثمانؓ کے گھر کا محاصرہ کر کے پانی بند کر دیا اور آپؓ کے قتل کا ارادہ کیا تو حضرت علیؓ نے پانی کی تین مشکیں آپؓ کے گھر بھیجیں اور اپنے دونوں بیٹوں، حسنؓ اور حسینؓ کو بھی ہتھیار دے کر آپ کے گھر بھیج دیا۔ انھیں حکم دیا کہ تم تلواریں لے کر عثمانؓ کے دروازے پر کھڑے رہو اور کسی شخص کو جو بری نیت سے گھر میں داخل ہونا چاہے، وہاں قدم نہ رکھنے دو۔

حضرت علیؓ کی طرح زبیرؓ بن العوام، حضرت طلحہؓ اور چند دیگر صحابہؓ نے بھی اپنے لڑکوں کو حضرت عثمانؓ کی حفاظت کے لیے ان کے گھر بھیجا تھا۔

ایک روز حضرت عثمانؓ نے اپنے گھر کی چھت پر چڑھ کر تقریر فرمائی۔ لیکن باغیوں نے آپؓ سے نامناسب سلوک کیا اور آپؓ پر پتھر اور تیر پھینکنے شروع کیے۔ اس دوران آپ کی حفاظت کرتے ہوئے حضرت حسنؓ زخمی ہوئے۔

اسی دوران موقع پا کر باغی گھر کے اندر داخل ہوئے اور خلیفہ سوم کو شہید کر دیا۔ شور سن کر دروازے پر کھڑے محافظ اندر بھاگے۔ دیکھا کہ حضرت عثمانؓ خاک و خون میں غلطاں ہیں۔ اب سوائے افسوس کے کوئی چارہ نہ تھا۔

جب حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کو آپ کی شہادت کی خبر ملی تو وہ بھاگے بھاگے آئے۔ حضرت علیؓ نے اپنے بیٹوں سے پوچھا کہ جب تم دروازے پر موجود تھے تو لوگوں کو گھر میں داخل ہو کر حضرت عثمانؓ کو شہید کرنے کی جرأت کس طرح ہوئی؟ آپؓ نے انھیں تھپڑ مارے اور محمد بن طلحہؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ کو بھی برا بھلا کہا۔

حضرت علیؓ کی خلافت کے ایام میں جو جنگیں ہوئیں، ان سب میں حضرت حسینؓ اپنے والد کے ساتھ رہے۔ جنگ جمل، جنگ صفین اور جنگ نہرواں کے موقع پر آپ نے انتہائی جوانمردی، استقلال، شجاعت اور بہادری کا ثبوت دیا۔

ایک جنگ میں آپؓ نے آگے بڑھ کر ہل من مبارز (کوئی ہے جو میرے مقابلے پر آئے) کا نعرہ لگایا۔ زبر قان نامی ایک شخص جس کی بہادری کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی، آگے آیا اور پوچھا "تم کون ہو؟"

آپؓ نے جواب دیا "میں حسینؓ بن علیؓ۔"

یہ سن کر زبر قان نے کہا "اے میرے بیٹے ! تم لوٹ جاؤ۔ ایک دن میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا تھا۔ آپؐ اونٹنی پر سوار قبا کی جانب سے تشریف لا رہے تھے اور تم رسول اللہ ﷺ کے آگے بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نہیں چاہتا رسول اللہ ﷺ سے اس حال میں ملوں کہ میرے ہاتھ تمھارے خون میں آلودہ ہوں۔"

حضرت حسینؓ کی شہادت کا واقعہ یوم عاشورہ یعنی ۱۰ محرم ۶۱ھ مطابق ۱۰ اکتوبر ۶۸۰ء کو بعد نماز ظہر پیش آیا۔ حضرت حسینؓ کی عمر اس وقت پچپن برس تھی۔ آپؓ کے ساتھ بہتر آدمی شہید ہوئے۔ ان میں اٹھارہ کتب تاریخ میں درج ہے کہ آپؓ کے رشتہ دار اور خاندان بنو ہاشم کے فرد تھے جن کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔عباس بن علیؓ، ۲۔جعفر بن علیؓ، ۳۔عبداللہ بن علیؓ ۴۔عثمان بن علیؓ ۵۔محمد بن علیؓ ۶۔ابوبکر بن علیؓ ۷۔علی بن حسینؓ بن علیؓ ۸۔عبداللہ بن حسینؓ، ۹۔ابوبکر بن حسنؓ ۱۰۔عبداللہ بن حسنؓ ۱۱۔قاسم بن حسنؓ ۱۲۔عون بن عبداللہ بن جعفرؓ ۱۳۔محمد عبداللہ بن جعفرؓ ۱۴۔جعفر بن عقیلؓ، ۱۵۔عبدالرحمان بن عقیلؓ ۱۶۔عبداللہ بن عقیلؓ ۱۷۔عبداللہ بن مسلم بن عقیلؓ ۱۸۔محمد بن ابوسعید بن عقیلؓ۔

عمرو بن سعد کی فوج کے اٹھاسی آدمی مارے گئے۔ زخمیوں کی تعداد ان کے علاوہ تھی۔ عمرو نے تمام شہدا کے سر کاٹنے کا حکم دیا۔ پھر شمر ذی الجوشن، قیس بن اشعث، عمرو بن الحجاج اور عروہ بن قیس کے ہاتھ یہ سر ابن زیاد کے پاس بھجوا دیے۔ یہ لوگ ان سروں کو نیزوں پر ابن زیاد کے پاس لے گئے۔

شہادت کے دو روز بعد عمرو بن سعد حضرت حسینؓ کی بیٹیوں، بہنوں، شیرخوار بچوں اور زین العابدین کو ہمراہ لے کر کربلا سے کوفہ روانہ ہوا۔ جب یہ تباہ شدہ قافلہ اس جگہ سے گزرنے لگا جہاں حضرت حسینؓ اور دیگر شہدا کی لاشیں بے گور و کفن چٹیل میدان میں پڑی تھیں تو قافلے میں ماتم برپا ہو گیا۔ آپ کی بہن، زینب رو رو کر کہتی تھی:

"اے رسول اللہ، جن پر ملائک آسمان سے درود بھیجتے ہیں، دیکھیے، یہ حسینؓ خاک و خون میں غلطاں، ٹکڑے ٹکڑے ہو کر چٹیل میدان میں پڑا ہے۔ آپؐ کی بیٹیاں قیدی ہیں۔ آپؐ کی اولاد مقتول ہے اور ہوا میں ان کی خاک اڑ رہی ہے۔"

یہ دردناک مرثیہ سن کر دوست دشمن کوئی نہ تھا جو رونے نہ لگا ہو۔ اس وقت ان لوگوں کو احساس ہوا کہ وہ کس قدر شدید گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں لیکن اب کیا ہو سکتا تھا؟

◆◆◆

سو باتوں کی ایک بات

ایک معمولی سی اچھائی بھی رب کائنات کی بارگاہ میں صلہ پاتی اور رائیگاں نہیں جاتی

ڈاکٹر ادیب عبدالغنی شکیل

اللہ تبارک وتعالیٰ مجھے معاف کرے، میں بھی کئی ہم وطنوں کی طرح کہا کرتا تھا "آج کل تو نیکی کا زمانہ ہی نہیں رہا۔"

پچھلے دنوں مجھے شادی کی ایک تقریب میں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں کھانے سے قبل حسب معمول لوگ گپ شپ میں مشغول تھے۔ کسی بات کے جواب میں میرے منہ سے نکل گیا: "آج کل تو نیکی کا زمانہ ہی نہیں رہا۔"

حاضرین میں سے اکثر نے میری ہاں میں ہاں ملائی لیکن ایک نورانی صورت بزرگ کہنے لگے "معاف کرنا بیٹا میں آپ کی رائے سے اتفاق نہیں کرتا۔ اس کی وجہ ہے۔ اوّل تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے زمانے پر ایک پوری سورت سورہ عصر نازل فرمائی یعنی اس کا نام ہی "زمانہ" ہے۔ قرآن وسنت میں زمانے کو برا کہنے سے منع کیا گیا ہے۔

"پھر آج کل تو نیکی کا زمانہ ہی نہیں، کہنے والے لوگ نیکی اس لیے کرتے ہیں کہ وہ لوگوں سے اس کا بدلہ چاہتے ہیں۔ حالانکہ نیکی کرنے کا مقصد تو رضائے الٰہی کا حصول ہونا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر زمانہ نیکی کا ہوتا ہے۔ کیونکہ نیکی سدا رہنے والی ہے جبکہ بدی کی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ اسی لیے کوئی بھی دور نیکی کرنے والوں سے خالی نہیں رہا۔"

بزرگ نے جو باتیں بیان کیں وہ بالکل سچی تھیں اس لیے سب نے ان سے اتفاق کیا۔ چند لمحوں بعد کھانا شروع ہو گیا۔ میں نے تسلی سے کھانا کھایا اور گھر واپس جانے کے لیے ویگن اسٹاپ پر آ گیا۔

معلوم ہوا کہ کسی وجہ سے ہڑتال ہو گئی ہے۔ چناں چہ اکا دکا گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ میں ویگن کے انتظار میں کھڑا تھا کہ ایک خاتون نے درخواست کی "مجھے اور میری بچی کو سڑک پار کرا دیں۔"

میں جب انھیں سڑک پار کرا رہا تھا تو ملتان

جانے والی ویگن آ گئی۔ کنڈکٹر کے نعرے سے پتا چلا کہ اس میں ایک ہی نشست خالی ہے۔ اچانک ایک صاحب آئے اور لپک کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ میں جتنی دیر میں خاتون اور بچی کو سڑک پار کرا کے واپس پلٹا' ویگن دھواں چھوڑتی ملتان کی طرف رواں دواں ہو چکی تھی۔

مجھے ویگن چھوٹ جانے کا ملال تو ہوا لیکن ایک چھوٹی سی نیکی انجام دینے پر بڑی خوشی بھی ہوئی۔ بہرحال پندرہ منٹ بعد دوسری ویگن آ گئی۔ میں اس میں سوار ہو کر ملتان روانہ ہوا۔ دس بارہ میل سفر کے بعد ڈرائیور نے اچانک گاڑی روک دی۔

دیکھا کہ ہم سے پہلے جانے والی ویگن حادثے کا شکار ہو چکی۔ سامنے والا حصہ بری طرح متاثر ہوا تھا اور جو صاحب میرے بجائے اُس ویگن میں سوار ہوئے تھے' زخموں سے چور بری طرح کراہ رہے تھے۔ ہم نے فوراً ۱۱۲۲ پر اور ہائی وے موٹر پٹرولنگ پولیس کو اطلاع دی۔ انھوں نے جلد پہنچ کر زخمیوں کو اسپتال منتقل کیا۔ پھر گاڑی کو سڑک کنارے لگایا۔

میں اللہ تبارک تعالیٰ کے حضور سربسجود ہو گیا کہ اس نے سڑک پار کرانے کی میری معمولی نیکی کو بھی ضائع نہیں ہونے دیا اور اس کا فوری صلہ مجھے مل گیا۔ مجھے اللہ تبارک تعالیٰ کے اس فرمان کی صداقت پر پختہ یقین ہو گیا کہ قیامت کے روز ہر چھوٹے سے چھوٹے اچھے اور برے عمل کو پیش کیا جائے گا۔ تب جس نے اچھا عمل کیا ہو گا' وہ اس کی جزا پائے گا۔ جس نے برا عمل کیا ہو گا، وہ سزا پائے گا۔ نیز مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ...... ہر زمانہ نیکی کا زمانہ ہے، اسے ہرگز برا نہیں کہنا چاہیے۔

◆◆◆

کامیابی

☆ کامیاب وہ ہیں جن کے پاس ایمان کی دولت ہے۔ (القرآن)

☆ تجربے کو یاد رکھنا اور اسے موقع پر کام میں لانا کامیابی کی دلیل ہے۔ (حضرت علیؓ)

☆ زندگی میں کامیابی عزم اور ارادے کی بدولت حاصل ہوتی ہے نہ کہ فقط خیالات سے۔ (علامہ اقبالؒ)

☆ میری کامیابی کا راز یہ ہے کہ کسی کام کو کرتے وقت اس کام کے سوا دنیا کی کوئی بات میرے سامنے نہیں رہتی۔ (چارلس کنگ)

☆ میری کامیابی صرف اس بات میں مضمر ہے کہ میں ہر ایک کام کے لیے پندرہ منٹ پہلے ہی تیار ہو جاتا ہوں۔ (نیلسن)

☆ میں تمھیں کامیابی کا گُر نہیں بتا سکتا لیکن ناکامی کا فارمولا یہ ہے کہ ہر ایک کو خوش کرنے کی کوشش کیجیے۔ (ہربرٹ سووپ)

☆ تم جہاں چاہو زمین کھود لو، خزانہ تمھیں ضرور ملے گا، شرط صرف یہ ہے کہ زمین کامیابی کے یقین کے ساتھ کھودو۔ (خلیل جبران)

☆ کامیابی انھی لوگوں کے قدم چومتی ہے جو سب سے زیادہ مستقل مزاج ہوں۔ (نپولین)

☆ کامیابی بے شمار خطرناک غلطیوں میں گھری ہوئی ہے۔ (برنارڈ شا)

☆ اپنے شر سے بچنا عظیم کامیابی ہے۔ (حضرت علیؓ)

(مراسلہ: اصدق امین، واہ کینٹ)

اربوں انسانوں کی جان و مال خطرے میں

موسم جب ظالم بن جائیں

عالمی سطح پر جنم لینے والی آب و ہوائی تبدیلیاں محض اس صدی میں کرۂ ارض کے کئی علاقوں کی حیات زیر و زبر کر سکتی ہیں...... ایک چشم کشا رپورٹ

عاصم محمود

سائنس و ٹیکنالوجی

چالیس سالہ جیک لین امریکی ریاست، کیلی فورنیا کے شہر سکارامنتو کا رہائشی ہے۔ پچھلے تین برس سے وہ اپنے گھر کا اجاڑ اور ویران صحن دیکھ دیکھ کر تنگ آ چکا۔ وہاں گھاس، پودوں اور پھولوں کا نام و نشان نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ پچھلے تین برس سے ریاست کیلی فورنیا زبردست قحط (Mega Drought) کا نشانہ بنی ہوئی ہے۔

جیک لین نے برآمدے کی ویرانی دور کرنے کا طریقہ یہ نکالا کہ وہاں کیاریوں اور دیواروں پر سبز رنگ کرا لیا۔ سوچتا ہے کہ گھاس اور پودے نہ سہی، سبز رنگ ہی آنکھوں کو طراوت بخش دے۔

پہلے وہ برآمدے میں مصنوعی گھاس (Turf) بچھانا چاہتا تھا۔ پھر اسے یاد آیا کہ گھاس کو خراب ہونے سے بچانے کی خاطر اسے روزانہ پانی دینا ضروری ہے۔ جب کہ کیلی فورنین حکومت نے لان میں پانی دینے پر پابندی لگا رکھی تھی۔ آج ریاست کا جو شہری لان میں پانی دے یا گاڑی دھوئے، اس پر بھاری جرمانہ عائد ہوتا ہے۔

دراصل قحط کے باعث ریاست کیلی فورنیا پانی کی شدید کمی سے دوچار ہے۔ کسان زمین کے نیچے سے پانی نکال کر زرعی ضروریات پوری کر رہے ہیں۔ یاد رہے، کیلی فورنیا میں زراعت ہی اہم ذریعہ روزگار ہے۔ اس شعبے کی مالیت ۴۵ ارب ڈالر (۴۵ کھرب روپے) بتائی جاتی ہے۔ اس عدد کی وسعت کا اندازہ یوں لگائیے کہ پاکستان کا حالیہ قومی بجٹ چار کھرب روپے سے بھی کم مالیت رکھتا ہے۔

قحط سے قبل پاکستانیوں کی طرح امریکی بھی پانی کی قدر و قیمت سے آگاہ نہ تھے۔ گھر، سڑک کنارے یا پارک میں نل کھلا ہے اور پانی ضائع ہو رہا ہے، تو کسی کو پروا نہ ہوتی۔ اب کیلی فورنین حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ پانی فروخت کیا جائے، یوں شہریوں کو احساس ہوگا کہ یہ مائع بڑا بیش قیمت ہے۔ چناں چہ وہ گھروں میں "پانی میٹر" نصب کر رہی ہے۔ یہ منصوبہ اگلے چند برس میں مکمل ہو جائے گا۔ پانی خریدنے پر یقیناً امریکی اسے سوچ سمجھ کر استعمال کریں گے۔

دورِ جدید کا مظہر

کیلی فورنیا کا قحط آب و ہوائی (Climatic) تبدیلیوں سے جنم لینے والا محض ایک مظہر ہے۔ ورنہ عالمی سطح پر انجام پانے والی ان تبدیلیوں نے سیلابوں، قحط اور سمندری و ارضی طوفانوں کے ذریعے دنیا میں تہلکہ مچا رکھا ہے۔ پاکستان میں ۲۰۱۰ء اور ۲۰۱۴ء کے دوران آنے والے تباہ کن سیلاب بھی اسی عالمی اُعجوبے سے تعلق رکھتے ہیں۔

طرفہ تماشا یہ ہے کہ دنیا والے اب تک آب و ہوائی تبدیلیوں کو سنجیدگی سے نہیں لے رہے تھے۔ حتیٰ کہ بعض سائنس دانوں کا دعویٰ تھا کہ درج بالا تبدیلیاں انجام نہیں پا رہیں۔ لیکن اسی سال تبدیلیوں سے متعلق جو اعداد و شمار سامنے آئے، انھوں نے کروڑوں انسانوں کی آنکھیں کھول دیں۔ اب دنیا بھر میں یہ احساس پھیل رہا ہے کہ آب و ہوائی تبدیلیوں کا زور نہ ٹوٹا، تو مستقبل قریب میں نہ صرف کرۂ ارض کی صورت شکل بدلے گی، بلکہ کئی علاقوں میں زندگی گزارنا کٹھن مرحلہ بن جائے گا۔

اعداد و شمار کی رو سے ۲۰۰۹ء تا حال سیلابوں، قحط اور طوفانوں کے باعث دنیا والے "۴۹۸ کھرب ڈالر" کا نقصان برداشت کر چکے۔ ان قدرتی آفتوں نے براہ راست ۶۵ کروڑ انسانوں کو متاثر کیا۔ فصلیں تباہ کر دیں، گھر مسمار کر دیے اور کاروبار ختم کر ڈالے۔ یوں غربت اور بے روزگاری میں اضافہ ہو گیا۔

تبدیلیوں کی سائنس

ہمارے کرۂ ارض کی فضا (Atmosphere) مختلف گیسوں سے بنی ہے۔ سورج کی شعاعیں فضا سے گزرتے ہوئے زمین پر پہنچتیں اور اسے گرم کرتی ہیں۔ تب زمین پر جنم لینے والی حدت اوپر اٹھتی اور خلا (Space) میں جانے کی سعی کرتی ہے۔ ایسے میں فضائی گیسیں کچھ حدت جذب کرتی اور واپس زمین کی سمت بھیج دیتی ہیں۔

درج بالا عمل کے باعث ہی ہماری زمین کا درجہ حرارت معمول پر رہتا ہے۔ یہ عمل اصطلاحاً "سبز مکانی اثر" (Green House Effect) کہلاتا ہے۔ جب کہ فضائی گیسوں کو "سبز مکانی گیس" (Green House Gases) کہا جاتا ہے۔ ان گیسوں میں آبی قطرے، کاربن ڈائی آکسائیڈ، میتھین، نائٹرس آکسائیڈ اور اوزون شامل ہیں۔

اسی سبز مکانی اثر نے کرۂ ارض میں ایسی غیر معمولی فضا کو جنم دیا کہ اس میں زندگی پنپ سکے۔ یوں کرۂ ارض میں رنگ برنگ جانوروں کی لاکھوں اقسام اور آخر کار حضرتِ انسان نے جنم لیا۔ لیکن ۱۷۵۰ء کے بعد جب یورپ میں صنعتی انقلاب شروع ہوا، تو انسان بے سوچے سمجھے اپنی قبر خود کھودنے لگا۔

ہوا یہ کہ انسانی سرگرمیوں کی وجہ سے رفتہ رفتہ رکازی ایندھنوں (کوئلہ، تیل، گیس) کا استعمال بڑھ

گیا۔ یہ ایندھن ایک اہم سبز مکانی گیس، کاربن ڈائی آکسائیڈ خارج کرتے ہیں۔ یہ گیس آتش فشاں پہاڑوں کے پھٹنے، درخت کاٹنے اور جانداروں کے عملِ تنفس سے بھی خارج ہو کر فضا میں شامل ہوتی ہے۔ اسی لیے ماضی میں فضا میں کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس کی مقدار گھٹتی بڑھتی رہی ہے۔ لیکن زندگی کی نمو سے ۱۷۵۰ء تک فضا میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کی مقدار ۳۵۰ پی پی ایم (PPM) سے کم ہی رہی۔

پی پی ایم سے مراد ہے، فضا میں سبز مکانی گیسوں کے ہر دس لاکھ سالمے (Molecules)! گویا درج بالا جملے کا مطلب ہے کہ فضا میں گیسوں کے ہر دس لاکھ سالموں میں سی او ٹو (کاربن ڈائی آکسائیڈ) کے سالمے تعداد میں ۳۵۰ سے کم ہی رہے۔ لیکن جوں ہی انسان رکازی ایندھن بڑی تعداد میں استعمال کرنے لگا، تو فضا میں سی او ٹو گیس کی مقدار بڑھنے لگی۔ یوں فضا میں صدیوں سے چلا آرہا سبز مکانی گیسوں کا توازن بگڑ گیا۔

تباہ کن سیلاب بھی عالمی گرماؤ کا ایک مظہر ہیں۔

فضا کی گیسوں میں آبی قطرے سب سے زیادہ ہیں۔ لیکن سی او ٹو سمیت دیگر گیسیں حدت زیادہ مقدار میں جذب کرتی ہیں۔ اسی عمل نے قدرتاً زمین کا درجہ حرارت بڑھا دیا جس سے کرۂ ارض میں حدت زیادہ پہنچنے لگی۔ بین الاقوامی سطح پر گرمائش بڑھنے کے انسان ساختہ اُعجوبے کو "عالمی گرماؤ" (Global Warming) کہا گیا۔ یہی عالمی گرماؤ زمین کی آب و ہوا اور موسموں (Weathers) میں وسیع پیمانے پر تبدیلیاں لا رہا ہے۔

اس وقت پوری دنیا میں کوئلے سے بجلی بن رہی ہے۔ تیل اور گیس سے کروڑوں گاڑیاں چلتی ہیں۔ کارخانوں میں بھی وسیع پیمانے پر رکازی ایندھن استعمال ہوتے ہیں۔ چناں چہ تازہ رپورٹ کی رو سے دنیا والے "۴۰ ارب ٹن" سی او ٹو گیس ہر سال فضا میں جھونک رہے ہیں۔ چینی، امریکی، بھارتی، روسی، جاپانی، جرمن، شمالی کورین، کینیڈین، برطانوی اور میکسیکن وہ دس بڑی اقوام ہیں جو سب سے زیادہ درج بالا گیس پیدا کرتی ہیں۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ ۱۹۸۸ء میں فضا میں سی او ٹو ۳۵۰ پی پی ایم سے زیادہ ہو چکی۔ تب سے فضا میں اس گیس کی مقدار مسلسل بڑھ رہی ہے۔ سال رواں میں وہ ۴۰۰ پی پی ایم کا ہندسہ چھو چکی۔ چونکہ فضا میں مسلسل سبز مکانی گیسوں کی تعداد بڑھ رہی ہے لہٰذا درجہ حرارت میں بھی اضافہ جاری ہے۔

ایک جدید تحقیق کی رو سے کہ ۲۱۰۰ء میں اقوام عالم "۹۸ ارب ٹن" سی او ٹو گیس خارج کر رہی ہوں گی اور تب تک کرۂ ارض کا عالمی درجہ حرارت ۴ء۲ درجے سینٹی گریڈ تک بڑھ جائے گا۔ یاد رہے، عالمی درجہ حرارت میں معمولی سی کمی بیشی بھی بین الاقوامی آب و ہوا پر اثر انداز ہوتی ہے۔ یہاں تو وسیع پیمانے پر درجہ حرارت بدل رہا ہے۔

جنم لیتی خطرناک تبدیلیاں

عالمی درجہ حرارت بڑھنے سے دنیا میں کئی اقسام کی تبدیلیاں آ رہی ہیں۔ ان میں آب و ہوائی تبدیلیاں سرفہرست ہیں۔ مثلاً پاکستان سمیت دنیا کے کئی علاقوں میں موسم گرما کی طوالت بڑھ چکی۔ نیز عموماً اس موسم میں شدید گرمی پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر پچھلے سال آسٹریلیا کے کئی شہروں میں اتنی شدید گرمی پڑی کہ سبھی ریکارڈ ٹوٹ گئے۔

اسی طرح موسم سرما میں بھی اب شدید سردی پڑنے لگی ہے۔ مثلاً اس سال امریکا، کینیڈا، برطانیہ اور دیگر مغربی ممالک شدید ٹھنڈ کی لپیٹ میں رہے۔ موسموں کی تبدیلی نے فصلوں کے نظام ہوائی کو بھی متاثر کیا۔ پاکستان میں خریف کی فصلوں کو ماضی کی نسبت ایک ماہ بعد بویا جانے لگا ہے۔ وجہ یہ کہ اب مون سون ستمبر تک چلتا ہے۔

ایک اہم تبدیلی یہ ہے کہ پہاڑوں پر جمی برف پگھلنے لگی ہے۔ چناں چہ موسم گرما میں تیزی سے پگھلتی برف اور بارشیں مل کر سیلاب لے آتی ہیں۔ یہی اُعجوبہ پاکستان میں ۲۰۱۰ء میں پوری طاقت سے جلوہ گر ہوا۔ ہمالیہ، ہندوکش اور قراقرم میں صدیوں سے جمے گلیشیئر بڑھتی گرمی کے باعث پگھل رہے ہیں۔ یہی عمل گرین لینڈ، قطب شمالی اور قطب جنوبی میں بھی کارفرما ہے۔

گلیشیئر پگھلنے کی وجہ سے قدرتاً سمندروں کی سطح بڑھ رہی ہے۔ چناں چہ کئی جزائر صفحۂ ہستی سے مٹ جائیں گے۔ ان میں مالدیپ اور بحرالکاہل کے بہت سے مشہور جزیرے شامل ہیں۔ نیز ساحلی شہروں مثلاً لاس اینجلس، کراچی، ڈھاکہ، ممبئی وغیرہ کا بیشتر حصہ بھی سمندر کی نذر ہو جائے گا۔

غذاؤں کی قیمتیں بڑھنا بھی ایک اہم آب و ہوائی تبدیلی ہے۔ قحط، سیلاب اور طوفان وسیع پیمانے پر کھیت، کھلیان اور باغ تباہ کر ڈالتے ہیں۔ چناں چہ لامحالہ قیمتیں بڑھ جاتی ہیں۔ کیونکہ پیداوار کم ہو جاتی، مگر کھانے والے اتنے ہی رہتے بلکہ ہر سال بڑھ جاتے ہیں۔

کروڑوں برس کی تبدیلیوں کے بعد زمین اس قابل ہوئی کہ یہاں زندگی نشوونما پا سکے۔ لیکن انسان بے دریغ رکازی ایندھن استعمال کر کے زمین میں زندگی کا پنپنا مشکل بنا رہا ہے۔ اسی کی وجہ سے ہمارے پڑوسی حیوانیات اور نباتات کی جانوں کو بھی لالے پڑ چکے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ آب و ہوائی تبدیلیوں کے باعث ہر سال جانوروں اور پودوں کی سیکڑوں اقسام مٹ رہی ہیں۔ جب کہ ہزارہا قسمیں ناپید ہونے کے خطرے سے دوچار ہیں۔

انسانی صحت کو لاحق خطرات

آب و ہوائی تبدیلیاں انسانی صحت پر بھی اثر انداز ہو رہی ہیں۔ شہروں میں رہنے والے گاڑیوں کے دھوئیں سے دمے اور سانس کی بیماریوں کا نشانہ بنتے ہیں۔ موسم گرما میں شدید تپش اور موسم سرما میں زبردست سردی انسانوں کی جانیں لینے لگی ہے۔

دنیا کے کئی علاقوں میں بارشوں کا دورانیہ بڑھنے کی وجہ سے چھوتی (Infections) بیماریاں بڑھ رہی ہیں۔ نیز پانی سے متعلق امراض (Water Borne Diseases) بھی روز افزوں ہیں۔

قحط، سیلاب اور سمندری طوفان انسانوں کی ذہنی صحت پر بھی منفی اثرات ڈالتے ہیں۔ ظاہر ہے، جب قدرتی آفت انسان کی جمع پونجی اور مال و متاع ختم کر ڈالے، تو وہ شدید پریشانی کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ پریشانی منفی رخ اختیار کر لے، تو انسان مجرم بننے میں دیر نہیں لگاتا۔

قاتلوں کے نام و پتے

صدمے اور افسوس کی بات یہ ہے کہ آب و ہوائی تبدیلیاں، بڑھتا درجہ حرارت اور فضائی آلودگی روکنے کے لیے ترقی یافتہ ممالک کی حکومتیں خاطر خواہ اقدامات نہیں کر رہیں۔ حالانکہ یہی ممالک سب سے زیادہ سبز مکانی گیسیں خارج کرتے ہیں۔ جب کہ ان کی ہوس کے باعث چھوٹے اور غریب ملکوں کی بقا کو سنگین خطرات لاحق ہو چکے۔

قطب شمالی میں پگھلتی برف برفانی ریچھوں کو نابود کرسکتی ہے

حالیہ ماہ ستمبر میں اقوام متحدہ میں آب و ہوائی کانفرنس (Climnate Summit) منعقد ہوئی۔

اس موقع پر یہ انکشاف سامنے آیا کہ آب و ہوائی تبدیلیوں کی تباہ کاری سے نمٹنے کے لیے اب عالمی ممالک کو سالانہ ۱۰۰ ارب ڈالر (۱۰۰ کھرب روپے) خرچ کرنا ہوں گے۔ اگر ایسا نہ ہوا، تو پھر ہر سال اخراجات بڑھتے چلے جائیں گے۔

بہرحال میں، آپ، ہم سب انفرادی سطح پر ایسے اقدامات کر سکتے ہیں کہ آب و ہوائی تبدیلیوں کے منفی اثرات کم ہو جائیں۔ مثال کے طور پر جہاں تک بن پڑے، سفر کے واسطے بس یا ریل استعمال کیجیے۔ کیونکہ یہ ذرائع کم ایندھن خرچ کر کے زیادہ لوگوں کو منزل تک پہنچاتے ہیں۔

اسی طرح کوشش کیجیے کہ قریبی علاقوں میں آنے جانے کی خاطر سائیکل سے مدد لیں یا پیدل چلیے…… یہ ذرائع آمد و رفت ظاہر ہے، کوئی سبز مکانی گیس یا آلودگی پیدا نہیں کرتے۔ اگر مجبوراً کار یا موٹر سائیکل استعمال کرنا ہے، تو سعی کیجیے کہ اسے آہستہ چلایئے۔ بجلی کم سے کم استعمال کر کے بھی ہم کرۂ ارض پر صاف ستھرا ماحول پیدا کرنے میں اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اسی طرح گھر میں کوڑا کم پیدا کیجیے کہ یہ بھی آلودگی بڑھاتا ہے۔

یاد رکھیے، اگر آج کے انسان نے آب و ہوائی تبدیلیوں کو روکنے کے ٹھوس اقدامات نہ کیے، تو ہم آنے والی نسلوں کے مجرم بن جائیں گے۔ شاید مشہور امریکی شاعر، لوک گلوکار اور داستان گو، اتہا فلپس (۱۹۳۵ء ۔ ۲۰۰۸ء) کا درج ذیل قول آپ کے قلب و ضمیر کو جھنجھوڑ ڈالے:

"زمین مر نہیں رہی بلکہ اسے قتل کیا جا رہا ہے۔ اور قاتلوں کے نام ہیں اور پتے بھی!"

◆●●

معاشرے کے معصوم بچوں کا چبھتا سوال

آپ قاتل تو نہیں؟

ایک غیر معمولی بچے کی دلگیر کتھا' بدنصیب والدین اس کے دل میں چھپی محبت کا کھوج نہ لگا سکے

حمزہ کامران

مجھے زندگی آج سے پہلے اتنی بے معنی کبھی محسوس نہ ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے خاموشی نے زندگی کی ہر ہلچل کو جذب کر لیا ہو۔ جیسے بولتے لب آواز نکالنے سے قاصر ہو گئے ہوں۔ دنیا کی ہر بدصورتی مجھ پہ قہقہے لگا رہی تھی۔ گھٹن بڑھتی چلی گئی۔ اندھیرے ہر چیز کو نگلنے لگے، اور میں نیم بے ہوش سا ہو کر گرنے لگا۔ تب مجھے احساس ہوا، کوئی چیز میرے لبوں کا قفل توڑ کر نکل گئی.....شاید وہ چیخ تھی۔

......☆......

"فیضان! تمھیں پیار کی زبان سمجھ نہیں آتی؟ لاتوں کے بھوت کبھی باتوں سے نہیں مانتے۔" ابا نے جملہ مکمل کرتے ہی اپنے بڑے بیٹے کے منہ پر زناٹے دار تھپڑ جڑ دیا۔

"ابا......مع مع......معاف کر......دو، آئندہ......میں......کبھی......آپ کے......دوستوں کے سامنے......نہیں آؤں گا۔" فیضان باقاعدہ ابا کے پیروں پر پڑ گیا۔ مگر ان پر تو جیسے جن سوار تھا۔ وہ مارتے گئے اور فیضان دہائیاں دیتا رہا، یہاں تک کہ بے خود ہو کر صوفے پہ سر تھامے بیٹھ گئے۔ بیٹا ان کے قدموں میں پڑا سسکتا رہا۔

میں اور اماں دہلیز پر کھڑے بے آواز رو رہے تھے مگر ابا کے سامنے کسی کو کچھ بولنے کی ہمت نہ ہوئی۔ فیضان کا جسم دھنائی سے بری طرح سوج چکا تھا لیکن ٹیسیں ہمارے دل میں اٹھ رہی تھیں۔ ابا کو اپنی بے عزتی کا احساس بار بار بے چین کر رہا تھا۔

......☆......

برادری کے سب لوگ جمع ہونے لگے۔ ایک کے بعد دوسری گاڑی آ کر رکتی۔ کلف لگے کپڑوں میں ملبوس حضرات ہاتھ میں موبائل تھامے، گاڑیوں میں سے برآمد ہوتے اور ابا کے پاس آ کر تعزیت کرتے۔ خواتین نے مردوں کو اس میدان میں بھی پیچھے چھوڑ دیا۔ وہ دھاڑیں مار مار کر روتی ہوئی نظر آئیں۔ چند لوگ میرے پاس بھی آئے۔ ان کے ہونٹ ہلتے محسوس ہوئے مگر حیران کن طور پر کوئی آواز میری سماعت سے نہیں ٹکرائی۔ مجھے تو بس ایک ہی آواز آئی: "میت اٹھاؤ، نماز جنازہ کا وقت ہو گیا۔"

......☆......

میرے والد اور والدہ نے سب سے پہلے بیٹے فیضان کی پیدائش پر بہت خوشیاں منائی تھیں۔ لیکن کچھ عرصہ بعد انھیں احساس ہوا کہ ان کی خوشیوں کا چاند تو گرہن لگا ہے۔ فیضان عام بچوں سے مختلف تھا۔

دماغی کمزوری کی وجہ سے وہ نہ صرف ہکلاتا بلکہ اس کی ذہنی نشوونما بھی محدود تھی۔ اسی باعث وہ اپنے ہم عصروں میں پیچھے رہ گیا۔ بچپن تک تو سکون رہا مگر جیسے جیسے فیضان پروان چڑھا، ابو پر زندگی جیسے تنگ ہونے لگی۔ انھیں اپنی "ناک" بہت عزیز تھی۔ جب بھی معاشرہ فیضان پر پھبتی کستا، انھیں اپنی پگڑی اچھلتی محسوس ہوتی۔

میں نے شعور کی آنکھ کھولی، تو فیضان کو اباجان کے زیرِعتاب ہی پایا۔ بالآخر ابو کو راہِ فرار سوجھ ہی گئی۔ فیضان کو کسی کے سامنے حتیٰ کہ مہمانوں کے قریب آنے سے بھی منع کر دیا گیا۔ یوں میرا بچپن اپنے بھائی کے گرد کھیلتے گزرا۔ ابا اور اماں جب زندگی کی گاڑی دھکیلنے کے لیے گھر سے دور ہوتے تو فیضان ہی میرا خیال رکھتا۔ وہ اتنی شفیق روح تھی کہ میں ابا اور اماں سے زیادہ اس سے مانوس ہو گیا۔ وقت اڑان بھرتا گیا۔ میں نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا۔ میرا بڑا بھائی ذہنی طور پہ بچہ ہی رہا مگر ہم دونوں کا رشتہ مضبوط تر ہوتا گیا۔ پھر وہ ہوا

جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

ابا کے باس پہلی دفعہ ہمارے گھر عشائیہ پر آئے۔ تب فیضان پیاس سے مجبور ہو کر پانی پینے کمرے سے نکل آیا۔ باس نے جب ایک جوان لڑکے کو فیڈر میں پانی پیتے دیکھا تو ان کی ایسی ہنسی چھوٹی کہ ہنستے ہنستے آنکھوں سے پانی جاری ہو گیا۔ ابا کے تو تن بدن میں آگ لگ گئی۔ باس کے جانے کی دیر تھی کہ ابا اسے گریبان سے پکڑ کر پیٹنے لگے۔ میں اور اماں خون کے آنسو رو رہے تھے مگر چپ سادھے رہے۔ اسی کمرے کی قید میں زخمی فیضان جہانِ فانی سے کوچ کر گیا۔

☆

صفیں بن رہی تھیں۔ فیضان کے زخموں سے داغدار جسم کو بے داغ سفید کفن نے چھپا لیا۔ لیکن میری آنکھوں کے سامنے دنیا گھوم رہی تھی۔ وہ جو مجھے سب سے زیادہ عزیز تھا، اپنا بے جان لاشہ چھوڑ کر چلا گیا۔

نماز جنازہ پڑھائی جانے والی تھی کہ میرے منہ سے لرزہ خیز چیخ نکل گئی۔ میں جیسے بیدار ہو گیا اور دوڑ کر فیضان کی لاش سے لپٹ کر رونے لگا۔ ابا مجھے سنبھالنے آئے تو میں بھڑک گیا:

"ڈاکٹر جھوٹ بولتا ہے کہ فیضان دماغ کی نس پھٹنے سے مرا۔ اسے میں نے مارا'، اسے آپ نے مارا، اسے ادھر کھڑے ایک ایک شخص نے مارا ہے۔ آخر اس معاشرے کو کس نے اجازت دی کہ وہ فیضان کی زندگی اس پر تنگ کر دے؟ اس کی ذہنی کمزوری کا مذاق اڑانے والے یہ کیوں بھول گئے کہ وہ کسی کو صحت مند ذہن عطا نہیں کر سکتے۔ جب ایک مالک نے ہی سب کو تخلیق کیا تو کوئی اس بنیاد پر کمتر یا برتر کیسے ہو سکتا ہے؟ اگر صحت مند ذہن والے بیمار ذہنیت کے مالک ہیں تو سزا تو انھیں ملنی چاہیے۔ میرے بھائی کو کیوں بیس سال یہ سزا جھیلنا پڑی؟

"اور ابا جان! آپ کیوں اپنے بیٹے کے لیے معاشرے کی اور اپنی بیمار ذہنیت سے نہیں لڑے؟ مولوی صاحب، آپ کیوں لوگوں کو سمجھانا بھول گئے کہ مالک اپنے حقوق سے غفلت پر تو معاف فرما سکتا ہے مگر حقوق العباد کی غفلت پر معافی نہیں دے گا۔ فیضان کو آپ سب نے قتل کیا، میں نے قتل کیا کہ میں بھی اُسے ظلم سے نہ بچا سکا۔ آج ذہنی طور پر کمزور انسان مر کر بظاہر ایک صحت مند معاشرے کی اصلیت عیاں کر گیا!......

یہ کہتے کہتے میں بے ہوش ہو گیا، شاید اس بیمار معاشرے سے فرار یا فیضان سے خوابوں کی دنیا میں ملنے کے لیے! اب میں آپ سے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کہیں آپ بھی تو کسی فیضان کو قتل نہیں کر رہے؟ ◆◆◆

> **قرآن حکیم اور اسوۂ رسول کریم ﷺ**
>
> حضرت علامہ محمد اقبال کے میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں قیام کے زمانے کی بات ہے۔ ایک ملاقاتی آپ کے ہاں تشریف لائے اور دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔
>
> ملاقاتی: آپ نے مذہب' اقتصادیات' سیاسیات' تاریخ اور فلسفہ وغیرہ علوم پر جو کتابیں ابھی تک پڑھی ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ بلند پایہ اور حکیمانہ کتاب آپ کی نظر سے کون سی گزری ہے؟
>
> علامہ: (کرسی سے اُٹھ کر اندر جاتے ہوئے) آپ ذرا ٹھہریے میں ابھی آتا ہوں۔(اندر سے ایک کتاب لاتے ہوئے۔)
>
> یہ قرآن کریم......
>
> (مکالمات اقبال' پروفیسر راشد (علیگ)

نثر شگفتہ

مجھے سیاسی عاشقوں سے بچاؤ

جہاں تہاں سیاست پہ ہونے والی گفتگو کے ڈسے ایک بیزار پاکستانی کی دہائی

افتخار حسین

آج کل ہر طرف سیاست کی ہاہچل بلکہ ہاہاکار مچی ہوئی ہے۔ دھرنے، نعرے، وعدے، ناچ گانے، تقریریں، ایک سے بڑھ کر ایک بیان...... ٹی وی، ریڈیو اور اخبارات کی تو جیسے لاٹری بلکہ چاندی اور سونا نکل آیا۔ مگر سیاست سے دلچسپی نہ رکھنے والے میری طرح بے حد بوریت محسوس کرتے ہیں۔ آپ سوچیں گے کہ بھلا یہ بھی کوئی بوریت کے دن ہیں؟ حکومت مخالف مظاہرے ہوں یا اپوزیشن کی نازک پوزیشن، حکومت کے کھوکھلے دعوے ہوں یا مظاہرین کے جذباتی نعرے، ہر ایک چینل "سب سے پہلے" خبر نشر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ تب جیسے یہ کہنے کی سعی ہوتی ہے: "پہلے آیئے اور پہلے پایئے۔" اب ایسے میں بھلا کوئی بور کیوں ہوتا؟

لیکن قارئین! یہی ماحول ہماری بوریت کا سبب بن گیا۔ ہمیں سیاست سے ایسی ہی دلچسپی ہے جیسے سرکاری ملازمین کو کام کرنے یا پھر آج کی نوجوان نسل کو پڑھائی سے۔

ہم تو ٹی وی دیکھنا ہی چھوڑ چکے' کوئی سیاست کی بات بھی کرے' تو ہمارے سر میں درد ہونے لگتا ہے۔ صبح تازہ دم وقت پر دفتر جاتے ہیں۔ وہاں پہلے سے بیٹھے ہمارے ہم دفتر گرما گرم بحث میں مصروف ہوتے ہیں۔ سب کو سلام کرنے کے بعد پیراسیٹا مول کی گولی جیب سے نکالتے اور ایک گلاس پانی سے نگل لیتے ہیں۔ پھر بہت کوشش کرتے ہیں کہ بحث کا رخ کسی طرح سیاست سے ہٹ جائے۔ مگر وہ گھوم پھر کے سیاست پہ ہی آجاتی ہے۔

اب آپ کو کیا بتائیں کہ ہمارا دن دفتر میں کتنی مشکل سے گزرتا ہے۔ کام کرنے کو جی چاہتا ہے اور نہ آرام ملتا ہے۔ کام تو خیر ہم پہلے بھی واجبی ہی کرتے تھے، البتہ ایسے اعصاب شکن ماحول میں کوئی آرام کیسے کر سکتا ہے؟

گھر پہنچے' تو شام کو کسی نہ کسی دوست کے ہاں جا دھمکتے یا کسی دوست کو اپنے ہاں آن دھمکنے کی دعوت دیتے۔ غضب خدا کا، ہر دو صورتوں میں ہمیں سیاسی گفتگو ہی سننے کو ملتی۔ پرسوں ہم

نے اپنے ایک قریبی دوست کو بلایا کہ آؤ گپ شپ کرتے ہیں۔ اس نے آتے ہی حکومت مخالف مظاہروں کی حمایت شروع کر دی۔ ہم نے بھی اسے چائے پلائے بغیر بھیجا۔

کل تو بہت غصہ آیا۔ ایک دوست سے ملنے گئے۔ اس نے ہمیں بٹھایا' اپنے بچے کو چائے لانے بھیجا اور پھر اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں۔ ہم بہت خوش تھے کہ چلو سیاسی باتوں کی نوبت نہیں آئے گی۔ مگر یہ کیا! ہمارے دوست نے ٹی وی چلایا اور دیکھنے سے پہلے ہی حکومت کے حق میں دھواں دھار تقریر کرنے لگا۔

بوریت کے آثار ہمارے چہرے سے عیاں ہونے لگے۔ ہم اجازت لینے ہی والے تھے کہ چائے آ گئی۔ محض چائے ہوتی تو شاید ہم بھاگ کھڑے ہوتے۔ مگر گرم گرم پکوڑوں کی خوشبو نے جیسے قدم ہی جکڑ لیے۔ بہت کہا کہ ہمیں جانے دو، ہم سیاست کی باتیں نہیں سن سکتے۔ مگر پکوڑوں کی خوشبو تھی کہ ہمیں ایک قدم آگے نہ جانے دیا۔

ہم چائے پینے لگے اور پکوڑوں کے ساتھ خوب انصاف کیا۔ دوست کیا کہہ رہا تھا، کچھ پتا نہ چلا۔ چائے ختم کی، پلیٹ میں سے آخری پکوڑا اٹھایا اور دوست سے یہ کہتے ہوئے اجازت چاہی کہ گھر میں آٹا ختم ہے۔ میں تو وہ لینے جا رہا تھا کہ راستے میں تمہارے پاس رک گیا۔ (حالانکہ آٹا تو ہم گندم کا پسواتے ہیں بس وہاں سے بھاگنے کا بہانہ چاہیے تھا)

قارئین کرام! اب ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ کسی ہوٹل کا رخ نہیں کریں گے کیونکہ وہ ان دنوں سیاسی گفتگو کے اڈے بن چکے۔ دفتر جائیں گے اور

بالغی مرید

ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی
گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن
شہری ہو دیہاتی ہو مسلمان ہے سادہ
مانند بتاں پجتے ہیں کعبے کے برہمن
نذرانہ نہیں سُود ہے پیرانِ حرم کا
ہر خرقۂ سالوس کے اندر ہے مہاجن
میراث میں آئی ہے انھیں مسندِ ارشاد
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن!

ہارون کی آخری نصیحت

ہاروں نے کہا وقتِ رحیل اپنے پسر سے
جائے گا کبھی تو بھی اسی راہ گزر سے
پوشیدہ ہے کافر کی نظر سے ملک الموت
لیکن نہیں پوشیدہ مسلماں کی نظر سے
(کلیات اقبال)

حاضری لگا کر واپس، مبادا سیاسیوں یعنی سیاست کے عاشقوں سے سیاسی گفتگو سننی پڑ جائے۔ ویسے بھی ہمارے باس چار مہینوں کے لیے بیرون ملک گئے ہوئے ہیں۔ اُن کی عدم موجودگی کا کچھ تو فائدہ اٹھانا چاہیے۔

آخر میں ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ وطن عزیز میں سب کچھ ٹھیک کر دے۔ مظاہروں، لانگ مارچوں اور کھوکھلے نعروں سے قوم کی جان چھوٹ جائے جنھوں نے اس ملک کو اندر سے کھوکھلا کر دیا ہے۔ ◆◆◆

تازہ کہانی

دھرنا

نئے پاکستان کا انوکھا راستہ

ملکی حالات کی طرح دادا دادی کے مسائل کا حل بھی کسی نادیدہ قوت کے ہاتھوں میں چلا گیا...... قومی امور کی ایک شوخ و شنگ قلمی تصویر

صالحہ محبوب

"اسد بیٹا! سائنس نے اس قدر ترقی کیسے کر لی کہ ایک ہی کمرے میں سونے والے دو انسانوں میں سے ایک کو سردی لگتی ہے اور دوسرا گرمی اور پسینے کی شکایت کرتا ہے؟ یہ ترقی سائنس کی ہے یا دماغ کا فتور؟" رشید صاحب نے صبح صبح ناشتا کرتے ہوئے خاصی سنجیدگی سے یہ سوال بیٹے سے کیا۔

یہ سن کر رئیسہ بیگم کا ہاتھ چائے ڈالتے ڈالتے رک سا گیا۔ وہ اپنے تاثرات ہرگز نہ چھپا سکیں' بولیں "یہ سراسر دماغ کا فتور ہے۔ غضب خدا کا اس شدید گرمی میں بجلی کے بل کے خیال سے تمہارے ابا کو سردی لگتی ہے۔ میں

اے سی چلاتی ہوں تو وہ سردی سردی کہتے اُسے بند کر دیتے ہیں۔ کمرا بند' کھڑکیاں بند' پنکھا بند اور اے سی بھی۔ پھر مجھے کہتے ہیں کہ اتنے ٹھنڈے کمرے میں بھی تمھیں گرمی لگ رہی ہے؟ ان کا منصوبہ یہی ہے کہ بڑھیا شاید خود نہ مرے تو میں خود ہی گرمی اور حبس سے اسے مار دوں۔" وہ خاصے غصے میں تھیں۔

ایک ہی کمرا' ایک ہی عمر کے دو افراد اور دونوں کا جسمانی درجہ حرارت اتنا مختلف! بھلا بتاؤ کیسے ممکن ہے؟ دراصل تمہاری امی کے مزاج کی گرمی اب ان کے جسم میں داخل ہو چکی۔ اسی لیے انھیں ساری رات گرمی لگتی ہے۔ ہمیں دیکھو' سکون سے ٹھنڈے ٹھنڈے سوتے ہیں۔" رشید صاحب بیگم کے غصے سے قطعی بے نیاز پھر شروع ہو گئے۔

"ایک تو ساری رات بجلی آتی ہی کم ہے۔ اوپر سے بتی آتے ہی تمہارے ابا کو سردی لگنے لگتی ہے۔ آدھا گھنٹا اے سی چلے تو تھر تھر کانپنے لگتے ہیں۔ میں شرطیہ کہہ سکتی ہوں کہ یہ کپکپی ٹھنڈ نہیں بجلی کے متوقع بل سے ہوتی ہے۔ اب اس عمر میں نہ بچوں کی فیس ہے نہ شادیوں کی فکر' اپنی پنشن سے صرف بجلی کا بل ہی تو دینا ہے۔ دو ماہ دے لیں مگر میری جان کے دشمن تو نہ بنیں۔" اماں نے ابا جان کو کھری کھری سنائیں۔

"اسد! تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔" رشید صاحب پھر سے بیٹے کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"ابا جان! یوں کیجیے' جسے سردی لگتی ہے' وہ کھیس اوڑھ لے۔ کیونکہ سردی کا علاج تو آسان ہے مگر گرمی کا نہیں۔" بیٹا ماں باپ کی نوک جھونک سے بخوبی واقف تھا' لہٰذا سادہ سا حل پیش کر دیا۔

"نہیں بیٹا! کھیس سے کام نہیں چلے گا' اپنے ابا کو تو اس سڑی گرمی میں لحاف نکال دو۔" رئیسہ بیگم نے لقمہ دیا۔

"اچھا' ایک تو اے سی کا بل دو اور دوسرے لحاف اوڑھو....." رشید صاحب بولے۔

"دیکھا دیکھا' سردی لگنے کی اصل وجہ سامنے آ گئی۔ آپ یوں کریں صحن میں پنکھا لگا' چارپائی ڈال کر سو جایا کریں۔ نہ دل پر بوجھ ہو گا نہ ٹھنڈ لگے گی۔" رئیسہ بیگم نے حل پیش کر دیا۔

"دراصل تم مجھے گھر سے نکالنا چاہتی ہو۔ بڈھا' ریٹائرڈ' ہر وقت تمہارے سامنے جو پڑا ہوں۔" رشید صاحب کا لہجہ یہ کہتے وقت خوب سنجیدہ بلکہ رنجیدہ ہو جایا کرتا۔

"ہر بات کا الٹا مطلب نکالیں گے۔ جو سوچنا ہے سوچیں' بس اس گرمی میں مجھ پر رحم کریں اور ناشتا کرنے دیں۔" رئیسہ بیگم نے بیٹے' بہو اور بچوں کے سامنے جھگڑا بڑھانے سے بہتر جانا کہ ناشتے پر توجہ دی جائے۔

"ابا جان! میں نے آپ کے کمرے میں لگانے کے لیے نیا ٹی وی خریدا ہے۔ آج دیوار میں فٹ ہو جائے گا۔ آپ اپنے ٹھنڈے کمرے میں بیٹھ کر ٹی وی دیکھا کیجیے گا۔" اسد بولا۔

"ارے بیٹا! تمہارے ابا صبح سے شام تک وہی سیاسی ٹاک شو دیکھیں گے اور جیسے سیاستدان ٹی وی میں بیٹھ کر لڑتے ہیں' ویسے ہی مجھ سے لڑیں گے۔ میرے پسندیدہ پروگرام تو مذہبی ہیں یا ڈرامے۔ اب بیک وقت دو طرح کے پروگرام کیسے چل سکتے ہیں؟ ابھی تو صرف اے سی پر لڑائی ہوتی ہے' تم دوسرا جھگڑا ٹی وی کا شروع کرانے لگے ہو۔"

"آپ دونوں کی شادی ہوئے پچاس سال ہو چکے۔ ہم سب بہن بھائی پڑھ لکھ کر اپنے اپنے گھر بار والے ہو گئے مگر آپ دونوں کی یہ نوک جھونک ہنوز جاری ہے۔ کبھی کبھی ایک دوسرے سے صلح صفائی سے بھی بات کر لیا کریں۔" اسد بے حد احترام سے بولا۔

"ساری صلح صفائی کی کوششیں کیا میں کروں؟ چن چن کر میرے پسندیدہ لیڈروں کی برائیاں کرتے ہیں۔ میرا دل جلتا ہے اور یہ خوش ہوتے ہیں۔ ابھی کل تمہاری بیٹی کو اردو شاعری پڑھاتے ہوئے وصال یار کی مثال اپنی اور میری شادی سے دی گئی۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر میری برائیاں تشریح میں لکھوائیں اور تو اور دو تین اشعار بھی میرے خلاف ہی انھیں یاد آئے۔ بتاؤ جھگڑا کون شروع کرتا ہے؟" رئیسہ بیگم بولیں۔

"یہ تو چور کی ڈاڑھی میں تنکا ہوا نا! تشریح میں بھی اپنا ذکر سمجھ رہی تھیں ورنہ حیدر علی آتش نے انھیں نہ کبھی دیکھا نہ سوچا۔" رشید صاحب نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"ابا جان! آپ ہی امی کا خیال کر لیا کریں۔ اب بہو نے ساس کی حمایت کی۔

"یہ کیا خیال کریں گے' جان بوجھ کر ایسی کہانیاں سناتے ہیں جس میں چڑیل بالکل ان کی دادی جیسی ہو۔ ہر اخلاقی سبق میرے لیے ہوتا ہے۔" رئیسہ بیگم جھٹ بولیں۔

☆☆

"یوں کرو ابا جان کے لیے ایک موٹا سا کھیس نکلوا کر ان کے کمرے میں رکھوا دینا۔ ٹی وی والے آئیں تو امی جان اور ابا جان کے مشورے سے لگوا لینا۔" اسد بیوی کو ہدایات دیتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔ رشید صاحب بھی اپنا اخبار لیے باہر چل دیے۔

رشید صاحب ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر تھے۔ متحرک زندگی گزارنے اور بچوں کو اعلیٰ تعلیم سے آراستہ کرنے کے بعد اپنی تمام ذمے داریوں سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ اب تمام دن اخبارات پڑھنا اور ٹی وی دیکھنا ہی ان کا مشغلہ تھا۔ رئیسہ بیگم گھریلو خاتون تھیں۔ اب اپنی تمام ذمہ داریاں بہو کے سپرد کر کر زیادہ وقت عبادت یا ذکر اذکار میں صرف کرتیں۔ ذیابیطس کی مریضہ ہونے کی وجہ سے اب ان کے لیے زیادہ متحرک ہونا ممکن بھی نہ تھا جس سے رشید صاحب خوب چڑتے۔

اگلے روز ان کے کمرے میں ٹی وی بھی لگ گیا۔ رشید صاحب نے اپنی کرسی عین ٹی وی کے سامنے رکھ لی۔ وہ سارا دن ٹی وی دیکھنا چاہتے تھے۔ چند روز رئیسہ بیگم نے برداشت کیا۔ آخر کار دونوں میں خوب جنگ ہوئی۔ اسد باپ کے لیے ہیڈ فونز لے آیا تاکہ اماں کے آرام میں ٹی وی کی آواز خلل نہ ڈالے مگر رشید صاحب کے ہمہ وقت تبصرے بند کرنا کسی کے بس میں نہ تھا۔ رئیسہ بیگم کی فرمائش پر بڑے بیٹے نے ان کے لیے جدید لیپ ٹاپ بھیج دیا تاکہ وہ اس پر اپنی مرضی کے پروگرام دیکھ لیا کریں۔ یوں سائنس کی ترقی نے دونوں بزرگوں کی زندگیوں میں سکون پیدا کر دیا۔ مگر اب کھٹ پٹ کی جگہ سرد مہری لینے لگی۔

☆☆

"اسد بیٹے! آج کل اماں ابا کی بول چال بند ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے ناراض ہیں۔ ایک دوسرے کے کام بھی نہیں کرتے۔ ساتھ بیٹھ کر کھانا تک نہیں کھاتے..... ایک دن بہو نے شوہر کی توجہ ساس سسر کے باہمی سرد رویے کی طرف کروائی۔

"تمہارا وہم ہو گا..... دونوں اپنے اپنے کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ اچھا ہے' جھگڑا تو ختم ہو گیا۔" اسد نے جواب دیا۔

"نہیں بابا! جھگڑا بہت بڑھ گیا ہے۔ دادا جان اب

دادی کی دوائیں بھی نہیں لا کر دیتے۔ دادی ان کے کپڑے الماری میں نہیں رکھتیں۔" یہ عائزہ تھی‘ دادا دادی کی ناراضی سے خوب واقف۔

"بابا پتا ہے کل کیا ہوا جب ہم پھپھو کے ہاں دعوت پہ گئے تھے تو دادا نے کھانا کیوں نہیں کھایا؟ جبکہ پھپھو نے ان کے پسندیدہ پائے پکائے تھے۔" عائزہ نے جھک کر سرگوشی کے انداز سے بتایا۔

"ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی.....'' اسد نے وہی وجہ بتائی جو ابا جان نے کہی تھی۔

"نہیں بابا! اصل میں دادی جان ان کے دانت ساتھ نہیں لے کر گئی تھیں۔ دادا جان کو ہمیشہ وہی یاد دلاتی تھیں کہ دعوت میں جاتے وقت دانت لگا لیں یا ساتھ رکھ لیتی تھیں۔ مگر ناراضی کی وجہ سے دونوں کام نہ ہو سکے۔ اس لیے دادا جان بھوکے رہے اور کسی کو بتایا بھی نہیں۔"

اسد اپنی بیٹی کی بات سن کر مسکرایا مگر ساتھ ساتھ اُسے یہ فکر ستانے لگی کہ اگر ناراضی بڑھی تو معاملہ خراب نہ ہو جائے۔ بڑھاپے اور اس سے وابستہ بیماریاں ناراضی کی متحمل نہیں ہو سکتی تھیں۔

"بیٹا! دادا جان اور دادی کی دوستی کیسے کرائی جائے؟" اسد نے بیگم اور بچوں کی رائے لی۔

"بابا! دونوں کو ایک دوسرے کی طرف سے تحفے دے کر۔" بچوں نے تجویز دی۔

"نہیں بیٹا! دونوں سمجھ جائیں گے کہ یہ تحفے آپ لوگوں نے دیے ہیں۔" اسد نے تجویز رد کر دی۔

"دونوں کو اکٹھے گھومنے پھرنے بھیج دیتے ہیں۔" اسد کی بیوی نے رائے دی۔

"دونوں ایک کمرے میں ساتھ رہتے ہوئے اس قدر "میٹھی میٹھی" گفتگو کرتے ہیں‘ گھومنے کیا خاک جائیں گے..... ابا جان تو امی کو کہیں چھوڑ چھاڑ کر آ جائیں گے۔ کہیں گے کہ گم ہو گئی۔" اسد جل کر بولا۔

"یوں کریں دونوں کو سعد بھائی کے پاس اسلام آباد بھیج دیتے ہیں۔ ماحول بدلے گا تو تعلقات بہتر ہو جائیں گے۔"

اسد کو یہ مشورہ کچھ بہتر لگا۔ بولا "اچھا میں سعد بھائی سے بات کرتا ہوں کہ امی ابا کو کچھ دن اسلام آباد بلا کر خوب گھمائیں۔ یوں یقیناً حالات بہتر ہو جائیں گے۔" اسد کچھ پُر امید ہوا۔

"بابا! جب دادا دادی اکیلے ہوں‘ تو صرف سیاست پہ بات کرتے ہیں۔ دادی کو نواز شریف اچھا لگتا ہے اور دادا جان کو زرداری۔ بلکہ کبھی کبھی دادی کو چڑانے کے لیے وہ عمران خان کی بھی تعریفیں کرتے ہیں۔ پھر دونوں کی ایسی لڑائی ہوتی ہے کہ نہ پوچھیں۔ موجودہ بات چیت کی بندش بھی یقیناً کسی بحث کا نتیجہ ہے۔" عائزہ نے جو دونوں کی لاڈلی پوتی تھی‘ دادا دادی کی خفیہ خبر باپ کو پہنچائی۔

"بہرحال اسلام آباد کا موسم یقیناً دونوں کے تعلقات بہتر کر دے گا۔ میں سعد بھائی سے بات کرتا ہوں۔" اسد فون ملانے لگا۔

امی جان اور ابا جان کو منانا اور پھر اسلام آباد بھیجنا خاصا مشکل کام تھا۔ آخر بڑا بیٹا خود گاڑی لے کر آیا اور ماں باپ کو ساتھ لے گیا۔ سعد کی بیوی ملازمت کرتی تھی۔ صبح صبح وہ بھی دفتر چلی جاتی۔ اسد اور سعد‘ دونوں کا خیال تھا کہ تنہائی پاتے ہی اماں ابا اپنے جھگڑے بھول جائیں گے۔

☆☆

"اسد آیئے‘ یہ دیکھیے!"

اسد بیوی کی تیز چیخ پر گھبرا کر دوڑتا ہوا لاؤنج میں آیا۔

''کیا ہوا؟ کیا دھرنے والوں نے ریڈ زون پہ قبضہ کر لیا؟''

موجودہ حالات میں سب کی نگاہیں دھرنے پر لگی تھیں۔ ٹی وی کے سامنے بیٹھی بیوی کی چیخ سن کر پہلا خیال یہی آ سکتا تھا۔

"یہ دیکھیں۔'' بیگم کی انگلی ٹی وی اسکرین پر تھی جہاں دھرنے کے مناظر دکھائے جا رہے تھے۔

"کیا ہوا؟ کیا بم پھٹ گیا؟" اسد کو غصہ آنے لگا۔ ٹی وی پہ معمول کی خبریں جاری تھیں۔

"غور سے دیکھیں‘ سامنے دھرنے کے شرکا میں ابا جان کھڑے جھوم رہے ہیں۔ ہاتھ میں جھنڈا بھی ہے۔"

اسد نے غور کیا‘ مناظر خاصے واضح تھے۔ رشید صاحب پُرجوش انداز میں جھومتے دکھائی دے رہے تھے۔

"اماں کہاں ہیں؟ سعد بھائی کو فون کریں اور پوچھیں دونوں کہاں گئے ہیں؟" اسد کی بیوی حیران ہو کر بول رہی تھی۔

اسی لمحے ٹی وی پہ دوسرے دھرنے کے مناظر دکھائے جانے لگے۔ میوزیکل کنسرٹ کے برعکس دوسری طرف محفل سماع منعقد ہو رہی تھی۔ قوال حضرات نے سماں باندھ رکھا تھا۔ وہیں ایک کرسی پہ جھومتی رئیسہ بیگم بھی نظر آ گئیں۔ وہ بقیہ خواتین کے ساتھ زمین پر نہیں بیٹھ سکتی تھیں‘ سو انھوں نے اپنے لیے کرسی رکھی ہوئی تھی۔

اسد کو بھائی سے پوچھے بنا ہی جواب مل گیا......

دونوں اپنے اپنے لیڈروں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے الہام و تفہیم سے دور ہو چکے تھے۔ اسد ٹی وی دیکھتے ہوئے آئندہ حالات کی پیشین گوئی سے قاصر رہا۔ کیونکہ ملکی حالات کی طرح ان بزرگوں کے معاملات کا حل بھی کسی نادیدہ قوت کے پاس تھا۔

"بابا اب کیا ہو گا؟" عائزہ نے دادا کو اسکرین پر دیکھ کر سوال کیا۔

"دادی سے صلح ہو جائے گی؟"

"پتا نہیں۔'' اسد بڑبڑایا...... ملکی حالات کا اثر ان کے خانگی معاملات پہ پڑ چکا تھا۔ معلوم نہیں یہ اثرات کہاں تک جانے تھے۔ ادھر سب سے بے نیاز بہت سے لوگ جھوم اور گا رہے تھے۔ گانے کی تال پہ نیا پاکستان بن رہا تھا۔

◆◆◆

مشتاق مرتبہ علم دین

راج پال نامی ایک ہندو نے ایک دل آزار کتاب لکھی جس میں رسول کریم ﷺ کی شان میں گستاخی کی گئی تھی۔ اس حرکت سے مسلمان آزردہ اور مشتعل ہو گئے۔ لاہور کے ایک نوجوان علم دین نے اسے قتل کر کے اس کی دریدہ دہنی کی سزا دی۔ جب یہ خبر حضرت علامہ محمد اقبال کو پہنچی تو علامہ نے کہا:

"اسیں گلاں کر دے رہے تے ترکھاناں دا منڈا بازی لے گیا۔"

(ہم باتیں ہی کرتے رہے‘ اور بڑھئی کا بیٹا بازی لے گیا۔)

علم دین نے کھلم کھلا اقرار کیا کہ قتل میں نے ہی کیا ہے لیکن اس کے رشتے دار چاہتے تھے کہ کسی طرح جان بچ جائے اور وہ اقبالی بیان سے منحرف ہو جائے۔ وہ لوگ علامہ کے پاس آئے اور کہا: آپ بڑے نامی گرامی وکیل ہیں۔ آپ علم دین کو بچانے میں ہماری مدد کریں۔

علامہ نے فرمایا: اُس نے بڑا نیک کام کیا ہے اس سے جھوٹ بلوا کر کیوں اس کی نیکی برباد کرتے ہو۔ اگر وہ شہید بھی ہو گیا تو بھی کوئی بات نہیں۔

(نقوشِ اقبال)

چین اور بھارت کی سرحدی جھڑپیں

اربوں ڈالر کی سالانہ تجارت کے باوجود دونوں بڑی طاقتیں اپنے تنازعات دور نہ کر سکیں تو وہ جنگ کو جنم دے سکتے ہیں

ذیشان حسن

یہ ۱۸ اگست کی بات ہے، بھارتی فوجی ڈیمچوک (Demchok) میں ایک نہر کی کھدائی کرنے لگے۔ یہ گاؤں لداخ میں چین اور بھارت کی سرحد (لائن آف ایکچوئل کنٹرول) کے بالکل قریب واقع ہے۔ ڈیمچوک سے صرف ایک کلومیٹر دور دریائے سندھ بہتا ہے۔

ڈیمچوک کے پار چینی فوج موجود تھی۔ اس نے نہر کی تعمیر پر اعتراض کیا۔ وجہ یہ کہ چین علاقہ ڈیمچوک کو اپنی ملکیت سمجھتا ہے۔

یہ تنازع جاری تھا کہ ۸ ستمبر کو بھارتی فوج نے قریب ہی واقع ایک اور گاؤں، چمار کے پہاڑوں پر فوجی چوکی قائم کر لی۔ چونکہ یہ چوکی اونچائی پر واقع ہے لہٰذا لائن آف ایکچوئل کنٹرول سے پرے چین کا

بلند وبالا پہاڑوں پر سلسل جاری

وسیع علاقہ بھارتی فوجیوں کی نظر میں آ گیا۔

چینی فوج کو بھارتی فوجی چوکی سے خطرہ محسوس ہوا۔ چناں چہ اگلے ہی دن ۵۰۰ چینی فوجی علاقہ چمار میں پہنچ گئے۔ انھوں نے کرینوں اور بلڈوزروں کے ذریعے راتوں رات دو کلومیٹر طویل سڑک تعمیر کر ڈالی۔

اگلی رات بھارتی فوجیوں نے وہ سڑک کھود دی۔ چینیوں نے اس اقدام پر کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا تاہم کچھ ہی دور چینی فوج نے ڈیرے ڈال دیے۔ یہ دیکھ کر بھارتی فوج نے بھی کمک منگوالی۔ یوں لداخ کے پہاڑی علاقے میں چین اور بھارت کے ایک ایک ہزار فوجی آمنے سامنے آ گئے۔ یہ خطرہ محسوس ہونے لگا کہ دونوں طاقتور پڑوسیوں کی جھڑپ ہو سکتی ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اسی تنازع کے دوران چینی صدر شی جینپنگ نے ۱۷ ستمبر کو بھارت کا دورہ کیا۔ جب وہ ۱۹ ستمبر کو واپس وطن گئے، تو چمار میں بھارتی چینی مجادلہ جاری تھا۔ یہ حقیقت عیاں کرتی ہے کہ دونوں ممالک کے مابین بڑھتی باہمی تجارت بھی برسوں پرانی دشمنی کی آگ سرد نہ کر سکی۔

چار متنازع علاقے

چین اور بھارت کے مابین سرحد پر تین علاقوں پر تنازع چل رہا ہے۔ اول مشرقی علاقہ جہاں چینیوں کا دعویٰ ہے کہ بھارتی ریاست اروناچل پردیش چین کا حصہ ہے۔ اس علاقے میں "۹۰ ہزار مربع کلومیٹر" علاقہ متنازع ہے۔

دوم وسطی علاقہ جہاں چین اور بھارت کی سرحد پر ہمالیہ پہاڑ واقع ہیں۔ اس علاقے میں "۲ ہزار مربع کلومیٹر" رقبے پر تنازع چل رہا ہے۔

سوم مغربی علاقہ جہاں ڈیمچوک سیکٹر متنازع ہے۔ یہ لداخ کے ضلع لیہہ کا حصہ اور تبت کے ساتھ واقع ہے۔

چوتھے تنازع علاقے، آکسائی چن پر ۱۹۶۲ء کی چین بھارت جنگ کے دوران چینی فوج نے قبضہ کر لیا تھا۔ جموں و کشمیر کے ساتھ ملا ہوا یہ علاقہ ۳۷ ہزار مربع کلومیٹر رقبہ رکھتا ہے۔

چین اور بھارت پچھلے ۶۴ برس میں کوشش کے باوجود درج بالا سرحدی تنازع حل نہیں کر سکے۔ اس دوران قدامت پسند ہندو راہنماؤں نے کانگریسی لیڈروں کی نسبت چین کے خلاف زیادہ سخت رویہ اپنایا۔ مثال کے طور پر اپنی انتخابی مہم میں نریندر مودی نے چین کی پالیسیوں کو "توسیع پسندانہ" قرار دیا تھا۔

بھارتی وزیراعظم کو سخت پیغام

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ تنازعات کے باوجود دونوں ممالک کی باہمی تجارت بڑھتی رہی...... اور آج چین ہی بھارت کا سب سے بڑا تجارتی ساتھی ہے۔ پچھلے نو ماہ میں دونوں کے مابین ۵۰ ارب ڈالر (۵۰ کھرب روپے) کی تجارت ہو چکی۔ گو اس تجارت کا پلڑا چین کے حق میں جھکا ہوا ہے۔

پچھلے نو مہینوں میں چین نے ۴۱ ارب ڈالر کا مال بھارت بھجوایا یا برآمد کیا۔ جب کہ بھارتی صرف ۹ ارب ڈالر مالیت کا اپنا سامان ہی چین بھجوا سکے۔ یاد رہے چین کے بعد متحدہ عرب امارات امریکا اور سعودی عرب بھارت کے نمایاں تجارتی ساتھی ہیں۔

صدر شی جینپنگ کے دورے سے قبل بھارت میں چینی سفیر نے بیان دیا تھا کہ چین ملک میں "۱۰۰ ارب

ڈالر" کی سرمایہ کاری کرے گا۔ مگر دونوں ممالک کے مابین صرف ۲۰ ارب ڈالر مالیت کے معاہدے ہی ہو سکے۔ اس پر بھارتی ماہرین معاشیات کو خاصی مایوسی ہوئی جو چینی صدر سے بہت توقعات لگائے بیٹھے تھے۔ یہ ناکامی کئی وجوہ کی بنا پر انجام پائی۔

ایک خیال یہ ہے کہ چینی بعض شرائط منوا کر کسی ملک میں سرمایہ کاری کرتے ہیں۔ بھارتی وزیراعظم، نریندر مودی نے یہ شرائط ماننے سے انکار کر دیا۔ لہٰذا ۱۰۰ ارب ڈالر مالیت کے معاہدے منسوخ کر دیے گئے۔ یاد رہے، بھارتی وزیراعظم بیروزگار بھارتیوں کو ملازمتیں دینا چاہتے ہیں۔ جب کہ چین غیر ممالک میں جو منصوبے شروع کرے، وہاں عموماً چینی افسر و کارکن ہی کام کرتے ہیں۔

بھارتی ماہرین عسکریات کو امید تھی کہ صدر شی جینپنگ بھارت سے دفاعی معاہدہ بھی کریں گے۔ ۲۰۰۴ء میں چین اپنی شمالی سرحد کے ضمن میں ایسا ہی معاہدہ روس کے ساتھ کر چکا۔ لیکن لداخ میں سنگین عسکری ٹکراؤ کی وجہ سے چینی صدر اس محاذ سے بھی دور ہٹ گئے۔

حقیقتاً چینی و بھارتی راہنما، دونوں سرحدی تنازعات کے سلسلے میں کوئی متفق بیان ہی نہ دے سکے۔ یہ حقیقت عیاں کرتی ہے کہ دونوں ممالک سرحدی تنازعات پر اپنے موقف سے ایک انچ بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں۔ اگرچہ ان کے درمیان تجارت بہت بڑھ چکی۔

بعض ذرائع کا دعویٰ ہے کہ چینی فوج کے جرنیل نریندر مودی کے سخت رویے سے برگشتہ تھے۔ ان کے ساتھ چینی حکومت کے ایسے اعلیٰ عہدے دار بھی مل گئے جو صدر جینپنگ کی چلائی اینٹی کرپشن مہم کے مخالف ہیں۔ لہٰذا چینی جرنیل لداخ میں بھارتیوں سے ٹکراؤ کو بڑھاتے چلے گئے تاکہ بھارتی وزیراعظم کو سخت پیغام دے سکیں۔

مودی کی خفیہ خواہش

یاد رہے، نریندر مودی نے انتخابی مہم میں بھارتی عوام سے وعدہ کیا تھا کہ وہ سخت سکیورٹی پالیسیاں تشکیل دیں گے۔ یہی وجہ ہے، جب لداخ میں مجادلہ شروع ہوا، تو وزیراعظم مودی نے وہاں ۱۵۰۰ بھارتی فوجی بھجوانے کا حکم دیا تاکہ علاقے میں بھارت کو عددی برتری حاصل ہو جائے۔

بھارتی حکمران طبقے میں موجود "عقابوں" نے مودی کی اس روش کو سراہا جو ماضی کے برعکس تھی۔ ماضی میں پنڈت نہرو سے لے کر منموہن سنگھ تک، کانگریسی حکومتوں کا یہی وتیرہ رہا کہ وہ چینیوں کے ساتھ "پنگا" لینے سے گریز کرتے تھے۔

بھارتی ماہرین عسکریات کا دعویٰ ہے کہ کانگریسی حکومتوں کی بزدلی کے باعث چینی شیر ہو گئے۔ رفتہ رفتہ وہ بھارتی علاقوں میں کئی کلومیٹر اندر گھس آئے۔ مگر اب مودی سرکار چینیوں کو منہ توڑ جواب دینا چاہتی ہے۔ یہی بات بھارتی وزیراعظم کے اقدامات سے عیاں ہے۔

نریندر مودی نے حکومت سنبھالنے کے پہلے ہی ہفتے حکم دیا کہ لائن آف ایکچول کنٹرول پر "۲۷" تزویراتی (Strategic) سڑکیں فوری طور پر تعمیر کی جائیں۔ مدعا یہ ہے کہ علاقے میں آمد و رفت کا

نظام مضبوط بنایا جا سکے۔ یاد رہے، آکسائی چن سے لے کر اروناچل پردیش تک چینی اپنے علاقے میں چھوٹی بڑی سڑکوں حتیٰ کہ ریل کی پٹڑیوں کا مربوط جال بچھا چکے۔

قرائن بتا رہے ہیں کہ نریندر مودی کے دور میں بھارت چین مخاصمت میں اضافہ ہو گا۔ وجہ یہ کہ مودی فطرتاً لڑاکا اور جنگجو آدمی ہے۔ ایسے لوگ کمزوروں پر دھونس جمانا اپنا حق سمجھتے اور چاہتے ہیں کہ دوسر جھکا کے زندگی گزاریں۔ مودی بھی رویہ پاکستان، بنگلہ دیش اور سری لنکا کے ساتھ اختیار کر سکتا ہے۔ لیکن وہ چین کو اپنے اشاروں پر نچانے کی قدرت نہیں رکھتا۔

چینی حکومت کا دعویٰ ہے کہ سال رواں میں بھارتی فوج نے "۴۱۰ بار" کنٹرول لائن کی خلاف ورزی کی۔ جب کہ بھارتی حکومت الزام لگاتی ہے کہ چینی فوجی "۳۳۴ بار" اس کی سرزمین پر گھس آئے۔ اگر دونوں قوتوں کے مابین گرما گرمی بڑھی، تو بین الاقوامی سرحد پر خلاف ورزیاں بڑھ سکتی ہیں۔ اور یہ امر ان کے مابین اختلافات میں اضافہ کرے گا۔

یاد رہے، شعبہ عسکریات میں چین، بھارت سے کہیں آگے ہے۔ لڑاکا طیاروں کی تعداد ہو یا ٹینک، ہر عسکری شعبے میں چینی بھارتیوں پہ فیصلہ کن برتری رکھتے ہیں۔ مگر اب مودی سرکار اگلے سات آٹھ برس میں جدید ترین اسلحہ خریدنے پر کھربوں روپے خرچ کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ مقصد یہی ہے کہ خود کو بطور عالمی طاقت پیش کیا جا سکے۔ مگر کبھی کبھی اسی قسم کی خواہشیں زوال کا سبب بھی بن جاتی ہیں۔

◆◆◆

مردِ مومن

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان، نئی آن
گفتار میں، کردار میں، اللہ کی برہان!

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

ہمسایۂ جبریل امیں بندۂ خاکی
ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشان

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے، حقیقت میں ہے قرآن!

قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے
دنیا میں بھی میزان، قیامت میں بھی میزان

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو، وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں، وہ طوفان

فطرت کا سرودِ ازلی اس کے شب و روز
آہنگ میں یکتا صفتِ سورۂ رحمٰن

بنتے ہیں مری کارگہِ فکر میں انجم
لے اپنے مقدر کے ستارے کو تو پہچان!

(کلیات اقبال)

سمی ایک غریب ماں کی بیٹی تھی۔ وہ اپنی ماں اور بھائی کے ساتھ ایک معمولی کوارٹر میں مقیم تھی۔ اس کا بھائی کسی کے ہاں گھریلو ملازم تھا۔ غربت سے تنگ آ کر سمی نے ایف اے کیا تو اپنے شہر میرپور کے ایک اسٹور میں ملازمت کر لی۔

سمی نے مجھے اپنی کہانی وکیل کے دفتر میں سنائی۔ اس کا خاوند اسے مانچسٹر کے ایک پولیس اسٹیشن چھوڑ گیا تھا۔ اس کا ویزا ختم ہو چکا تھا اور وہ غیر قانونی تارکین وطن کے زمرے میں آتی تھی۔ ساتھ چھے ماہ کا بیٹا بھی تھا۔ پولیس اسے پاکستان واپس بھجوا دیتی لیکن سمی نے انسانی حقوق کے تحت درخواست جمع کروا دی اور استدعا کی کہ اُسے پاکستان نہ بھجوایا جائے کیونکہ وہاں اسے مار دیا جائے گا۔ پولیس نے مزید کارروائی کی خاطر اُسے میرے شہر برسٹل بھجوا دیا۔

مجھے نومبر کی دھند بھری شام فون کال وصول ہوئی کہ وکیل کے دفتر میں اردو ترجمان کی ضرورت ہے۔ دفتر پہنچی تو وہاں چھوٹے قد کی عام شکل و صورت والی لڑکی بچے کے ساتھ بیٹھی نظر آئی۔ سخت سردی میں اس نے لان کا سوٹ، ہلکا سا سویٹر اور چپل پہن رکھی تھی۔ یہ کپڑے تو برطانیہ کی گرمی میں بھی ناکافی ہیں، سردی کیا روکتے، چناں چہ وہ کانپ رہی تھی۔ بچے کو دیکھا تو یقین نہ آیا کہ وہ اس کا ہو سکتا ہے۔ کسی انگریز کا لگتا تھا: گورا چٹا، نیلی آنکھیں! میں نے اس سے پوچھا "کیا اس کا باپ ایسا ہی خوبصورت ہے؟"
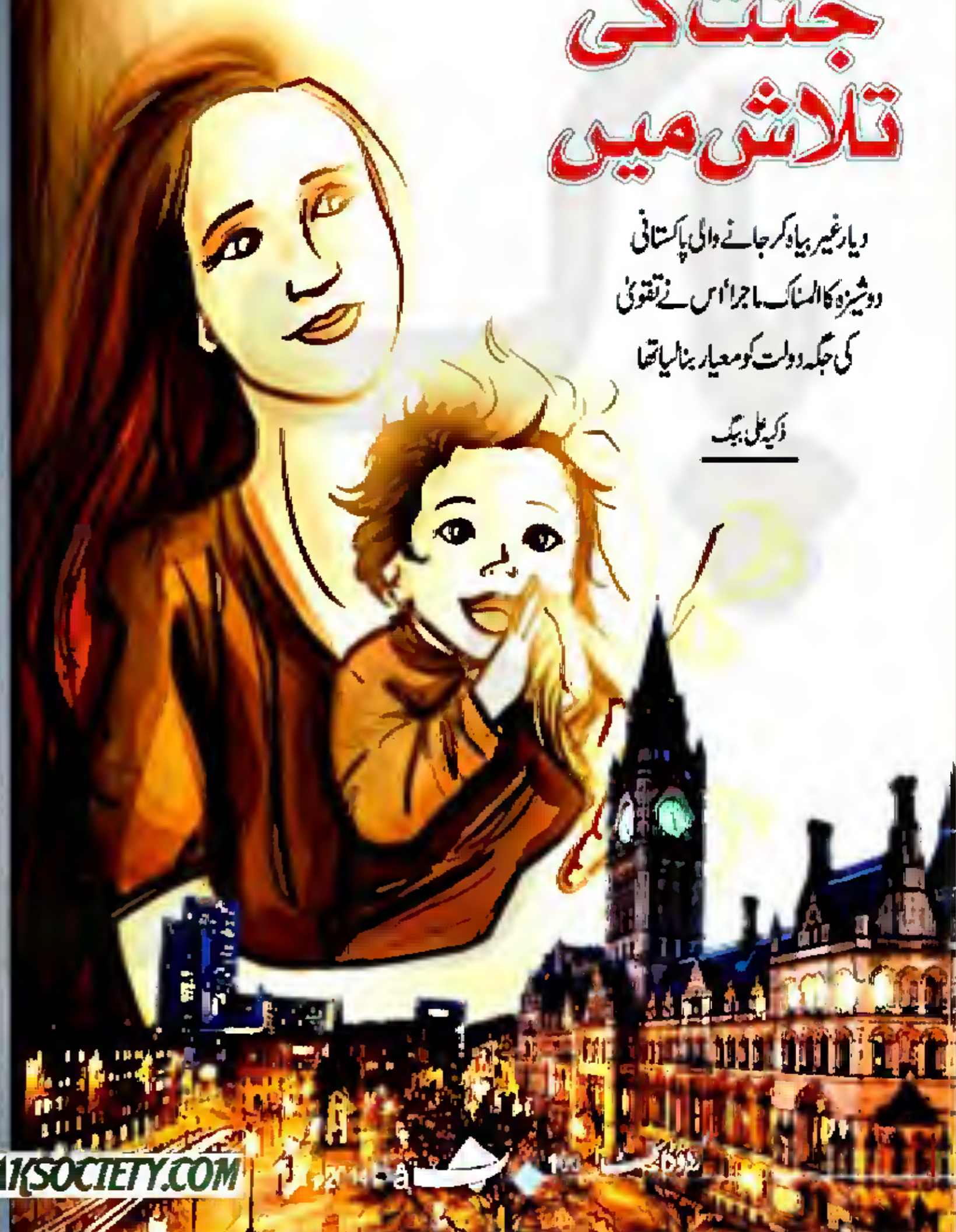
میں نے مشاہدہ کیا ہے کہ ایک قوم کی ترقی میں سب سے اہم کردار سوچ کا ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ تعمیری سوچ ہی ایک عمدہ معاشرے کو جنم دیتی ہے۔ ہمارے سوچنے کا ڈھنگ تقدیر کو بھی بدل سکتا ہے۔ مثلاً پاکستان کے زلزلہ ۲۰۰۵ء میں ہزاروں لوگ مارے گئے۔ لیکن یہی زلزلہ جب جاپان میں آیا تو اموات کی شرح بہت کم تھی۔ کیا آپ نے کبھی اس حقیقت پر غور کیا کہ خدا ایک غیر مسلم قوم پر کیوں مہربان ہے؟ وجہ یہ کہ انھوں نے صرف تقدیر پر بھروسہ نہیں کیا بلکہ مسلسل کوشش سے ایسی ایجادات تخلیق کیں جن کے بل پر انھیں معلوم ہو جاتا ہے کہ کب زلزلہ آئے گا۔ چناں چہ وہ اس سے نمٹنے کا بندوبست کر لیتے ہیں۔ وہ ایسے آلات ایجاد کر چکے جو زیرِ زمین پوشیدہ آفات کا پتا لگا لیتے ہیں۔

یہ سب کرشمہ نہیں بلکہ تعمیری سوچ کا نتیجہ ہے۔ ہم بدقسمتی سے صدیوں کی جہالت میں دھنسے ہوئے ہیں اور اس سے نجات بھی نہیں چاہتے۔ مثلاً یورپ میں لڑکا لڑکی اگر متوسط طبقے سے تعلق رکھیں تو تب بھی یونیورسٹی کی فیس کے لیے قرض لے سکتے ہیں۔ وہ تعلیم مکمل ہونے پر ادا کیا جا سکتا ہے۔ اس میں کوئی شرم کی بات نہیں سمجھی جاتی۔ اسی طرح لڑکے لڑکی کو پسند سے شادی کرنے کا پورا اختیار ہے۔ وہ شادی کا خرچہ کما کر پورا کرتے اور خود گھر بناتے ہیں۔ اس طرح انھوں نے اپنے والدین کی کئی مشکلات آسان کر دیں۔

ہمارے ہاں تو لڑکی پیدا ہوتے ہی بوجھ بن جاتی ہے۔ اس کی تعلیم پر یہ سوچ کر لڑکے سے کم خرچ کیا جاتا ہے کہ جہیز بھی تو بننا ہے۔ لڑکی خوبصورت نہ ہو تو قدم قدم پر مشکلات سے سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے۔ اور لڑکے والے بھی رشتہ دے کر جیسے لڑکی والوں پر احسان کرتے ہیں۔ (ذکیہ بیگ)

اس نے اقرار کیا۔ میں نے ہنس کر کہا "گویا تم نے گورا رنگ اور نیلی آنکھیں دیکھیں تو پھسل گئیں۔"

وہ حسرت سے بولی "باجی! آپ کو میرے حالات کیا معلوم!"

مجھے احساس ہوا کہ مجھے ایسی بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔

وکیل پھر اس سے روایتی سوالات کرنے لگا۔ سی پانچ سال کی تھی جب اس کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ ماں نے لوگوں کے کام کاج کر کے انھیں پالا۔ وہ میرپور' آزاد کشمیر کے رہنے والے تھے۔ اس شہر کے کئی باسی برطانیہ میں آ بسے ہیں۔ انگلینڈ کے بڑے شہروں میں ان کے محلے آباد ہیں۔ ان کے رہن سہن میں کوئی تبدیلی نہیں آئی' وہ گھر میں میرپوری زبان بولتے ہیں۔ میرپوری کھانے پکاتے اور اپنی روایات پر سختی سے عمل کرتے ہیں۔ آپ ان کی اولاد کو دیکھ کر یقین نہیں کر سکتے کہ وہ انگلینڈ جیسے جدید ملک کی پیداوار ہیں۔ ان کی چوتھی نسل برطانیہ میں پیدا ہو چکی لیکن اب بھی تعلیم و تربیت کی طرف زیادہ توجہ نہیں' تجارت ہی سب سے مقبول ذریعہ آمدن ہے۔

برطانیہ میں مقیم بعض دولت مندوں نے میرپور میں برطانوی طرز پر سپر مارکیٹیں بنا رکھی ہیں۔ سی بھی ایسی ہی ایک سپر مارکیٹ کے جیولری ڈیپارٹمنٹ میں کام کرنے لگی۔ وہیں اس کی ملاقات برطانیہ سے آنے والے علی سے ہوئی۔ وہ ایک خوبرو مرد تھا۔ اسے اپنی مردانہ وجاہت کا اندازہ بھی تھا۔

سی کو اندازہ ہو گیا کہ وہ انگلینڈ پلٹ ہے کیونکہ عموماً ایسے لوگ ہی وہاں آتے تھے۔ علی نے کچھ جیولری پسند کی اور بل ادا کیا۔ رات بھر سی اس کے متعلق سوچتی رہی: یہ کتنے خوش نصیب لوگ ہیں! سی کے لیے ان کی دنیا الف لیلوی تھی' وہ اسے دیکھ تو سکتی تھی لیکن چھو نہ پاتی۔

علی جہاں دیدہ مرد تھا۔ وہ سی میں پوشیدہ حسرتوں کے طوفان بھانپ گیا۔ وہ روزانہ بہانے بہانے سے سی کے شعبے میں آنے لگا۔ جلد ہی اُس نے اپنی لچھے دار باتوں سے سی کو اپنا اسیر کر لیا۔ اب وہ اور سی ساتھ گھومنے پھرنے لگے۔ وہ اسے تحفے دیتا۔ لڑکی کی ماں کو اعتراض ہوا تو علی نے سی سے شادی کا وعدہ کر لیا۔ اس نے سی کی والدہ کو خود ساختہ درد بھری کہانی سنائی۔ یہ کہ اس کی شادی مرضی کے خلاف خالہ کی بیٹی سے انگلینڈ میں کر دی گئی۔ وہ آزاد خیال لڑکی ہے جس نے علی کی زندگی کو جہنم بنا رکھا ہے۔ علی کی دو بیٹیاں ہیں اور اس کی بیوی لڑکا پیدا نہیں کر سکتی۔ مگر وہ لڑکے کی شدید خواہش رکھتا ہے۔

ماں بیٹی میں شاید شعور کی کمی تھی یا وہ اس معاشرے کی پیداوار تھیں جہاں مجبوری انسان سے سوچنے سمجھنے کی طاقت چھین لیتی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سی کی حسرتوں نے حرص کی شکل اختیار کر لی۔ چناں چہ ہونی ہو کر رہی اور وہ دونوں علی کے جال میں پھنس گئیں۔ علی نے ایک ریستوران میں اس سے منگنی کی اور طلائی زیورات دیے۔ سی اور اس کی ماں نے صرف باہر سے ایسے ریستوران کی شکل دیکھی تھی۔ ماں اپنی بیٹی کی قسمت پر بہت نازاں ہوئی۔

برطانوی قانون کی رو سے دوسری شادی کرنے کے لیے ضروری ہے کہ شوہر پہلی بیوی کو طلاق دے۔ علی اس قانون سے خوب واقف تھا کہ دوست اسی راہ سے گزر چکے تھے۔ بہرحال اس نے سی کا وزٹ ویزا لگوا دیا۔ اسے کئی جھوٹ بولنے پڑے۔ اس نے سی کو بھی باور

کرایا کہ اسے سفارت خانے کیا کہنا ہے۔

سپنوں کے جھولے جھولتی سی نے ایک دفعہ بھی نہ سوچا کہ جس رشتے کی بنیاد جھوٹ پر رکھی جا رہی ہے' اس کا انجام کتنا بھیانک ہو گا۔ بھوک اور لالچ کی اپنی مجبوریاں ہوتی ہیں۔ ویسے بھی سی جس بدقسمت معاشرے میں رہتی تھی' وہاں ایک غریب اور یتیم لڑکی کو شاید کوئی قبول نہ کرتا۔ ہم ذات پات کے پھندوں میں الجھے زندگیاں مشکل سے مشکل تر خود بناتے اور اپنی زبوں حالی کا الزام غیر ملکیوں کو دیتے ہیں۔ حالانکہ آسان زندگی اپنانے میں مغربی ہم سے کہیں آگے نکل چکے۔ آپ ملکہ برطانیہ ہی کو دیکھ لیجیے۔ اس نے اپنے پوتے کی شادی عام گھرانے میں کر دی کیونکہ شہزادہ ولیم کو کیٹ مڈلٹن پسند تھی۔

بہرحال سی کو ان مسائل سے کیا لینا تھا' وہ تو غربت اور حسرتوں کی بھٹی میں جل رہی تھی۔ بالآخر سی کو جنت کی کنجی مل گئی جب اس کا وزٹ ویزا لگ کر آیا۔ سی کو گویا خوابوں کا محل مل گیا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ انگلینڈ میں شادی شدہ مرد کو دوسری شادی کی اجازت نہیں۔ وہ مانچسٹر پہنچی' تو علی نے چند روز اسے ایک گھر میں رکھا۔ پھر دوستوں کو بلا کر اس سے نکاح کر لیا۔

برطانوی قانون کی نظر میں اس نکاح کی کوئی وقعت نہ تھی لیکن سی نے خود کو بیاہتا بیوی کا درجہ دے دیا۔ وہ علی کو نخرے دکھاتی۔ ویسے ہی مطالبے کرنے لگی جیسے ایک بیاہتا بیوی کرتی ہے۔ گھر دیر سے آنے پر جھگڑا' پہلی بیوی کے گھر جانے پر جھگڑا' نت نئی فرمائشوں پر جھگڑا۔ سی واقعی سمجھدار نہ تھی' علی کا دل رفتہ رفتہ اس سے بھرنے لگا۔ آخر وہ اسے محبوبہ بنانا چاہتا تھا ورنہ بیوی تو اس کے پاس تھی ہی۔ چناں چہ وہ گھر کے کم چکر لگانے لگا۔

ایک دن انکشاف ہوا کہ سی ماں بننے والی ہے۔ اب علی گھبرا گیا۔ سی کا وزٹ ویزا ختم ہو چکا تھا۔ بہرحال وہ اُسے اسپتال لے گیا۔ علی چونکہ برطانوی شہری تھا لہٰذا سی سے شناخت نہ پوچھی گئی۔ اس نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔

چند روز بعد وہ اپنے گھر چلی آئی۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ کچھ ہفتوں بعد علی کی بیوی نے دونوں کو بازار میں اکٹھے دیکھ لیا۔ وہ سمجھ گئی کہ اس کا شوہر دوسری شادی کر چکا۔ مگر وہ سمجھدار عورت تھی۔ اس نے مجبوراً سی کو قبول کر لیا۔ ویسے بھی وہ ویسی نہ تھی جیسا علی نے بیان کیا۔ اس کا گھر اسی طرح بچ سکتا تھا۔ اب وہ دوسرے تیسرے دن سی کے گھر آتی' اس کے بیٹے سے کھیلتی اور اکثر اسے اپنے ساتھ لے جاتی۔

ایک روز سی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا جب وہ رات گئے تک بچے کو واپس نہ لائی۔ سی نے فون کر کے اپنی سوکن کو خوب سنائیں۔ جلد ہی دونوں میاں بیوی آ دھمکے۔

"تم نے میری بیوی سے فون پر بدتمیزی کیوں کی؟" علی نے غصے سے پوچھا۔

"میں بھی تمہاری بیوی ہوں۔" سی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

علی کی بیوی طنز سے ہنس پڑی۔ سی کو اور غصہ آ گیا۔

"تم کیوں ہنسیں؟" وہ بولی۔

"تم علی کی بیوی نہیں' برطانوی قانون کی نظر میں اس کی رکھیل ہو۔"

یہ سن کر سی کے سر پر آسمان ٹوٹ پڑا۔ "اچھا بیٹا تو اس کا ہے نا۔" اس نے دلی جذبات چھپاتے ہوئے ناز سے کہا۔

"بیوقوف عورت! یہاں بچے کے پیدائشی سرٹیفکیٹ پر

باپ کا نام صرف اسی صورت آتا ہے جب تم اس کی قانونی بیوی ہو جاؤ۔"

بی کو دیوار کا سہارا لینا پڑا۔ "میں پولیس کو سب کچھ بتادوں گی۔" اس نے دھمکی دی۔

"میں تمھیں خود پولیس اسٹیشن لے جاتا ہوں۔" علی غصے سے بولا۔ اس نے پھر بی کو کار میں بٹھایا اور پولیس اسٹیشن لے جا کے چھوڑ دیا۔

پولیس والوں نے بی کو بتایا کہ ناکافی ثبوتوں کی وجہ سے وہ اس کی مدد نہیں کر سکتے۔ آخر اس نے جھوٹ بول کر ویزا لیا تھا۔ چناں چہ بی غیر قانونی تارکین وطن کے زمرے میں شامل ہو گئی۔ پولیس والوں نے اُسے سیاسی پناہ لینے کو کہا اور سرکاری وکیل کے پاس بھیج دیا۔ اسے مانچسٹر سے برسٹل لا کر ایک گھر میں ٹھہرا دیا گیا۔ اس سے میری پہلی ملاقات وکیل کے دفتر میں ہوئی۔

☆☆

اسے سردی سے ٹھٹھرتے دیکھ کر مجھے بہت ترس آیا۔ میری پیشہ وارانہ ذمہ داری پر انسانیت غالب آ گئی۔ میں نے وکیل سے کہا کہ اسے کچھ گرم کپڑے لے دیتی ہوں۔ وکیل بولا "Zakia, you are very kind lady" (ذکیہ! آپ بہت رحم دل خاتون ہیں) میں نے بچے کو بھی گرم کپڑے دلوائے۔ کھانے پینے کا سامان لے کر دیا۔ میرے گھر میں بہت سارا سامان رکھا تھا مثلاً فالتو دیگچیاں، برتن، تھیلے اور جوتے وغیرہ وہ بھی اُسے دے ڈالے۔

لیکن پھر انسانی فطرت کا عجیب نظارہ دیکھا۔ بی نے غربت اور افلاس کی شدت دیکھی تھی، اسی لیے اس کے رویے میں ہوس سی تھی۔ وہ سب چیزوں کو ہاتھ بھر کر لیتی اور احسان مند بھی نہ ہوتی۔ میں اسے اپنا

قناعت

☆۔ قناعت اختیار کرو، کیونکہ قناعت ایک ایسا مال ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔ (الحدیث)

☆۔ جتنی روزی اللہ نے تمھارے لیے مقرر فرما دی ہے اس پر راضی اور مطمئن رہو تو تم سب سے زیادہ غنی ہو جاؤ گے۔ (الحدیث)

☆۔ مومنوں میں سب سے اچھا قانع ہے اور سب سے برا طامع۔ (الحدیث)

☆۔ طمع فقر و محتاجی پیدا کرتی ہے اور قناعت غنی کر دیتی ہے۔ (حضرت عمرؓ)

(آمنہ رمضان، عارف والا)

احسان مند بنانا بھی نہیں چاہتی تھی لیکن اس کے لالچی رویے نے مجھے بددل کر دیا۔ اسے یہ فکر نہ تھی کہ وہ اپنا پاسپورٹ سنبھالے یا اس کے ویزے کا کیا بنتا ہے۔ اسے بس یہ فکر تھی کہ میں اس کا گھر نت نئی اشیا سے بھر دوں۔ میں نے اُسے ضرورت کی سبھی چیزیں لا کر دیں، مگر وہ عیاشی کا سامان چاہتی تھی۔

وہ عجیب و غریب فرمائش کرنے لگی۔ کبھی کہتی کہ اسے الیکٹرک بوتل چاہیے جو چالیس پونڈ کی آتی تھی۔ میں نے اسے سمجھایا کہ اکثر انگریز بھی بچوں کی بوتل ابلتے پانی میں جراثیم سے پاک کر لیتے ہیں۔ جبکہ چالیس پونڈ میں اس کا ہفتہ وار خرچہ چل سکتا ہے۔ وہ غصے سے بولی "نہ لا کر دیں، آپ کو میری خواہش کی کیا پروا۔" میں اسے کیسے سمجھاتی کہ میں خود کماتی اور بجٹ بنا کر خرچ کرتی ہوں۔ اُسے پھر برقی کیتلی چاہیے تھی کیونکہ باورچی خانے میں رکھی کیتلی اُسے پسند نہ تھی۔ میں اُس کی فرمائشوں سے تنگ آنے لگی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ علی کو کیسے

پریشان کرتی ہوگی۔

دفتر ہوتی، تو اس کے فرمائشوں بھرے ایس ایم ایس آنے لگتے۔ اسے قطعی پروا نہ تھی کہ اس کے مستقبل کا کیا بنے گا۔ وہ بس اپنی حسرتیں پوری کرنے کی چاہ میں گم تھی۔ اسے برسٹل پسند نہ تھا۔ چناں چہ حکومت پر زور دینے لگی کہ اُسے مانچسٹر میں بڑا گھر دیا جائے۔ میں نے سمجھانے کی کوشش کی کہ اسے سرکار کا شکرگزار ہونا چاہیے کہ اس کو اتنی سہولیات دی گئی ہیں مگر وہ مجھ سے ناراض ہو گئی۔ آخر سرکار اُسے ماہانہ خرچہ الاؤنس دینے لگی تو میں نے سکھ کا سانس لیا۔ میری خودساختہ ذمہ داری ختم ہوئی۔ میں نے پھر اس سے رابطہ کم کر دیا۔

ایک دن اس نے فون کیا۔ پتا لگا، حکومت نے گاڑی بھیجی ہے تاکہ اسے واپس مانچسٹر لایا جا سکے۔ وہ شکایتوں کا انبار لگائے ہوئے تھی۔ "مجھے چھوٹی گاڑی کیوں دی گئی؟ انھیں معلوم ہونا چاہیے تھا کہ میرے پاس بہت سارا سامان ہے اور مجھے پک اپ کی ضرورت ہے۔"

میں نے حیرت سے پوچھا "کون سا سامان؟"

اس نے کہا "باجی! فوڈ اور کیا۔"

معلوم ہوا اس نے گھر کھانے پینے کے سامان سے بھر رکھا ہے۔ آٹے اور چاول کے بڑے بڑے تھیلے اور دیگر اشیا! ہمسایوں سے مانگ مانگ کر مختلف چیزیں بھی جمع کر رکھی تھیں۔ اسے سامان نہ لے جانے کا دکھ شادی ناکام ہونے سے بھی زیادہ تھا۔ اس کے اندر دبی حسرتوں نے حرص کا خوفناک رنگ اختیار کر لیا تھا۔ وہ مادی خواہشات کے علاوہ کچھ اور دیکھنے سے قاصر تھی۔

مانچسٹر پہنچ کر فون آیا کہ اسے ایک ہوسٹل میں ٹھہرایا گیا ہے اور کھانے کو کچھ میسر نہیں۔ میں نے اپنے جاننے والوں کو فون کیا۔ انھوں نے اس کے کھانے کا انتظام کر دیا۔ وکیل اس سے بہت ناراض ہوا کیونکہ وہ آخری لمحات میں بھی اشیا سمیٹ رہی تھی۔ اور اپنے اہم کاغذات جن میں پاسپورٹ شامل تھا برسٹل ہی چھوڑ آئی۔

یہ سچی کہانی افسانے سے زیادہ دلچسپ ہے۔ یہ انسانی نفسیات کا انوکھا پہلو سامنے لاتی ہے کہ نت نئی اشیا پانے کی بھوک انسان کو کس قدر مادہ پرست بنا دیتی ہے۔ پھر ہمارے نظام تعلیم نے بھی اُسے شعور دینے میں کوئی کردار ادا نہیں کیا۔ بی کو شعور ہی نہیں کہ زندگی میں اور بہت کچھ اہم ہے۔

مانچسٹر میں آخر اُسے بڑا گھر مل گیا۔ میں اس سے ملنے گئی تو حسب دستور گھر مختلف سامان اور کھانے پینے کی چیزوں سے بھرا پڑا تھا۔ اس کے معاملے کو انسانی تجارت کا کیس قرار دیا گیا۔ چناں چہ حکومت برطانیہ نے اسے پانچ سال کا ویزہ دے ڈالا۔ اس کو خرچہ بھی حکومت دیتی ہے۔ بچے کی تعلیم اور طبی سہولیات مفت ہیں۔ پانچ سال بعد کیا ہوگا؟! وہ اس سے بے نیاز ہے۔ وہ دوسری شادی نہیں کرنا چاہتی اور اپنے حالات میں خوش ہے۔

بات پھر وہیں پہنچتی ہے کہ وہ ایسے معاشرے کی پیداوار ہے جہاں مادہ پرستی انسانی روح کو کچل چکی۔ ہم نے دولت کو تقویٰ کی جگہ معیار بنا کر اپنی زندگی خود ہی مشکل بنا لی۔ اگر ہم بھی معاشرے میں عورت کی عزت کو فروغ دیں تو کئی عورتیں علی جیسے خودغرض اور ہوس پرست مردوں کی بھینٹ چڑھنے سے بچ جائیں گی۔ کئی بیوائیں سکون سے جی سکیں گی اور ان پر کوئی آواز نہ کسے گا۔ ذرا سوچیے، جب ہم جہیز دینے لینے کی غیر اسلامی رسم ہی ختم کر دیں تو ہم سب کے والدین اور آنے والی نسلیں بھی سکون سے جی سکیں گی۔

◆◆◆

ہر سال منعقد ہونے والا

امریکی انتہا پسندوں کا خفیہ اکٹھ

"دی گیدرنگ" نامی تقریب کے ذریعے
انتہا پسند عیسائی سالانہ ایک کھرب روپے جمع کر لیتے ہیں

سید عاصم محمود

برٹرینڈ رسل (۱۸۷۲ء۔۱۹۷۰ء) دنیائے مغرب کا ممتاز فلسفی گزرا ہے۔ اس کا قول ہے:
"انتہا پسندی کسی بھی شکل میں ہو، وہ معاشرے کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔" یہ معقول بات روئے زمین پہ پائے جانے والے سبھی انسانی معاشروں پر فٹ بیٹھتی ہے۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ حادثہ نائن الیون کے بعد مغربی میڈیا نے انتہا پسندی کو صرف اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ نتھی کر دیا۔ حتیٰ کہ مقبوضہ کشمیر، فلسطین، چیچنیا، برما اور فلپائن وغیرہ میں چلنے والی آزادی کی تحریکیں دہشت گردی کے مترادف قرار پائیں۔

اب یہ واویلا کیا جا رہا ہے کہ اسلامی ریاست عراق و شام، افغان طالبان، القاعدہ، بوکوحرام وغیرہ انتہا پسندی کی علامتیں ہیں۔ مغربی میڈیا میں انڈونیشیا سے لے کر موریطانیہ اور نائیجیریا تک مختلف مسلم ممالک میں پھیلی اسلامی انتہا پسندی کے متعلق آئے دن مضامین شائع ہوتے ہیں اور اُسے سب کے سامنے ہوا بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ مذہبی انتہا پسندی نے یورپی ملکوں و امریکا میں جنم لیا جو آج عالم اسلام کی شکست و ریخت میں مصروف ہیں۔ اس مغربی انتہا پسندی کی تاریخ تین سو سال پرانی ہے۔ اس کے معمار وہ عیسائی پادری ہیں جو عیسائیت کو دنیا بھر میں پھیلانا چاہتے تھے۔ ان میں جرمن فلپ سپینر (۱۶۳۵ء۔۱۷۰۵ء) اور آگست ہرمان فرانکے (۱۶۶۳ء۔۱۷۲۷ء) نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔

درج بالا جرمن پادریوں کی تعلیمات سے مغرب میں اناجیلی تحریک (Evangelicalism) نے جنم لیا۔ اس تحریک کے پیروکار دنیا میں عیسائیت پھیلانے کی خاطر سرگرم ہو گئے۔ انھوں نے ہی مشنری سوسائٹیاں قائم کیں اور انیسویں و بیسویں صدی میں ہندوستان، انڈونیشیا، مسلم افریقی ممالک وغیرہ آتے جاتے رہے۔

رفتہ رفتہ اناجیلی تحریک کے بطن سے خصوصاً کٹر مذہبی نظریات رکھنے والی عیسائی تنظیمیں پیدا ہوئیں۔ ان تنظیموں کا ایک اہم نظریہ ہے کہ جب بیت المقدس میں مسجد اقصیٰ کی جگہ ہیکل سلیمانی تعمیر ہو گا تبھی حضرت عیسیٰ کرہ ارض پر نزول فرمائیں گے۔ چناں چہ یہ امریکی مذہبی تنظیمیں اسرائیلی حکومت کی ہر ممکن مدد کرتی ہیں تاکہ (خدانخواستہ) مسجد اقصیٰ کو شہید کرنے کی راہ ہموار ہو سکے۔

۲۰۰۶ء میں مشہور امریکی دانشور اور صحافی، تہتر سالہ کیون فلپس کی کتاب "امریکن تھیوکریسی" (Amrican Theocracy) شائع ہوئی۔ اس میں کیون نے تفصیل سے بتایا ہے کہ امریکی مذہبی انتہا پسندوں نے "آئل لابی" کے ساتھ مل کر کیسے ۲۰۰۳ء میں عراق پر حملہ کرایا۔ امریکا میں انتہا پسند ڈسپینشلسٹ (Dispensationalists)، عیسائی صیہونی، پینٹا کوسٹل (Pentecostalis) وغیرہ کہلاتے ہیں۔

ان انتہا پسند تنظیموں کے اپنے سیکڑوں ٹی وی نیٹ ورک، اخبار اور رسالے ہیں جن کے ذریعے وہ امریکی و یورپی عوام میں اپنے خیالات و نظریات کی ترویج کرتی ہیں۔ حادثہ نائن الیون کے بعد تو ان کی سرگرمی میں شدت آ گئی اور وہ اسلام و مسلمانوں کے خلاف زہر اگلنے لگیں۔

حیرت انگیز امر یہ ہے کہ مغربی میڈیا ان کے متعلق بہت کم خبریں اور مضامین شائع کرتا ہے۔ بس کبھی کبھی کوئی کمیونسٹ رسالہ یا اخبار انتہا پسند تنظیموں اور ان کے راہنماؤں کی سرگرمیوں پر مبنی چشم کشا رپورٹ چھاپ دیتا ہے۔

مغربی میڈیا میں نمایاں نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ امریکی معاشرے میں یہ تنظیمیں بہت اثر و رسوخ رکھتی ہیں۔ قریباً ہر امریکی میڈیا کمپنی کا مالک یا اعلیٰ افسر کسی نہ کسی انتہا پسند تنظیم کا رکن ہے۔ حتیٰ کہ یہ تنظیمیں امریکی حکومت کی پالیسیاں بنانے میں بھی اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ اسی لیے امریکی و مغربی میڈیا میں ان کے خلاف کوئی تحریر سامنے نہیں آ پاتی۔ مزید برآں مغربی میڈیا ایسے بھی یورپ اور امریکا میں جنم لینے والے انتہا پسندانہ رجحانات کو نمایاں نہیں کرتا تاکہ دنیا والوں کی توجہ اسلام و مسلمانوں ہی پر مرکوز رہے۔

انتہا پسندوں کا سالانہ اکٹھ

پچھلے دنوں مغربی میڈیا میں نجانے کیسے امریکی انتہا پسندوں پہ ایک چشم کشا مضمون شائع ہو گیا۔ یہ "دی گیدرنگ" (The Gathering) نامی تنظیم سے متعلق تھا۔ مضمون میں انکشاف کیا گیا کہ یہ ان امریکی کمپنیوں، تنظیموں اور سماجی اداروں کے سالانہ اکٹھ یا تقریب کا نام ہے جو دنیا بھر میں انتہا پسندانہ مسیحی

خیالات کی ترویج کرتی ہیں۔

"دی گیدرنگ" کے موقع پر دیکھا جاتا ہے کہ نظریات کی ترویج کے منصوبے کس حال میں ہیں اوران سے کتنا فائدہ ہوا۔ نیز اسی اکٹھ میں مزید منصوبے شروع کرنے کی خاطر چندہ بھی جمع کیا جاتا ہے۔ عام طور پر اس چندے کی مالیت ایک ارب ڈالر (ایک کھرب روپے) تک پہنچ جاتی ہے۔

ایک ارب ڈالر چھوٹی رقم نہیں! اسی بھاری بھرکم رقم کی بدولت امریکا میں انتہا پسند گروہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف وقتاً فوقتاً مختلف تحریکیں چلاتے اورانھیں بدنام کرنے کی سرتوڑ سعی کرتے ہیں۔

دی گیدرنگ کی بنیاد ۱۹۸۵ء میں امریکی انتہا پسندوں کی ایک خفیہ تنظیم "دی فیملی" (The Family) کے رہنماؤں نے رکھی تھی جو "دی فیلوشپ" بھی کہلاتی ہے۔ ۲۰۰۸ء تک یہ امریکی حکومت میں سب سے زیادہ اثر و رسوخ رکھنے والی عیسائی تنظیم تھی۔ اس کی بنیاد ۱۹۳۵ء میں رکھی گئی۔

۱۹۵۳ء سے اسی تنظیم کے زیراہتمام ایک خاص تقریب "قومی دعائیہ ناشتا" (National Prayer breakfast) منعقد ہو رہی ہے۔ یہ تقریب دراصل میٹنگوں، عشائیوں اور عصرانوں کا مجموعہ ہے جن میں چوٹی کے امریکی سیاست داں، صنعت کار، کاروباری اور عالمی مہمان شریک ہوتے ہیں۔ کسی ایک عصرانے یا عشائیے میں امریکی صدر بھی شرکت کرتا ہے۔

"دی فیملی" تشہیر سے گریز کرتی ہے۔ نیز اس کے ارکان بھی پراسرار حیثیت رکھتے ہیں۔ تاہم ۲۰۰۸ء میں ایک کتاب "دی فیملی: دی سیکرٹ فنڈا منٹلزم ایٹ دی ہارٹ آف امریکن پاور" نے تنظیم کی اصلیت اور کارروائیوں کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ یہ کتاب امریکی صحافی جیف شارلٹ کی تصنیف ہے۔

دی فیملی......ایک پُراسرار تنظیم

درج بالا کتاب سے پہلی بار افشا ہوا کہ کئی امریکی کارپوریشنوں و ملٹی نیشنل کمپنیوں کے مالک اور ارکان پارلیمان (سینٹ و ایوان نمائندگان) "دی فیملی" کے رکن ہیں۔ ان کا منشا یہ ہے کہ امریکی حکومت عیسائیت کی علم بردار بن جائے اور دنیا بھر میں اس مذہب کی ترویج و اشاعت کرے۔ کتاب کی اشاعت کے بعد یہ مذہبی تنظیم مزید خفیہ ہو چکی۔

دی فیملی کے رسوخ کی وجہ ہی سے انتہا پسند تنظیموں کو امریکی حکومت کے مختلف سماجی پروگراموں مثلاً USAID، PEPFA اور دیگر کروڑوں ڈالر کا بجٹ رکھنے والے پروگراموں سے بھاری رقم بھی ملتی ہے۔ یہ بھی انھیں مستحکم بنانے اور پروپیگنڈا پھیلانے میں کام دیتی ہے۔

یاد رہے، انھی انتہا پسند تنظیموں کے پروپیگنڈے کی وجہ سے امریکا میں اسلام و مسلمانوں کے خلاف تعصب بڑھ رہا ہے۔ کثیر سرمایہ رکھنے کے باعث یہ اسلام کی تضحیک کرنے والی تشہیری مہمات وسیع پیمانے پر انجام دیتی ہیں۔ مگر امریکی میڈیا ان کی نفرت انگیز اور خطرناک مہمات کبھی نمایاں نہیں کرتا۔ اسی لیے عام امریکی داعش اور القاعدہ کے متعلق تو بہت کچھ جانتا ہے لیکن اپنے آس پاس پھیلے انتہا پسندی کے ناسور سے وہ واقف نہیں۔

مشہور قول ہے: جھوٹ کو بار بار دہرایا جائے تو وہ

سچ بن جاتا ہے۔ امریکی معاشرے میں بھی یہی ہوا کہ نام نہاد اسلامی انتہا پسندی کا اتنا زیادہ چرچا کیا گیا کہ عام امریکی اُسے سچ سمجھ بیٹھا۔

اسلامی انتہا پسندی دراصل اس ظلم و ستم کا ردعمل ہے جو پچھلے تین سو برس سے مغربی استعمار مسلمانوں پر ڈھا رہا ہے۔ اگرچہ اس کا آغاز صلیبی جنگوں سے شروع ہوا۔ پھر عیسائی حکمران اسپین پر قابض ہوئے تو انھوں نے اندلسی مسلمانوں پر ظلم کے پہاڑ توڑے۔ بعدازاں ولندیزی، ہسپانوی، برطانوی اور اطالوی استعمار نے اسلامی ممالک پر دھاوا بول دیا اور بیسویں صدی تک مسلمانوں کو غلام بنائے رکھا۔

بیسویں صدی میں کئی مسلم ممالک کو آزادی تو مل گئی مگر وہاں کا حکمران طبقہ مغربی استعمار کی کاسہ لیسی کرتا رہا۔ اسی لیے عالم اسلام وسائل اور طاقت رکھنے کے باوجود فلسطین، کشمیر، بوسنیا، چیچنیا، فلپائن، برما، ترکستان وغیرہ میں غیرمسلموں کو ظلم کرنے سے نہ روک سکا اور وہ مسلمانوں کے خون سے ہاتھ رنگتے رہے۔

اسی قتل عام کے خلاف مسلم نئی نسل نے تیس چالیس سال قبل مغربی استعمار کے خلاف جہاد شروع کیا۔ تاہم مختلف وجوہ کی بنا پر کئی اسلامی جہادی تنظیمیں انتہا پسند ہو گئیں حتیٰ کہ وہ مسلم ممالک مثلاً عراق، شام، لیبیا، نائیجیریا، پاکستان، یمن، صومالیہ، ازبکستان وغیرہ میں اپنی ہی حکومتوں سے لڑنے لگیں۔ اس خانہ جنگی سے مسلم دشمن طاقتوں نے فائدہ اٹھایا۔ انھوں نے اسلامی تنظیموں میں اپنے ایجنٹ داخل کر دیے تاکہ وہ خانہ جنگی کی آگ کبھی سرد نہ ہونے دیں۔ چناں چہ آج لیبیا و نائیجیریا سے لے کر پاکستان و افغانستان تک کئی اسلامی ممالک قتل و فساد کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔ ◆◆◆

تبدیلی زندہ باد

"مجھے اسٹیٹس کو نہیں، تبدیلی چاہیے!"

"بالکل ٹھیک ہوا رحمان ملک کے ساتھ، تمام سیاست دانوں کو اسی طرح ایک ایک کرکے نکال باہر کرنا چاہیے۔"

"نا یہاں پانی ہے نا بجلی۔"

"یہاں سب کرپٹ ہیں!"

"ڈوب مرنا چاہیے ایسے حکمرانوں کو جو عوام کے پیسے پر عیش کر رہے ہیں۔"

"عوام سسک سسک کر زندگی گزارتی اور بھوکوں مرتی ہے۔ یہ اپنے عالیشان گھروں میں آرام کی نیند سوتے ہیں۔"

لوگ سیلاب اور قحط سے مرے جاتے ہیں۔ یہ لیڈر ہیلی کاپٹروں پر سوار بس ایک نظر ڈال، تصویریں بنوا، چلتے بنتے ہیں۔ کیا اسی پاکستان کے لیے ہمارے آبا و اجداد نے قربانیاں دیں؟"

"کیا یہی وہ اسلامی ریاست ہے جس کا خواب اقبال نے دیکھا تھا؟"

"اس ملک میں کہیں قانون کی حکمرانی نہیں، ہر جگہ لوٹ مار مچی ہے۔ کسی کو قانون کا پاس نہیں۔"

"میں احتجاج کروں گا! دھرنا دوں گا! ایک ایک ایم این اے کو گریبان سے پکڑ کر گھسیٹ کے پارلیمنٹ سے باہر لاؤں گا۔ سول نافرمانی کروں گا۔ کوئی بل ادا نہیں کروں گا، نا ہی ٹیکس نہیں دوں گا۔"

"بس ایک بار تبدیلی آجائے پھر دیکھنا، نہیں چلے گا یہ وی آئی پی کلچر! کہیں خاندانی سیاست نہیں چلے گی!"

"سب کو جواب دینا ہوگا۔ سب کا احتساب ہوگا۔"

"کوئی نہیں بچے گا۔ جس جس نے عوام کا حق مارا ہے، قانون شکنی کی ہے سب کا احتساب ہوگا۔"

(ناہید اسرار)

تازہ افسانہ

ہر پل، ہر آن، ہر لمحے

رنگ بدلتی زندگی

وہ فانی اشیا سے دلی لگاؤ رکھتی تھی
مگر ایک معصوم مطالبے نے اُسے
حقیقت ازلی سے روشناس کرا ڈالا

فاطمہ نور صدیقی

کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن سے بے تحاشا محبت ہو جاتی ہے، چاہے وہ بے جان ہی کیوں نہ ہوں۔

☆☆

اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ابا کو دیکھا، پھر کان کھجایا اور پھر انھیں یوں دیکھنے لگی جیسے اس نے غلط سنا ہو۔

"بیٹا! اسے ساتھ لے جانا مشکل ہے۔ آپ کی امی اور ہمارا ارادہ ہے کہ اسے یہیں بیچ دیا جائے۔"

ابا کو یقیناً اس ردعمل کی توقع نہیں تھی۔ وہ بستر پر دو منٹ تک ساکت بیٹھی ابا کو تکتی رہی۔ آخرکار آہستگی سے کھڑی ہوئی۔

"ابا اسے؟" اس نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے بے یقینی سے کہا۔

"جی بیٹا...... آپ کی پڑھائی والی میز کو۔"

"ابا!" مزاحمتی انداز میں بولتے ہوئے اس کی گول گول آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"ارے...... ارے......" ابا گھبرا کر تیزی سے آگے بڑھے اور اسے گلے سے لگا لیا۔

"اسے وہاں لے جانا مشکل ہوگا نا بیٹا!...... ہم وہاں تمھیں ایک نئی میز لے دیں گے۔"

اس جملے سے بیٹی کی تسلی کیا ہوتی، مزید آنسوؤں میں روانی آگئی۔

"نہیں مجھے نئی نہیں چاہیے۔ آپ بس اسے ہی لے چلیے کسی طرح۔" عام طور پر جلد ہر بات ماننے والی بیٹی آج اپنے ابا کے سامنے قطعیت سے کھڑی تھی۔

لاکھ اماں نے سمجھایا، بھائیوں نے زور دیا، بہنوں نے گلے سے لگایا مگر وہ اپنی عزیز از جان میز کے بغیر شہر سے کوچ کرنے پر راضی نہ ہوئی۔ آخرکار ابا نے ہار مان کر اسے نئے شہر بھجوانے کا انتظام کر دیا۔

جن سے محبت ہو، ان کے دیے ہوئے تحفے بھی جان سے پیارے ہوتے ہیں۔ پچھلے سال ہی میٹرک میں پاس ہونے پر یہ میز گھر والوں نے مشترکہ طور پر اسے تحفے میں دی تھی۔ ریڈش کلر اور بھورے رنگ کی یہ نفیس سی میز اسے پہلی نظر ہی میں بھا گئی۔ اوپر بنے خانے سے لے کر نیچے پیر رکھنے والی جگہ تک ہر چیز ابا نے خود ڈیزائن کرائی تھی۔

مومل نے بھی اسے سجانے سنوارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ خانے کے دروازوں پر پڑھائی کا ٹائم ٹیبل اور چھوٹے چھوٹے اقوالِ زریں بڑی خوبصورتی سے لکھ کر لگائے۔ درمیان کے خانے میں کیلنڈر اور گھڑی رکھی گئی۔ پڑھنے والے حصے میں ایک خوبصورت پیالہ قلموں سے بھر کر رکھا گیا۔ ساتھ ساتھ پورے گھر میں بکھری اپنی بے شمار کتابیں سمیٹ کر شیلف میں ترتیب دیں۔

ایک سال گزرنے کے باوجود اس کے جوش و خروش میں فرق نہ آیا۔ وہ خوب زور شور سے اپنی میز کی صفائی ستھرائی کرتی۔ ذرا کسی بہن بھائی نے ترتیب بگاڑنے کی کوشش کی، وہیں اس کا رونا دھونا شروع ہو جاتا۔ اکثر وہ میز کے سامنے رکھی کرسی پر آلتی پالتی مارے بیٹھی نظر آتی۔ اسی لیے جب ابا کا دوسرے شہر تقرر ہوا تو میز بھی انتہائی ضروری سامان کے ساتھ نئے گھر پہنچ گئی۔

......☆......

نئے گھر میں اسے پہلے کے مقابلے میں چھوٹا کمرا ملا۔ لیکن اس کی کھڑکی نے جو چھوٹے سے باغیچے میں کھلتی تھی، خوشی دوبالا کر دی۔ مومل نے فوراً میز کو کھڑکی کے قریب لگوا دیا جہاں سے رنگ برنگ پھولوں اور ہری بھری گھاس سے سجا باغیچہ دکھائی دیتا تھا۔

دن آگے بڑھے، مہینے گزرے، سال کا آخری حصہ شروع ہو گیا۔ ساری باتیں چھوڑ چھاڑ کر وہ پڑھائی میں جت گئی۔ انٹر کے پرچے دینے کے بعد اسے یونیورسٹی کے داخلہ امتحان کی تیاری کرنی تھی۔ کتابوں، میز اور اس کا اب واقعتاً دن رات کا ساتھ تھا۔ کتابیں سامنے پھیلائے کرسی پر وہ اپنے مخصوص انداز میں بیٹھی رہتی۔ جیسے ہی وہ اماں کی محنت سے مزید پھلتے پھولتے باغ پر نظر ڈالتی، دماغ فٹافٹ چالو ہو جاتا۔ جو چیز اسے کسی اور جگہ بیٹھ کر ایک گھنٹے میں یاد ہوتی، وہ وہاں بیس منٹ میں ازبر ہو جاتی۔ ابا کے بقول ان کی بیٹی کا دماغ میز کے ہی کسی کونے میں بند تھا۔

اس کی بے تحاشا محنت رنگ لائی اور انجینئرنگ یونیورسٹی میں داخلہ آرام سے ہو گیا۔ اب خانوں کے دروازوں پہ کہیں کوئی مشکل سوال ٹنگا اور کہیں کوئی فارمولا چپکا ہوتا۔ اس دوران کمرے میں اور بھی تبدیلیاں آئیں کیونکہ وہ فطرتاً تبدیلی پسند تھی۔ کبھی بستر کی جگہ تبدیل کرنا کبھی الماری پر رکھے گل دان کو بدلنا لیکن جو چیز نہیں بدلی وہ میز کی جگہ تھی۔ اماں جو اس کی گھر بھر میں کارگزاریوں سے تنگ آئی رہتیں، اکثر اس بات پر حیرت کا اظہار کرتی تھیں۔

تعلیمی میدان سر کرتے کرتے آخر اس کا آخری سال آ پہنچا۔ اب وہ کافی سمجھدار ہو گئی تھی۔ اپنے شعبے کی ذہین و فطین اور اساتذہ کی نورِ نظر طالب...... سہیلیاں ہنسی مذاق میں اس کی ذہانت کا راز پوچھتیں تو وہ سادگی سے ایک ہی جواب دیتی:

"کوئی بھی کام کرنا ہو تو اپنے اردگرد کے ماحول کو خوشگوار بنا لو، جیسے میں پڑھنے کے لیے اپنی پسندیدہ جگہ کا انتخاب کرتی ہوں۔ یوں دماغ پرسکون ہو کر

میری مدد کرتا ہے۔"

سال ختم ہونے پر اس کی انٹرن شپ شروع ہوگئی۔ دفتر اور گھر کے کاموں میں مصروف ہونے کے بعد فارغ وقت اب کم تھا۔ پھر بھی روزانہ پانچ دس منٹ میز کے ساتھ گزارنے لازمی تھے۔ اور یہی لمحے تھکن اتارنے کے لیے کافی ہوتے۔

☆

شادی کے بعد پاکستان سے دور پانچ سال اس نے دیارِ غیر میں گزارے۔ اس عرصے میں مول نے کافی میزیں بدلی لیکن کبھی وہ لطف نہیں آیا جو ابا کی دی گئی اسٹڈی ٹیبل پر ہاتھ رکھ کر، کرسی پر مزے سے آلتی پالتی مارے کھڑکی سے باہر کے نظارے دیکھنے میں آتا تھا۔

پاکستان واپس آنے کے تین دن بعد اسے اپنے میکے آنے کی فرصت ملی۔ رات کو کھانے کے بعد اسے سونے مہمان خانے بھیج دیا گیا۔ "شاید میرا کمرا صاف نہیں کیا گیا۔" اس نے خود ہی اندازہ لگا لیا۔ صبح اس نے بچوں کو ناشتا وغیرہ کرا کر نانا کے حوالے کیا اور انھیں بغیر بتائے آہستہ روی سے سیڑھیاں چڑھتی اپنے کمرے کی جانب بڑھی۔ دروازے پر وہ ایک انجانے احساس کے تحت یک دم ہچکچا کر رک گئی۔ اندر سے آتی آوازوں نے اسے باور کرا دیا کہ یہ اب اس کا نہیں کسی اور کا کمرا ہے۔ اس نے دل کو ڈپٹتے ہوئے تھوڑے توقف کے بعد دستک دی۔ چند ہی لمحوں بعد دروازہ کھل گیا۔

"ارے پھپھو جانی...... آپ!" اس کا بھتیجا تولیے سے منہ خشک کرتا دروازے میں کھڑا تھا۔

"آیئے نا...... باہر کیوں کھڑی ہیں۔" اسے اگر صبح صبح پھپھو کو اپنے کمرے میں دیکھ کر حیرت ہوئی تھی تو اس نے اظہار نہیں کیا۔

مول نے خواب کی سی کیفیت میں اپنے کمرے میں قدم رکھا...... نظریں ہر شے کو جذب کر رہی تھیں لیکن

تھوڑی ہی دیر بعد اسے یقین آ گیا کہ اب یہ واقعی کسی اور کا کمرا ہے۔ فرنیچر سے لے کر قالین تک ہر چیز بدل چکی تھی سوائے......

یک دم اس کا دل خوشی سے بھر گیا۔ اس کی میز اب بھی اپنی جگہ موجود تھی۔ بھتیجا کچھ کہہ رہا تھا، لیکن اس کا دھیان پوری طرح اپنی میز کی طرف تھا۔ آگے بڑھ کر مول نے پیار سے اس کی سطح پر ہاتھ پھیرا تو گرد کی تہ نے استقبال کیا...... جیسے کئی دن سے کسی نے میز کی طرف توجہ نہ دی ہو۔ ماند پڑتے خانوں کے دروازے بھی کسی قسم کی آرائش سے خالی تھے۔ کیلنڈر پر ایک مہینے پہلے کا صفحہ کھلا ہوا تھا، پیالے میں اب صرف ٹوٹے پھوٹے قلم پڑے تھے۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر کرسی کھینچی، لیکن یہ کیا...... یہ تو کوئی سخت سی کرسی تھی۔ وہ سوالیہ انداز میں اپنے بھتیجے کی جانب مڑی، جو اس کے تاثرات دیکھے بغیر کہہ رہا تھا

"امی ابو یہ میز یہاں سے ہٹانے کی اجازت ہی نہیں دیتے، خاص طور پر نانا تو ایک انچ بھی ہلانے پر سخت ناراض ہوتے ہیں۔ اب دیکھیں نہ پھپھو جانی! یہ تو زیادتی ہے۔ جب یہ آپ کا کمرا تھا تو آپ نے اپنے طریقے سے سیٹ کیا۔ اب تو میرا حق ہے نا کہ یہ میز یہاں سے ہٹا کر اس کی جگہ کچھ اور رکھ لوں۔ پلیز...... پلیز آپ بابا سے میری سفارش کر دیں گی نا؟"

پھپھو پیارے بھتیجے کے پُرامید چہرے پہ نظر ڈال کر مسکرا دیں، ساتھ ساتھ آنسو چھپانے کے لیے تیزی سے رخ بدل کر سر ہلا دیا۔

"ظاہر ہے! ان فانی چیزوں کی کون کب تک حفاظت کر سکتا ہے چاہے آپ کو ان سے کتنی ہی محبت کیوں نہ ہو۔" مول نے سوچا اور کھڑکی سے باہر نظر ڈالی جہاں اب صرف کیاریاں رہ گئی تھیں۔ بقیہ حصے کو پختہ کر کے گیراج بنا دیا گیا تھا۔ ہرا بھرا باغیچہ اب قصۂ پارینہ بن چکا تھا۔

◆◆◆

ثابت اناج میں پایا جانے والا

گلوٹین آپ کا دشمن تو نہیں؟

چھوٹی آنت کو گلا سڑا دینے والے ایک پروٹینی مادے کا بیان

رضیہ جمیل

ایک سال پہلے کی بات ہے، سولہ سالہ رضیہ چنبل (ایگزیما) کا شکار ہوگئی۔ والدین نے علاج کرایا مگر مرض دور نہ ہوا۔ ایک دن رضیہ کے ماموں امریکا سے آ گئے۔ وہ ماہر امراض جلد تھے۔ انھیں پہلے ہی معلوم تھا کہ بھانجی چنبل کا نشانہ بنی ہوئی ہے۔

ماموں تجربے کار معالج تھے، معائنہ کیا، تو جان گئے کہ جلد کی یہ بیماری رضیہ کو کیسے چمٹی۔ دراصل وہ ایک نایاب مرض، سیلیک (Celiac) میں مبتلا تھی۔ یہ مرض گندم، جو اور رئی (Rye) میں پائے جانے والے ایک پروٹین کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اس مرض کی خاص نشانی خارش ہونا یا چنبل چمٹ جانا ہے۔

گندم کے دانے میں پایا جانے والا پروٹین "گلوٹین (Gluten) کہلاتا ہے۔ خود یہ پروٹین دراصل دو پروٹینی مادوں، گلیاڈین (Gliadin) اور گلوٹینین (Glutenin) سے مل کر بنتا ہے۔

جب گندم یا جو کا آٹا پانی میں ملایا جائے، تو وہ چپچپا ہو جاتا ہے۔ ایسا گلوٹین کی وجہ ہی سے ہوتا ہے۔ جب اس آٹے کی روٹی ہم تناول کریں، تو وہ غذائی نالی سے ہوتی نظام ہضم میں جا پہنچتی ہے۔

آنتوں میں گندم کا ہمارے مامون نظام (Immune System) کے خلیوں سے آمنا سامنا ہوتا ہے۔ یہ خلیے ہمارے جسم پر حملہ آور جراثیموں کا مقابلہ کرتے اور ہمیں بیماریوں سے محفوظ رکھتے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ کئی مرد و زن میں یہ مامونی خلیے گلیاڈین پروٹین کو بھی جرثومہ یا حملہ آور سمجھتے ہیں۔ چناں چہ وہ گلیاڈین پر دھاوا بول دیتے ہیں۔ یوں انسان جسمانی عارضے کا شکار ہو جاتا ہے۔

طبی اصطلاح میں درج بالا خلل گلوٹین حساسیت (Sensitivity) کہلاتا ہے۔ جب یہ خلل شدت اختیار کر جائے، تو سیلیک مرض جنم لیتا ہے۔ اس مرض میں مامونی خلیے گلوٹین کے علاوہ چھوٹی آنت کے خامروں (Enzymes) پر بھی حملہ کر دیتے ہیں۔ گویا وہ انھیں بھی جراثیم سمجھتے ہیں۔

سیلیک ایک خطرناک مرض ہے، کیونکہ یہ رفتہ رفتہ چھوٹی آنت کو گلا سڑا دیتا ہے۔ چھوٹی آنت ہمارے نظام ہضم کا اہم حصہ ہے۔ خوراک کی غذائیت (وٹامن، معدنیات اور دیگر اجزا) یہیں جذب ہو کر ہمارے مختلف جسمانی اعضا کی طرف جاتی اور انھیں قوت فراہم کرتی ہے۔

چھوٹی آنت کے گلنے سڑنے کی وجہ سے جب ہمیں مطلوبہ وٹامن اور معدنیات نہ ملیں، تو ہم متفرق بیماریوں کا شکار ہونے لگتے ہیں۔ مثلاً تے آنا، دست، قبض، خون کی کمی، جسمانی کمزوری، اپھارہ، تھکن اور سستی طاری رہنا۔ وجہ یہ ہے کہ گلوٹین والی غذا کھاتے ہی دماغ تھکن محسوس کرنے لگتا ہے۔

سیلیک مرض کی شناخت صرف خون کے ٹیسٹ اور بائیوپسی (Biopsy) سے ممکن ہے۔ خون کے ٹیسٹ میں غیر معمولی مامونی ردعمل (Abnormal immune response) سے وابستہ ضد جسم مادے (Antibodies) شناخت کیے جاتے ہیں۔ بعدازاں چھوٹی آنت کی بائیوپسی ہوتی ہے تاکہ معلوم ہو سکے، آیا وہ گل سڑ رہی ہے؟

خون کے ٹیسٹ سے صرف تجربے کار ڈاکٹر ہی جان سکتا ہے کہ کیا مریض سیلیک مرض میں مبتلا ہے؟ یہی وجہ ہے، پاکستان میں چنبل، تھکن و سستی، قبض اور جسمانی کمزوری وغیرہ کا شکار مریض ڈاکٹر، حکیموں اور پیروں کے در پر چکر لگا لگا کر تھک جاتے ہیں مگر وہ اپنی بیماری سے چھٹکارا حاصل نہیں کر پاتے۔

کئی پاکستانیوں کو اس وقت سیلیک مرض کا علم ہوا جب انھوں نے گندم یا جو کھانا چھوڑی۔ چناں چہ گلوٹین کے بغیر والی غذائیں کھانے سے رفتہ رفتہ چھوٹی آنت درست ہو جاتی اور سیلیک مرض جاتا رہتا۔ یوں انھیں تندرستی کی بیش بہا نعمت نصیب ہو جاتی۔ درحقیقت گندم، جو اور رئی سے پرہیز ہی اس مرض سے نجات پانے کا بہترین طریقہ ہے۔

نکتے کی بات

مغربی دنیا میں ایک عشرے کے دوران یہ بات مقبول ہوئی کہ گلوٹین (یعنی گلیاڈین) مرد و زن کو سیلیک مرض کا نشانہ بناتا ہے۔ چناں چہ وہاں باقاعدہ "گلوٹین فری" غذائیں وجود میں آ چکیں۔ یہ غذائیں خاصی مہنگی ہیں، اس لیے ہر کس و ناکس انھیں نہیں خرید سکتا۔

دوسرا عجوبہ یہ سامنے آیا کہ جو لوگ سیلیک مرض میں مبتلا نہیں تھے، وہ بھی گندم اور جو سے پرہیز کرنے لگے۔ چناں چہ اب ڈاکٹر خبردار کر رہے ہیں کہ وہ گندم و جو سے منہ نہ موڑیں۔

وجہ یہ ہے کہ گندم، جو اور دیگر ثابت اناج انسان کو اہم وٹامن اور معدنیات مثلاً وٹامن بی، فولاد اور ریشہ فراہم کرتے ہیں۔ چناں چہ یہ ثابت اناج ہمیں امراض قلب، ذیابیطس اور سرطان کی چند اقسام سے بچاتا ہے۔ اسی لیے ڈاکٹر تجویز کرتے ہیں کہ انسان روزانہ ۵۰ فیصد کاربوہائیڈریٹ ثابت اناج سے حاصل کرے۔

درج بالا حقائق سے عیاں ہے کہ سیلیک مرض میں مبتلا مرد و زن گندم و جو سے بچ کر اپنی صحت بہتر بنا سکتے ہیں۔ لیکن دیگر لوگوں کو ان غذاؤں سے پرہیز نہیں کرنا چاہیے۔

اگر آپ تھکن، جسمانی کمزوری، قبض وغیرہ کا شکار ہیں تو کم از کم ایک ماہ گندم اور جو سے دور رہیے۔ اگر آپ صحت میں بہتری محسوس کریں، تو یہ اس امر کی نشانی ہے کہ آپ سیلیک مرض میں مبتلا ہیں۔ اگر صحت بہتر نہ ہو، تو وجوہ کچھ اور ہوں گی۔

امریکا اور برطانیہ میں طبی سائنس دان گلوٹین پر مزید تحقیق کر رہے ہیں۔ کچھ تحقیقات سے افشا ہوا ہے کہ غذا میں گلوٹین کی زیادتی نقصان دہ ہے۔ تب یہ پروٹین مختلف دماغی بیماریاں پیدا کرتا ہے۔ نیز انسان اس کا عادی ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے، جو لوگ بہت زیادہ روٹیاں کھائیں، وہ پھر ان کے بغیر رہ نہیں سکتے۔ روٹی کھا کر ہی ان کا پیٹ بھرتا ہے۔

◆◆◆

بوڑھا کرنے والی پانچ وجوہ

یہ دیکھا گیا ہے کہ انسان کتنا ہی نوجوان ہو، بعض کیفیات اسے بوڑھا بنا دیتی ہیں۔ حتیٰ کہ وہ دیکھنے میں بھی اصل عمر سے بڑا نظر آتا ہے۔ ان کیفیات میں سرفہرست ذہنی و جسمانی دباؤ (Stress) ہے۔

ماہرین طب نے تحقیق کے بعد دریافت کیا ہے کہ جو مرد و زن دور جدید کی تیز رفتار زندگی سے ہم آہنگ نہ ہو سکیں، وہ دباؤ کا نشانہ بن کر جلد بوڑھے ہونے لگتے ہیں۔ رفتہ رفتہ دباؤ میں مبتلا انسان مختلف بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ یوں موت ذہنی و جسمانی طور پر صحت مند انسانوں کی نسبت اسے جلد دبوچ لیتی ہے۔

لہٰذا بڑھاپے سے بچنے کی خاطر دباؤ سے بچیے اور معمول کی زندگی گزاریے۔ یوں بدن کا خلویاتی نظام بھی تادیر چلتا ہے۔

جدید تحقیق سے ایک اور حیرت انگیز انکشاف ہوا۔ وہ یہ کہ جو شخص میٹھی اشیا زیادہ کھائے، تمباکو نوشی کرے اور دھوپ میں زیادہ رہے، اس کے چہرے پر بہت جلد جھریاں پڑ جاتی ہیں۔ چناں چہ وہ عمر سے زیادہ بڑا نظر آتا ہے۔

وجہ یہ ہے کہ چینی والی غذائیں زیادہ کھائی جائیں، تو جلد تشکیل دینے والے پروٹینی ریشے..... کولاجن اور ایلاسٹن خراب ہو جاتے ہیں۔ خوش قسمتی سے اگر میٹھی اشیا کھانا کم کیا جائے، تو جلد کو پہنچنے والا نقصان ختم کرنا ممکن ہے۔

اومیگا تھری (Omega-3) چکنائی (Fats) کے انسان دوست تیزاب ہیں۔ یہ تیزاب مچھلی کے تیل، اخروٹ اور السی کے بیجوں میں ملتے ہیں۔ ان تیزابوں کی خاصیت یہ ہے کہ ہمیں بڑھاپے سے بچاتے ہیں۔ اسی لیے جو لوگ ہفتے میں دو تین بار مچھلی کھائیں، وہ نہ کھانے والوں کی بہ نسبت جوان نظر آتے ہیں۔ یہ تیزاب دماغ اور دل کے لیے بھی مفید ہیں۔

نوجوانی میں انسان جسمانی تکالیف کی پروا نہیں کرتا۔ لیکن جوں جوں عمر گزرے، عضلات میں لچک ختم ہوتی اور تناؤ آ جاتا ہے۔ چناں چہ لچک برقرار رکھنے کے لیے روزانہ ورزش ضرور کیجیے۔ ورزش انسان کو بڑھاپے سے بچاتی اور جوان رکھتی ہے۔

ایک نیا طبی انکشاف یہ ہے کہ دھوپ میں بہت سا وقت گزارنا بھی بڑھاپا لے آتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ سورج کی بالائے بنفشی شعاعیں جلد کی لچک (الاسٹین) ختم کر ڈالتی ہیں۔ اس لیے تیز دھوپ میں رہنے سے بچیے۔ کوئی ضروری کام کرنا ہے، تو دھوپ سے بچنے کا اہتمام کیجیے، مثلاً ایسی ٹوپی پہنیں جس کا سایہ چہرے کو ڈھک لے۔

مندمتہ موزیں۔

وجہ یہ ہے کہ گندم، جو اور دیگر ثابت اناج انسان کو اہم وٹامن اور معدنیات مثلاً وٹامن بی، فولاد اور ریشہ فراہم کرتے ہیں۔ چناں چہ یہ ثابت اناج ہمیں امراض قلب، ذیابیطس اور سرطان کی چند اقسام سے بچاتا ہے۔ اسی لیے ڈاکٹر تجویز کرتے ہیں کہ انسان روزانہ ۵۰ فیصد کاربوہائیڈریٹ ثابت اناج سے حاصل کرے۔

درج بالا حقائق سے عیاں ہے کہ سیلیک مرض میں مبتلا مرد و زن گندم و جو سے بچ کر اپنی صحت بہتر بنا سکتے ہیں۔ لیکن دیگر لوگوں کو ان غذاؤں سے پرہیز نہیں کرنا چاہیے۔

اگر آپ تھکن، جسمانی کمزوری، قبض وغیرہ کا شکار ہیں تو کم از کم ایک ماہ گندم اور جو سے دور رہیے۔ اگر آپ صحت میں بہتری محسوس کریں، تو یہ اس امر کی نشانی ہے کہ آپ سیلیک مرض میں مبتلا ہیں۔ اگر صحت بہتر نہ ہو، تو وجوہ کچھ اور ہوں گی۔

امریکا اور برطانیہ میں طبی سائنس دان گلوٹین پر مزید تحقیق کر رہے ہیں۔ کچھ تحقیقات سے افشا ہوا ہے کہ غذا میں گلوٹین کی زیادتی نقصان دہ ہے۔ تب یہ پروٹین مختلف دماغی بیماریاں پیدا کرتا ہے۔ نیز انسان اس کا عادی ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے، جو لوگ بہت زیادہ روٹیاں کھائیں، وہ پھر ان کے بغیر رہ نہیں سکتے۔ روٹی کھا کر ہی ان کا پیٹ بھرتا ہے۔ ◆◆◆

بوڑھا کرنے والی پانچ وجوہ

یہ دیکھا گیا ہے کہ انسان کتنا ہی نوجوان ہو، بعض کیفیات اسے بوڑھا بنا دیتی ہیں۔ حتیٰ کہ وہ دیکھنے میں بھی اصل عمر سے بڑا نظر آتا ہے۔ ان کیفیات میں سرفہرست ذہنی و جسمانی دباؤ (Stress) ہے۔

ماہرین طب نے تحقیق کے بعد دریافت کیا ہے کہ جو مرد و زن دور جدید کی تیز رفتار زندگی سے ہم آہنگ نہ ہو سکیں، وہ دباؤ کا نشانہ بن کر جلد بوڑھے ہونے لگتے ہیں۔ رفتہ رفتہ دباؤ میں مبتلا انسان مختلف بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ یوں موت ذہنی و جسمانی طور پر صحت مند انسانوں کی نسبت اسے جلد دبوچ لیتی ہے۔

لہٰذا بڑھاپے سے بچنے کی خاطر دباؤ سے بچیے اور معمول کی زندگی گزاریے۔ یوں بدن کا خلویاتی نظام بھی تادیر چلتا ہے۔

جدید تحقیق سے ایک اور حیرت انگیز انکشاف ہوا۔ وہ یہ کہ جو شخص میٹھی اشیا زیادہ کھائے، تمباکو نوشی کرے اور دھوپ میں زیادہ رہے، اس کے چہرے پر بہت جلد جھریاں پڑ جاتی ہیں۔ چناں چہ وہ عمر سے زیادہ بڑا نظر آتا ہے۔

وجہ یہ ہے کہ چینی والی غذائیں زیادہ کھائی جائیں، تو جلد تشکیل دینے والے پروٹینی ریشے...... کولاجن اور ایلاسٹین خراب ہو جاتے ہیں۔ خوش قسمتی سے اگر میٹھی اشیا کھانا کم کیا جائے، تو جلد کو پہنچنے والا نقصان ختم کرنا ممکن ہے۔

اومیگا تھری (Omega-3) چکنائی (Fats) کے انسان دوست تیزاب ہیں۔ یہ تیزاب مچھلی کے تیل، اخروٹ اور السی کے بیجوں میں ملتے ہیں۔ ان تیزابوں کی خاصیت یہ ہے کہ ہمیں بڑھاپے سے بچاتے ہیں۔ اسی لیے جو لوگ ہفتے میں دو تین بار مچھلی کھائیں، وہ نہ کھانے والوں کی بہ نسبت جوان نظر آتے ہیں۔ یہ تیزاب دماغ اور دل کے لیے بھی مفید ہیں۔

نوجوانی میں انسان جسمانی تکالیف کی پروا نہیں کرتا۔ لیکن جوں جوں عمر گزرے، عضلات میں لچک ختم ہوتی اور تناؤ آ جاتا ہے۔ چناں چہ لچک برقرار رکھنے کے لیے روزانہ ورزش ضرور کیجیے۔ ورزش انسان کو بڑھاپے سے بچاتی اور جوان رکھتی ہے۔

ایک نیا طبی انکشاف یہ ہے کہ دھوپ میں بہت سا وقت گزارنا بھی بڑھاپا لے آتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ سورج کی بالائے بنفشی شعائیں جلد کی لچک (الاسٹین) ختم کر ڈالتی ہیں۔ اس لیے تیز دھوپ میں رہنے سے بچیے۔ کوئی ضروری کام کرنا ہے، تو دھوپ سے بچنے کا اہتمام کیجیے، مثلاً ایسی ٹوپی پہنیے جس کا سایہ چہرے کو ڈھک لے۔

تاریخ کے ہزارہا اسرار سموئے ہوا

قدیم ترین شہروں میں سے ایک اسلامی الف لیلوی نگر کا ادبی رنگ میں رنگا منفرد سفرنامہ

مستنصر حسین تارڑ

تہران میں ایک مائی نے مجھے نہایت شفقت سے مشورہ دیا تھا کہ پتر دمشق میں عبدالکریم الہندی کے ہوٹل خندق الکبیر میں قیام کرنے پر گھر کا آرام ملے گا۔ چناں چہ میں نے بس سے اترتے ہی ایک راہگیر سے خندق الکبیر کا راستہ پوچھا۔ وہ صاحب اپنا راستہ بھول کر میرے ساتھ چلنے لگے۔ پہلے مرکزی چوک میں کھڑے ہو کر ریڑھی پر بکنے والا سیاہ رنگ کا بدمزہ اور اُبکائیاں لانے والا شربت بصد اصرار پلایا اور پھر خندق الکبیر تک میرا ساتھ دیا۔

عبدالکریم ادھیڑ عمر کا شخص اور الہندی ہی تھا۔ مگر مائی کے حوالے کو اس نے چنداں اہمیت نہ دی، بس سر ہلاتا اور ایک جہازی سائز کا حقہ گڑگڑاتا رہا۔ کاؤنٹر کے پیچھے بھارتی اور پاکستانی اداکاروں کی تصویریں کھیوں کی آلائش سے سیاہ ہو رہی تھیں۔ ان سے ہٹ کر بی بی زینبؓ کے روضے کی ایک تصویر آویزاں تھی جس کے عین اوپر زیرو کا بلب روشن تھا۔ کاؤنٹر کے سامنے بوسیدہ بدبو چھوڑتے قالین پر چار پانچ رعشہ زدہ کرسیاں پڑی تھیں جہاں چند حضرات سر جوڑے کھسر پھسر کر رہے تھے۔ ہو سکتا ہے وہ بلند آواز میں گفتگو کر رہے ہوں مگر ہوٹل کی بوسیدگی میں گونجتی ریشماں اور نور جہاں کی آوازوں کے شور میں وہ کھسر پھسر کرتے ہی لگے۔

غسل خانے میں نہا ہو کر جب میں باہر نکلا تو مسجد اُمیہ دیکھنے کا ارادہ تھا۔ مگر پہلے اپنے آپ کو دمشق کے

ساتھ ہم آہنگ کرنے کے لیے شہر کی آوارہ گردی کرنے لگا۔ اس کی عمارتیں اور ماحول کچھ کچھ خزاں کے تانبے ایسے رنگ کی گھلاوٹ رکھتا تھا۔ اس کے باسیوں نے مجھے دوست جانا...... مجھے ایک بھی شامی ایسا نہ ملا جس سے میں نے راستہ پوچھا اور اس نے اپنا کام کاج بھلا کر کھلی مسکراہٹ کے ساتھ میری راہنمائی نہ کی۔

ایک قریباً عجلت میں جاتے ہوئے شامی کو روک کر جب میں نے کچھ دریافت کیا تو وہ یکدم شانت ہو کر مجھ سے گفتگو میں محو ہو گیا۔ پھر گھڑی دیکھ کر یک دم بڑبڑا اٹھا ''اوہ! مجھے اس وقت صدر کے دفتر ہونا چاہیے تھا۔'' اپنی کار میں بیٹھتے ہوئے اس نے مسکراہٹ برقرار رکھتے ہوئے کہا ''میں دمشق کا اسسٹنٹ اٹارنی جنرل ہوں، وہ سامنے میرا دفتر ہے، ضرور آنا۔''

سو یہ شہر اور اس کے باسی مجھے اپنوں کی طرح ہی نہ ملے بلکہ میرے اپنے ہو گئے۔ موسم پاکستان کے مقابلے میں گرم تو نہ تھا مگر پیدل چلنے سے پیاس کا احساس ہوا۔ غلطی سے وہی سیاہ شربت پینے کو ملا جو بخار کے مکسچر جیسا تھا مگر جسے شامی برادران نہایت اہتمام سے نوش جان کر رہے تھے۔ پھر کھانے کے طور پر ایک سانڈوچ فلافل کھایا جو چنوں کی دال کا ذائقہ لیے ہوا تھا۔ آخر سوق الحمیدیہ کا رخ کیا جس کے پہلو میں دنیا کی قدیم ترین مسجدوں میں سے ایک جامع اُمیہ واقع ہے۔

مسجد اُمیہ کی سیر

سوق الحمیدیہ وہ جگہ ہے جسے اکڑے ہوئے انگریز صاحب بہادر اپنی زبان میں ''دی گرینڈ بزار'' کا نام دیتے ہیں۔ تہران اور استنبول کے بازاروں کے مانند ایک ایسا وسیع شاپنگ سینٹر جس کی درجنوں بل کھاتی گلیوں کو مشرقی سورج کی تمازت سے محفوظ رکھنے کے لیے ڈھک دیا گیا ہے۔ بازار کے خاتمے پر ایک رومی معبد کے کھنڈر تھے اور آبی ذخیرے کی چند محرابیں اور ستون، درمیان میں ایک گلی تھی۔ سامنے مسجد اُمیہ کا بلند دروازہ نظر آیا جس کی چوکھٹ پر بیٹھ کر زائرین اپنے جوتے اتار رہے تھے۔

مسجد اُمیہ میں خون تو ہے مگر حسن نہیں۔ آنکھوں کی زبان قدامت کے ذائقے سے آشنا ہوتی مگر خوبصورتی و حلاوت کی خواہش ناتمام رہتی ہے۔ تین فصیل نما دیواروں کے ساتھ بلند برآمدے ہیں۔ درمیان میں صحن اور چوتھی جانب مسجد کی عمارت ہے۔ برآمدوں میں قدیم بازنطینی نقاشی کے نمونے تھے جن میں درختوں اور بیل بوٹوں کے درمیان جنگلی جانوروں کی شکلیں بھی شامل ہیں۔ بنو اُمیہ شکار کے دلدادہ تھے اور یہ اشکال اسی شوق کی غمازی کرتی ہیں۔

اس عمارت میں اگر اذان بلند نہ ہو تو اس کی روح کسی رومی معبد یا کلیسا کے قریب آ جاتی ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میں جب دمشق فتح ہوا تو وہاں سینٹ جان دی بپٹسٹ کا کلیسا اعظم تھا۔ اسے مسلمانوں اور عیسائیوں نے مشترکہ عبادت گاہ کے لیے مخصوص کر لیا۔ مسلمان دائیں جانب سے داخل ہوتے اور عیسائی بائیں طرف سے...... ۷۰۵ء میں ولید اول نے پورا کلیسا خرید کر مسجد کی تعمیر شروع کر دی۔ ایرانی، ہندوستانی، یونانی اور شامی کاریگروں نے پتھروں کے ٹکڑے جوڑ کر مناظر قدرت تخلیق کیے۔ سونے کے میورل بنائے گئے۔ سات برس کے عرصے میں مسجد امیہ تکمیل کو پہنچی۔

مسجد کے صحن میں شاید دنیا کا قدیم ترین کنواں

واقع ہے۔ روایت کے مطابق حضرت عیسیٰؑ کی آمد کا استقبال کرنے کی خاطر عیسائی اسی کنوئیں کے پانی سے بپتسما کیا کرتے تھے۔ ہمارے لیے حضرت یحییٰؑ اور عیسائیوں کے لیے سینٹ جان دی بپٹسٹ کا مزار بھی مسجد کے عین درمیان واقع ہے۔ میں اس سے پیشتر استنبول کے توپ کاپی میوزیم میں اس پیغمبر خدا کا پنجہ دیکھ چکا تھا جو سونے کی تاروں سے جوڑا گیا ہے۔ مسجد کے اندر خاموشی تھی۔ عبادت گزاروں کے جھکے ہوئے سر، ہلتے ہونٹ، حضرت یحییٰؑ کے مزار کی جالی سے آسودگی حاصل کرتے ہاتھ! کون سا ہاتھ مسلمان ہے اور کون سا عیسائی، یہ معلوم نہ ہوتا۔

مرکزی فانوس کے نیچے پُروقار سراپے کے مالک ایک باریش بزرگ آس پاس مؤدب بیٹھے لوگوں سے محو گفتگو تھے۔ میں بھی ان کے قریب بیٹھ گیا۔ لوگ مذہب کے علاوہ اپنے ذاتی مسائل کا حل بھی دریافت کر رہے تھے۔ محفل کے خاتمے پر انھوں نے سب کے لیے دعا کی۔ میں نے آگے بڑھ کر ہاتھ ملایا تو انھوں نے پاکستانی ہونے کا سن کر بے حد شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور میرے لیے خصوصی دعا مانگی۔

کربلا کے اسیر

کچھ دیر ستانے کے بعد میں صحن میں آ گیا جہاں دھوپ ڈھل رہی تھی۔ اسی صحن میں خلیفہ سلمان بن عبدالملک نے فاتح اندلس، موسیٰ بن نصیر کا شاہانہ استقبال کیا تھا۔ پھر چند ہی روز بعد معزول کر کے مسجد کے باہر ایک ستون سے باندھ دیا۔ سامنے وہ مینار ہے جس پر ایک روایت کے مطابق حضرت عیسیٰؑ کا نزول ہو گا۔ صحن کے درمیان وہ گنبد ہے جسے خزانہ کہا جاتا ہے۔

رومی طرز کے بلند اور پُرہیبت برآمدے میں چلتے ہوئے ایک شامی طالب علم، قیس میرا دوست بن گیا۔ وہ امتحانوں کی تیاری کے سلسلے میں وہاں سکون سے پڑھنے آیا تھا۔ وہ مجھے مسجد کے اس حصے میں لے گیا جس سے متصل اس ملامت کائنات کا محل استادہ تھا جسے یزید کہتے ہیں۔ ایک پرانی وضع کی بیل گاڑی برآمدے میں کھڑی تھی۔ پہیے لکڑی کے تھے۔ زائرین اسے چھو اور کچھ چوم رہے تھے۔

''اس بیل گاڑی پر کربلا کے اسیروں کو دمشق لایا گیا تھا۔'' قیس نے بتایا۔

''لیکن یہ تیرہ سو برس پرانی تو نہیں لگتی۔'' پہیوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے میں نے حیرت سے کہا۔ وہ بالکل ہمارے ہاں کے گڈے کی طرح تھی۔

''ہاں مجھے بھی شک ہے مگر ہمارے ہاں روایت ہے۔ اور چھت سے لٹکتا یہ پنجرا اسیران کربلا کو اذیت دینے کے لیے استعمال ہوا تھا۔''

برآمدے کے خاتمے پر دائیں ہاتھ ایک بند کمرا تھا جس کی دیواروں میں ایک چکور جالی نصب تھی۔ زائرین اسی جالی کو چھوتے، آنکھوں سے لگاتے اور ایک جانب ہو کر آہ و زاری کرنے لگتے۔ کچھ اس کے سامنے ہاتھ سینے پر باندھے تصویریں اتروا رہے تھے...... پرچم سیاہ تھے اور لبادے بھی، ماتم کا ماحول بنا ہوا تھا۔ یہاں کچھ ضرور ہوا تھا چکور جالی کے اوپر کوئی عبارت رقم تھی۔

میں نے قیس کی طرف دیکھا، اس نے سر جھکا لیا پھر بولا ''یہاں...... یہاں شہید کربلا حضرت امام حسینؓ کا سر مبارک رکھا گیا تھا۔''

میرے حواس سناٹے میں آ کر سن ہو گئے۔ ہاں، یہاں کچھ ہوا تھا۔

''ان دنوں مسجد کے ساتھ شاہی محل کی دیواریں

تھیں، یزید کے محل کی دیواریں۔ یہ جگہ جہاں ہم کھڑے ہیں، قید خانہ تھی جس میں اسیرانِ کربلا کو رکھا گیا۔ اور اس مقام پر جہاں جالی ہے امامؓ کا سر ایک طشتری میں نمائش کے لیے رکھا گیا۔"

"کیا یزید کا محل باقی ہے؟"

"نہیں...... کیسے باقی رہتا...... یزید بھی باقی نہیں رہا۔ اس کی قبر پر اب چونے کی ایک تپتی ہوئی بھٹی ہے جو دن رات جلتی رہتی ہے۔" اور جس مقام پر حسینؓ کے سر نے لمحہ بھر کے لیے آرام کیا، وہ جگہ بوسوں سے تر رہتی ہے۔ ہاں یہاں کچھ ہوا تھا۔ ؎

سر داد نہ داد دست در دست یزید

قرطبہ کی یاد

کچی دیوار تنگ گلی کے آخر تک چلی جا رہی تھی جہاں محراب کے نیچے بلند کواڑوں والا ایک دروازہ تھا۔ میں نے آہستہ سے دستک دی اور انتظار کرنے لگا۔ مسجد امیہ سے نکل کر میں دمشق کے پرانے شہر چلا آیا تھا۔ پچھلے تین گھنٹوں سے ایک ایسے شخص کی طرح جسے کہیں پہنچنے کی جلدی نہیں ہوتی، سستی سے قدم رکھتا، منہ اٹھائے پرانے گھروں اور کچی دیواروں میں نصب منقش کھڑکیوں کا مشاہدہ کرتا، قدیم شہر کے باوقار باسیوں کو تکتا چل رہا تھا۔ دائیں بائیں جو بھی گلی نکلتی، کسی بھی کوچے کا آغاز ہوتا' میں فرمانبرداری سے بلا سوچے سمجھے اپنا رخ اُدھر ہی طرف موڑ لیتا۔ لیکن اس بے جہت آوارگی نے بے حد تھکا دیا۔ چناں چہ پیاس کی شدت نے مجھے ایک دروازے پر دستک دینے کو اکسایا تھا۔

تھوڑی دیر بعد کسی آہنی کُنڈے کی سخت آواز آئی اور کواڑ چرچراتے ہوئے کھل گئے۔ ایک خیمہ نما چوغے میں کھڑے شامی نے بصد حیرت میرا معائنہ کیا۔ میں نے چلو منہ کو لگا کر "العطش" پکارا اور وہ مسکراتا ہوا واپس چلا گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازے کے اندر جھانکا۔

مجھے افسوس ہوا کہ آخر اس شامی کو کیا ہو گیا، اس نے مجھے اندر آنے کا کیوں نہیں کہا...... دنیا جہاں سے کٹا ہوا ایک صحن تھا، بلند دیواروں کی تہ میں بے ترتیب جھاڑیاں اور ان کے درمیان خاموشی سے چلتا ایک فوارہ! دیواروں پر رنگین گملے ٹنگے ہوئے تھے جن سے لٹکتی بیلیں درختوں سے جھولتے بندروں کی طرح آہستہ آہستہ ہل رہی تھیں۔ نیلی محرابیں اور بند کھڑکیاں۔

یہ صحن مجھے آشنا سا لگا۔ یہ آشنائی چھے برس پیشتر قرطبہ کی ایک گلی میں ہوئی تھی جس کے ہر مکان کے اندر یہی صحن تھا، صرف اس کا نام وہاں "پاتیو" تھا۔ پرانے قرطبہ اور دمشق کے اس حصے کو اگر پہلو بہ پہلو رکھ دیا جائے تو اس میں چلنے والے کو کسی تبدیلی کا احساس نہ ہو کیونکہ اصل میں دونوں ایک ہیں۔ جنگ عظیم میں تباہ شدہ تاریخی شہروں کو جس طرح پرانے نقشوں کی مدد سے ہوبہو دوبارہ تعمیر کر لیا گیا تھا' کچھ اسی طرح بنو امیہ نے اپنے کھوئے وطن، دمشق کو اندلس کی نئی سرزمین پر قرطبہ کے روپ میں ڈھال دیا۔

مسجد قرطبہ بھی مسجد امیہ کے نقشے پر تعمیر کی گئی اگرچہ یہ نقل خوبصورتی میں اصل کو ماند کر گئی۔ دمشق کے باغ رصافہ کی نقل قرطبہ کے باغ رصافہ کی صورت میں ہوئی۔ حویلیاں، فوارے اور قصر اس طرح نئے شہر میں بلند ہوئے کہ اس کے آسمانی منظر پر دمشق کا دھوکا ہونے لگا۔ کھجور کے پودے دیکھ کر شام کی یاد میں آہیں بھرنے والے بنی امیہ انہی گلی کوچوں سے نکلے تھے۔ قرطبہ کے بعد اب میں دمشق میں تھا اور یوں ایک آوارہ گرد کو بنو امیہ پر فوقیت حاصل ہوئی کہ وہ ان کے دونوں گھروں کی خوبصورتی کا مشاہدہ بن گیا۔

لمبے چوغے والا شامی برآمدے میں سے نکل رہا تھا۔ اس کے ہمراہ ایک ملازم طشتری اٹھائے چلا آیا۔ یہاں بھی مجھے سادہ پانی کے بجائے وہی سیاہ شربت پینے کو ملا۔ انکار کیسے کرتا، صبر کا گھونٹ بھر کر پی گیا۔ میں نے شکریہ ادا کرنے کے بہانے ایک مرتبہ پھر صحن میں جھانکا مگر گھر کا مکین سنجیدہ مسکراہٹ کے ساتھ کواڑ پر ہاتھ رکھے کھڑا رہا۔ میں پیچھے ہٹا تو اس نے دروازہ بند کر کر قرطبہ کو میری نظروں سے اوجھل کر دیا۔

قہوہ خانے میں

اسی بے مہار آوارہ گردی کے دوران ایک بازار میں بالکل غیر متوقع طور پر حضرت رقیہ بنت امام حسینؓ کا مزار نظر آیا۔ اندر جا کر زیارت کی۔ مزار کے چاروں طرف منتیں ماننے والوں نے بچوں کے کھلونے اور پنگھوڑے سجا رکھے تھے۔ قریب ہی جامع التوبہ واقع ہے' مسجد امیہ کی مختصر شکل۔ دروازے کے ساتھ ایک پتھر پر درج ہے کہ یہ مسجد سلطان الملک الاشرف موسیٰ الایوبی نے ۶۳۲ھ میں تعمیر کرائی۔

شام ہو چکی تھی۔ جامع التوبہ سے نکل کر میں قریبی ایک قہوہ خانے میں ستانے کی نیت سے داخل ہوا جو اتنا مختصر تھا کہ ہر آنے والے کا وجود اسے بھر دیتا۔ وہاں بیٹھے لوگ قہوے کی پیالیوں پر پڑتے سائے سے جان جاتے کہ کوئی نیا گاہک آیا ہے۔ دکاندار پیتل کے ایک منقش فنجان میں سے بھاپ چھوڑتے قہوے کا پیالہ بھر لایا۔ وہ بے ڈول توند والا عمر رسیدہ شخص تھا جس کی سفید پلکیں اتنی گھنی اور لانبی تھیں کہ آنکھوں پر لٹکتی رہتیں۔

قہوہ خانے میں دس پندرہ گاہک بیٹھے تھے اور سب دکاندار کے ہم عمر یا شاید اس سے بھی زیادہ بوڑھے! قہوے میں کسی کو رتی بھر دلچسپی نہ تھی۔ چند ایک تاش کا کوئی عربی کھیل کھیل رہے تھے۔ باقی کرسیوں میں بڑے آرام سے حقے گڑگڑاتے۔ دیواروں پر اس قدیم دور کی تصاویر آویزاں تھیں جب کیمرا نیا نیا ایجاد ہوا تھا...... درمیان میں ایک زنگ آلود تلوار اور سیاہ ڈھال ٹنگی ہوئی تھی۔

میں نے قہوہ ختم کیا تو ایک بوڑھے نے حقے کی نال آگے کر دی۔ کش لگایا تو لطف آ گیا۔ عجیب نشہ آور قسم کا تمباکو پی رہے تھے یہ دھندلائے ہوئے بوڑھے! تھوڑی دیر بعد دکاندار اپنا کام نپٹا کر ہمارے پاس بیٹھ گیا اور حقہ گڑگڑانے لگا۔ چند طویل اور کھانسی آور کش کھینچ کر اس نے دیوار سے ایک تصویر اتاری اور جھاڑ پونچھ کر میرے سامنے رکھ دی۔

معدوم ہوتی ہوئی شکل تھی، ایک بھاری بھرکم نوجوان کسی نیکر نما لبادے میں ملبوس ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں ڈھال تھامے شمشیر زنی کا کوئی پینترہ دکھا رہا تھا۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو اس کے چہرے پر دودھ پیتے بچے کی پوپلی مسکراہٹ تھی۔ تصویر اسی کی تھی۔ یک دم اس نے دیوار سے تلوار اور ڈھال اتاری اور تصویر کے انداز میں پینترا باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ باقی بوڑھے جو شاید روزانہ اس قسم کا تماشا دیکھتے تھے، اس پر فقرے کسنے لگے مگر وہ بت بنا کھڑا رہا۔ اچانک اس نے پھرتی سے پینترا بدلا اور ایڑیوں پر گھومتے ہوئے تلوار کو اس زور سے کمرے میں گھمایا کہ وہ گاہکوں کے سروں سے شائیں شائیں کرتی گزرنے لگی۔ جیسے کسی تیز رفتار پنکھے کا ایک ہی پر ہو اور آپ کے اوپر سنسناتا ہوا گزرنے لگے۔

میرے بالوں اور شرلاتے بھرتی تلوار کے درمیان واجبی سا فاصلہ تھا چناں چہ سرکندھوں کے بیچ دھنسانے کی کوشش کرنے لگا...... کہن زدہ بوڑھے کا دوسرا ہاتھ ڈھال کو یوں حرکت دے رہا تھا جیسے مدمقابل کے وار روک رہا ہو۔ اس کے عمر رسیدہ دوست بے فکری سے مسکراتے اور میری پریشانی سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ درجن بھر کمسن کھیریاں کھانے کے بعد وہ ہانپنے لگا اور پسینا پونچھتے ہوئے اپنے ہتھیار پھر دیوار پر سجا دیے۔ میں نے بھی پسینا پونچھا اور حقہ پینے لگا...... اٹھنے سے پیشتر جب قہوے اور تمباکونوشی کا بل طلب کیا تو بوڑھے دکاندار نے میرا کندھا تھپک کر مسکراتے ہوئے انکار کر دیا۔ میرے اصرار پر اس نے تیوری چڑھائی اور تلوار کی جانب اشارہ کیا۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور چپکے سے باہر آ گیا۔

پگڑی کے پیچھے چہرہ

دمشق کی مسجدوں سے نماز عشا کے لیے موذنوں کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ ان صداؤں میں بلا کی خوش الحانی تھی اور ایسا کیوں نہ ہوتا، اس شہر کی مٹی میں بلال حبشیؓ جو دفن تھے۔ مسجد امیہ کی فصیل نما دیوار کے پہلو میں چلتے ہوئے موذنوں کی صدائیں مجھ تک پہنچ رہی تھیں۔ میں اس دیوار کے ساتھ یوں چپک رہا تھا جیسے باقی ساری زمین سمندر ہے اور یہ دیوار ساحل! جھالر دار منار کے نیچے پہنچ کر میں کھڑا ہو گیا۔ اوپر اذان دینے والوں کا ایک گروہ مودب کھڑا تھا۔ ان میں سے ایک اللہ اکبر کہتا تو باقی موذن یہی الفاظ قدرے مختلف انداز میں دہراتے۔ جب وہ اشہد ان لا الہ الا اللہ کی صدا بلند کرتا تو اس کے ساتھی وقفے کے بعد انہی الفاظ کی قرأت کرتے...... میرے لیے اذان دینے کا یہ طریقہ نیا اور پرکشش تھا۔

مسجد امیہ کے سائے تلے میں نے ایک خاموش صحن دریافت کیا جس کا رستہ رومی ستونوں پر آرام کرتی ایک محراب میں سے جاتا تھا۔ محراب پر انگوروں کی بیل گھنی اور سیاہ تھی۔ صحن کے درمیان ایک تالاب تھا۔ کنارے پر ایک درویش سر جھکائے کچھ پڑھ رہا تھا۔ محراب کی سیدھ میں، تالاب کے پار ایک دروازہ کھلا تھا اور اندر ایک قبر تھی۔ قبر پر سنگ مرمر سے تراشی ہوئی ایک پگڑی دھری تھی۔ دور سے یوں لگتا تھا جیسے مرنے والے نے اپنی پگڑی احتیاط سے اتار کر لوح پر رکھی اور خود قبر میں اتر گیا۔

میں درویش کے مراقبے میں مخل ہوا اور اشاروں سے دریافت کیا کہ یہ کس بزرگ کا مزار ہے؟ اس نے سر اٹھایا، میری لاعلمی کی حیرت چہرے پر ظاہر کی اور پھر مجھے غیرملکی پہچان کر بولا ”سلطان صلاح الدین ایوبی۔“ میں ایک دم یوں ٹھٹکا جیسے اس کمرے کے اندر سلطان بنفس نفیس موجود ہیں۔ تاریخ کے ہزاروں اوراق میرے ذہن میں پھڑپھڑائے مگر میں نے انھیں بے توجہی کے طاق میں رکھا اور اندر چلا گیا۔

داستان، تاریخ، افسانہ، حقیقت، شجاعت، صلیب، ہلال، خاک اندر خاک۔ فاتحہ پڑھ کر باہر نکلا، درویش سر جھکائے بیٹھا تھا۔ تالاب کا پانی تاریکی میں سیاہ رات کے مانند تھا۔ باہر جانے سے پیشتر میں نے مڑ کر دیکھا، تاریک صحن اور سیاہ پانیوں کے پار دروازہ کھلا تھا...... وہاں ناکافی روشنی مگر تھی۔ میں نے انتہائی غور سے قبر کی طرف دیکھا، شاید میرا واہمہ تھا، پگڑی کے نیچے ایک چہرہ بنتے ہوئے دکھائی دیا۔ عجیب واہمہ تھا، مگر اس کے نقوش زندہ تھے، خدوخال زندہ تھے! داستان، تاریخ، افسانہ حقیقت، شجاعت، صلیب، ہلال...... خاک اندر خاک۔ ♦♦♦

”بہو اے بہو...... یہ کیا حال بنا رکھا ہے تم نے اپنا...... کبھی تھوڑا سنگھار بھی کر لیا کرو۔ لگتا ہی نہیں کہ چند دنوں کی دلھن ہو۔ ارے ہمارے زمانے میں تو لڑکی پورے دو ماہ دلھن ہی رہتی تھی۔ کام تو کرتی تھی مگر بجنا سنورنا نہ بھولتی اور ایک تم نرالی ہو جو اجڑا چمن بنی جھاڑو دے رہی ہو۔ کام سے کب روکا ہے ہم نے؟ بس ہم یہی کہتے ہیں، صبح اٹھتے ہی نماز پڑھ کر تیار ہو جاؤ اور پھر گھر

گھر کا نقشہ بدل دینے والی

ایک سلیقہ شعار عورت پھوہڑ گھرانے میں آئے تو اپنے حسن تدبیر سے اس کی کایا پلٹ دیتی ہے

قرۃ العین مریم

کے کام کرتی پھرا کرو۔“ قسمت آرا اپنی نئی نویلی اور سب سے چھوٹی بہو کو دیکھتے ہی تقریر کرنے لگی۔

بہو سیدھی سادی تھی، خاموشی سے ساس کی باتیں سنتی جھاڑو دیتی رہی۔ آخر اثبات میں سر ہلا کر ”جی اچھا!“ کہتی چلتی بنی۔ اچانک رکی اور ساس کے قریب آ کر دھیمے سے کہا ”اماں چائے پی آپ نے؟“

قسمت آرا کو تو موقع مل گیا دوبارہ تقریر کرنے کا، شروع ہو گئیں ”کہاں بہو...... کون ہے جو اس بڑھیا کا خیال کرے؟ سب اپنے کاموں میں مصروف رہتے ہیں، کسی کو میری کیا پروا؟! اپنے تینوں بیٹوں کو میں اکیلی کھلاتی پلاتی تھی۔ اب وہ پوچھتے ہی نہیں، روز رٹا رٹایا سلام کرتے اور کہتے ہیں ”اچھا اماں دیر ہو رہی ہے، دفتر جا رہا ہوں...... اماں تھکا ہوا ہوں، آرام کروں گا۔“ تو نئی ہے، اپنی بھاوجوں جیسی حرکتیں مت کرنا بلکہ انھیں بھی اپنے جیسا بنا لینا۔ جا، شاباش چائے لے

آ۔" عارفہ نے "جی اچھا" کہا اور باورچی خانے میں گھس گئی جو سب بھاوجوں کا مشترکہ تھا۔ وہاں پہنچتے ہی اس کا سر چکرا گیا۔ وہاں تو لگتا تھا زلزلہ آیا ہوا ہے۔ سمجھ ہی نہ آیا کہ چائے کیسے بنائے۔ باورچی خانے کی حالت دیکھ کر اسے چائے بنانے کی ترکیب ہی بھول گئی۔ گھر کا یہ حصہ جو سب سے زیادہ صاف ہونا چاہیے، لگتا تھا کچرا منڈی ہے۔ عارفہ نے یہ سوچ کر خود کو تسلی دی کہ نہیں، نہیں، اسے بھاوجوں نے گندا نہیں کیا۔ شاید بچے آئے ہوں گے کچھ ڈھونڈنے۔"

وہ پھر چائے بنانے کے لیے کوئی برتن ڈھونڈنے لگی۔ جتنے بھی برتن نظر آئے سب جھوٹے تھے۔ جو صاف تھے، وہ بس نام ہی کے پاک نظر آئے۔ لال بیگ سیاست دانوں کی طرح اس باورچی خانے نما وطن کو لوٹنے میں مصروف تھے۔ مرتبان اور ڈبے رکھے تھے جن کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ ان پر کوئی ڈھکن تھا نہ ہی وہ درست جگہ پڑے تھے۔ اسے ایک چھوٹا فرائی پین نظر آیا جو اس نے فوراً اٹھا لیا اور رگڑ رگڑ کر دھو ڈالا۔ پھر اسی میں چائے بنانے لگی۔ "دودھ فریج میں ہوگا۔"

یہ سوچ کر جیسے ہی فریج کھولا اُس کا بھی منظر کچھ مختلف نہ تھا۔ حیرت سے اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ ہاتھ خود بخود ناک کی طرف بڑھا۔ اس قدر شدید بدبو آرہی تھی کہ اسے قے آنے لگی۔ بہرحال جی کڑا کر فریج کا جائزہ لیا جہاں بہت سے سالن پڑے تھے۔ اسے لگا جیسے سبھی ہوٹل سے منگوائے گئے ہوں، کچھ تندوری روٹیاں بھی پڑی تھیں۔ سالن گرنے کی وجہ سے سارا فریج روغن اور ہلدی کی باس سے بسا ہوا تھا۔ فریج کے سامنے کھڑے ہو کر کسی نے انڈے توڑنے کی سعی کی تھی۔ وہ اسی طرح فریج میں پڑے تھے۔ ان سے سفیدی ٹپک ٹپک کر جالیاں پار کرتی نچلے خانے میں جمع ہو رہی تھی۔ اس جگہ پہلے ہی پھپھوندی لگی ہوئی تھی۔

ایک پتیلی دیکھی، تو اس کے اندر دودھ کم تھا' باہر زیادہ لگا نظر آیا۔ لگتا تھا جیسے کوئی آتش فشاں پہاڑ پھٹا اور لاوا پہاڑ سے باہر آ گیا۔ جیسے ہی اس نے وہ آتش فشاں ہاتھ میں اٹھانے کا گناہ کیا، ہاتھ چپچپا گیا۔ عارفہ نے ناچار فریج کا دروازہ بند کیا اور دودھ فرائی پین میں ڈال کر سوچنے لگی "زندگی میں پہلی بار فرائی پین میں چائے بنائی ہے۔ ایسا گندا باورچی خانہ اور فریج بھی پہلی بار دیکھا ہے۔"

اس کے میکے میں آسائش کی چیزیں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ پھر بھی اس نے اپنے گھر کو صاف ستھرا اور سلیقے سے سجایا ہوا تھا۔ اسے ہمیشہ اس بات کی تعلیم دی گئی تھی کہ صفائی نصف ایمان ہے اور گھر کے کام عورت کے لیے عبادت ہوتے ہیں اگر وہ سمجھے! مگر لگتا تھا شاید اس گھر کی عورتوں کو اس عبادت کا علم نہیں جبھی تو عمل کرنے سے قاصر ہیں۔ گھر میں ہر غذا وافر مقدار میں میسر تھی مگر اُسے سنبھالنا شاید کسی کو نہیں آتا تھا۔

اب چائے چھاننے کی مہم درپیش تھی۔ چھلنی ڈھونڈنا ایسا تھا جیسے آٹے سے نمک نکالنا۔ اس نے وہیں پڑا ایک کپڑا اٹھا لیا جو شاید روٹی لپیٹنے والا رومال تھا۔ کپڑے کا کونا دھو کر اس سے چائے چھانی اور اماں کے تخت پر آ بیٹھی۔ اماں اسے دیکھتے ہی پوچھنے لگی "ساری چیزیں تو مل گئیں نہ بہو آسانی سے؟"

اس نے بس ہاں میں گردن ہلا دی۔ اب کیا بتاتی کہ کن کٹھن مراحل سے گزر کر آئی ہوں۔ چائے لیتے ہوئے وہ اماں کو دیکھنے لگی۔ سوچا "اماں شکل سے تو بڑی باوقار لگتی ہیں۔" پھر ان کے کپڑوں کا جائزہ لیا: سفید رنگ کا کُرتہ شلوار اور شال نما دوپٹہ اوڑھا ہوا تھا۔ یعنی صفائی پسند خاتون ہیں مگر گھر کی حالت سے تو نہیں لگتا!

اماں نے جو دیکھا تو پوچھنے لگیں "کیا دیکھ رہی ہو بہو؟"

عارفہ چونک گئی "جی کچھ نہیں۔" پھر ہمت کر کے پوچھ لیا "اماں کھانا کون بناتا ہے؟"

اماں جیسے سب سمجھ گئی ہوں، بولیں "جب سے بہوئیں آئی ہیں، باورچی خانے جانے کو تو دل ہی نہیں چاہتا۔ اس قدر گندا رہتا ہے کہ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا اور رہی کھانا بنانے کی بات تو برسوں ہوئے گھر کا کھانا کھائے ہوئے! دونوں بہوئیں ہوٹل سے منگوا لیتی ہیں جو کھانے کے لائق نہیں ہوتا۔ بے حساب روغن اور روٹی جیسے پلاسٹک کی ہو۔ یہ تمھاری اور عاصم کی شادی کے باعث نوکرانیاں لگائی تھیں جنھوں نے دو ہفتوں تک باورچی خانہ سنبھالا اور گھر کے کام بھی کرتی رہیں۔ مگر نوکرانی کے کام میں وہ بات کہاں جو گھر کی عورت انجام دیتی ہے۔ میری تو کوئی سنتا ہی نہیں اور اب میں خود تم سب کی محتاج ہوں۔ بیماریوں نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ دو وقت کا کھانا مل جائے تو خدا کا شکر کر کے کھا لیتی ہوں۔ بس دن پورے کر رہی ہوں بیٹی۔ دل تو جلتا ہے مگر کیا کروں، کچھ کر نہیں سکتی۔"

اماں کی باتیں سن کر عارفہ سوچنے لگی "اماں ایسی بہوئیں لائی ہی کیوں؟ مجھے پسند کرتے وقت تو انھوں نے ہمارے گھر کے باورچی خانے اور غسل خانے کا بغور جائزہ لیا تھا۔ انھیں میرے پڑھے لکھے ہونے سے کوئی سروکار نہیں تھا، بس گھریلو کاموں کے متعلق پوچھتی رہیں۔ باقی بہوئیں بھی ایسی ہی لانی چاہیے تھیں نا...... اب بھگتیں۔"

چائے ختم ہو چکی تو عارفہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ تبھی اماں نے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور کہا "بہو! تم یقیناً سوچ رہی ہو گی کہ مجھے پسند کرتے وقت تو اماں نے گھریلو کاموں کے متعلق کئی سوال کیے تھے۔ مگر دوسری بہوئیں تو نکمی لگتی ہیں۔ ہے نا؟"

عارفہ کو سمجھ نہیں آیا کہ اماں کو کیسے پتا چلا؟ شرمندہ سی ہو کر اماں کے قریب بیٹھ گئی۔ وہ دور آسمان کی وسعتوں میں کھو گئیں جیسے لفظ تلاش کر رہی ہوں۔ پھر گویا ہوئیں "جب میں اس گھر میں بیاہ کر آئی تو یہاں ہر چیز میسر تھی۔ میری ساس اور سسر وفات پا چکے تھے اور میری ایک ہی نند تھی جس نے میرا رشتہ اپنے اکلوتے بھائی سے کرایا۔

"جب وہ مجھے دیکھنے میرے گھر آئی تو اس نے مجھے سر سے پاؤں تک بغور دیکھا۔ پھر گھر کی ہر چیز کا جائزہ لینے لگی۔ میں سمجھ گئی کہ صفائی ستھرائی کا عالم دیکھ رہی ہے۔ میں گھریلو کام باقاعدگی سے کرتی تھی، اسی لیے انھیں پسند آ گئی۔ نند شادی شدہ تھی، لہٰذا گھر پر میرا راج ہو گیا۔ میں گھر کو ہمیشہ صاف ستھرا رکھتی۔ عاصم کے ابا کپڑے کی دکان کرتے تھے۔ ہمارا ہاتھ ہمیشہ کھلا رہا۔ اللّٰہ نے مجھے تین بیٹوں سے نوازا۔ میں نے انھیں عمدہ تعلیم دی۔ اچھے سے اچھا کھلایا اور لباس پہنایا۔ صاف ستھرا اور مذہبی ماحول دیا۔ قرآن، نماز اور روزے کی عبادات گھر میں عام تھیں۔ عاصم کے ابا بھی مذہبی معاملات میں سخت تھے۔

ایک دن وہ دکان سے گھر آ رہے تھے۔ ان کے پاس اچھی خاصی رقم تھی کہ ڈاکوؤں نے راستے میں لوٹ لیا۔ انھوں نے تکرار کی تو ڈاکوؤں کے ہاتھوں اپنی جان گنوا دی۔"

کچھ دیر کو اماں خاموش ہو گئیں۔ چہرے پر غم و کرب کے آثار نمایاں تھے۔ ضبط کرنے کے باوجود دو آنسو آنکھوں سے نکل کر گالوں تک لڑھک آئے۔ انھیں دوپٹے کے پلو میں جذب کیا اور دوبارہ وہیں سے تسلسل جوڑا "اس اچانک صدمے نے ہمیں دم بخود کر دیا۔ ہمیں کسی چیز کا ہوش نہ تھا۔ ایسے حالات میں عاصم نے ہمت دکھائی اور چھوٹا ہونے کے باوجود سب کو دلاسا دیا۔

"انھی دنوں اظہر کو اچھی جگہ نوکری مل گئی۔ وہ کپڑے کی دکان تو ٹھپ ہو گئی تھی، اب اظہر کی تنخواہ سے گھر چلنے لگا۔ وقت بہت بڑا مرہم ہے جس نے زخموں کو بھرنا شروع ہی کیا تھا کہ اظہر پر شادی کا بھوت سوار ہو گیا۔ لڑکیاں تو میری نظر میں بہت تھیں مگر ایک دن اچانک وہ سمیرا کو بیاہ لایا اور ہم سب کو حیران و ششدر کر دیا۔ خاندان والوں کی باتوں سے بچنے کے لیے میں نے اظہر اور سمیرا کی رسمیں ادا کرا دیں۔

"سمیرا اظہر کے دفتر میں کام کرتی تھی۔ شکل و صورت کی تو اچھی ہے مگر سلیقہ وگھر داری نام کو نہیں۔ خیر خاموشی اختیار کرنا پڑی۔ جب محمود کی باری آئی تو اس نے بھی اپنی پسند بتا دی البتہ رشتہ میں لینے گئی۔ محمود کو لاکھ سمجھایا، ناراض بھی ہوئی مگر اس نے یہ کہہ کر چپ کرا دیا کہ اگر آپ شادی نہیں کرائیں گی تو میں بھی اظہر بھائی کی طرح امبر کو بیاہ لاؤں گا۔ لہٰذا مجھے نہ چاہتے ہوئے بھی یہ کڑوی گولی نگلنی پڑی۔

شروع میں امبر نے گھر کے کاموں میں دلچسپی لی پھر بڑی بہو کی دیکھا دیکھی اس نے بھی ہاتھ کھینچ لیا۔ دونوں نے نوکرانی لگا لی جو انتہائی گندا کام کرتی' مجھے وہ پسند نہ تھی۔ ایک دن نوکرانی سے میری لڑائی بھی ہوئی۔

سلطان ٹیپو کی وصیت

تو رہ نوردِ شوق ہے' منزل نہ کر قبول
لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول

اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز
ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول

کھویا نہ جا صنم کدۂ کائنات میں
محفل گداز! گرمیِ محفل نہ کر قبول

صبحِ ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے
جو عقل کا غلام ہو' وہ دل نہ کر قبول

باطل دوئی پسند ہے' لاشریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول!

بیداری

جس بندۂ حق بیں کی خودی ہو گئی بیدار
شمشیر کی مانند ہے بُرّندہ و بُرّاق

اس کی نگہِ شوخ پہ ہوتی ہے نمودار
ہر ذرے میں پوشیدہ ہے جو قوتِ اشراق

اس مردِ خدا سے کوئی نسبت نہیں تجھ کو
تو بندۂ آفاق ہے' وہ صاحبِ آفاق

تجھ میں ابھی پیدا نہیں ساحل کی طلب بھی
وہ پاکیِ فطرت سے ہوا محرمِ اعماق

(علامہ اقبالؒ)

تب بہوئیں مجھ سے الجھ پڑیں۔

"عبرت پکڑ کر میں عاصم کی نوکری لگنے سے پہلے ہی لڑکیاں دیکھنے لگی۔ جب تک نوکری لگتی، میں نے تم سے رشتہ کرا دیا تاکہ اس کا دماغ ہواؤں میں نہ اڑ سکے۔ مجھے تم سے بہت امیدیں ہیں بیٹا! میں چاہتی ہوں تم اس گھر اور اپنی جیٹھانیوں کو سدھار دو۔ بس اب یہ مہم تمھارے ذمے ہے۔" اچانک باورچی خانے سے کانچ گرنے کی آواز آئی۔ اماں اور عارفہ چونک گئیں۔

اماں نے کہا "دیکھو بہو، کیا ہوا ہے؟ اللہ خیر کرے۔"

عارفہ بھاگی بھاگی باورچی خانے گئی۔ بلی نے گلاس گرا دیا تھا۔ اب جھوٹے برتنوں میں منہ مار رہی تھی۔ اس نے جلدی سے بلی کو بھگایا۔ اتنی دیر میں اماں کی تین آوازیں آ گئیں "کیا ہوا، کیا گرا، کون ہے وہاں؟"

عارفہ نے واپس جا کر اماں کو تسلی دی۔ پھر چائے کے پیالی اٹھائی جس پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں اور باورچی خانے آ گئی۔ صبح کے دس بجنے والے تھے مگر گھر میں سب بے سدھ سوئے پڑے تھے۔

اب وہ باورچی خانے کی صفائی کا سوچنے لگی۔ ذہن میں کاموں کو ترتیب دیا اور بسم اللہ پڑھ کر شروع ہو گئی۔ کچھ دیر میں نوکرانی بھی چلی آئی۔ اس نے اپنی نگرانی میں سارا کام کرایا۔ ابھی کام جاری تھے کہ جیٹھانیاں ایک ایک کر کے جمائیاں لیتی نمودار ہوئیں۔ باورچی خانے میں صفائی دیکھ کر حیران ہوئیں اور تھوڑی شرمندہ بھی! اس نے جیٹھانیوں کو سلام کیا اور چائے چڑھا دی۔ پھر فریج میں رکھی تندوری روٹیاں تلنے لگی۔ سمیرا نے تو کوئی نوٹس نہ لیا البتہ امبر اس کے ساتھ ناشتا بناتے ہوئے کہنے لگی "تم رہنے دو نا' ماسی برکتے کر لے گی۔"

عارفہ نے ماسی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "نہیں بھابی، آپ کو نہیں پتا یہ بہت باتونی ہے اور کام تو بس نام کا کرتی ہے۔" ماسی برکتے نظر چرا گئی۔

اس دن وہ دیر تک باورچی خانہ صاف کرنے میں جتی رہی۔ دوپہر تین بجے کے لگ بھگ اسے خوب چمکا دیا اور ماسی کو ہدایت دی "کل صبح آٹھ بجے آ جانا۔"

اسی دوران وہ سالن پکا چکی تھی۔ فریج میں رکھے سارے سالن ماسی کو دے دیے گئے۔ فریج بھی لشکارے مار رہا تھا۔ اس نے دو روٹیاں پکائیں اور اماں کے پاس لے آئی جو ابھی نماز سے فارغ ہوئی تھیں۔ گھر کی بنی روٹی دیکھ کر وہ بچوں کی طرح خوش ہوئیں اور مزے لے لے کر کھانا کھایا۔ عارفہ نے بھی کھانا کھا کر برتن سمیٹے۔ اتنی دیر میں بچے دوڑتے ہوئے آ گئے۔ وہ اسکول سے کچھ دیر پہلے آئے تھے۔ اس نے بچوں کو پیار کیا تو انھوں نے کہا "چچی بہت بھوک لگی ہے، کھانا ہے؟"

وہ بچوں کو بٹھا کر باورچی خانے گئی اور روٹیاں پکانے لگی۔ سمیرا کا بیٹا عمران، عارفہ کے پاس آیا اور بولا "شکر ہے، آج مجھے کسی نے روٹی لانے نہیں بھیجا۔" بچوں کو کھانا کھلا کر اس نے اپنے اور اماں کے کمرے کی صفائی کی اور پھر کچھ دیر آرام کیا۔ شام کو جب تینوں بھائیوں نے کھانا کھایا تو انھیں بھی بہت مزا آیا۔ اظہر اور محمود نے کن انکھیوں سے اپنی بیویوں کو دیکھا جو سر جھکائے کھانا کھا رہی تھیں۔ البتہ عاصم فخر سے چوڑا ہو گیا۔

دوسرے دن بھی عارفہ نے سارا دن گھر کے کام

کرتے گزار دیا۔ اس طرح ایک ہفتے میں اس نے گھر کا نقشہ ہی بدل ڈالا۔ دونوں جیٹھانیوں نے محسوس کیا کہ گھر پہلے کی طرح صاف ستھرا ہو گیا ہے جیسے اماں رکھتی تھیں۔ اماں تو بہت خوش تھیں۔ البتہ انھیں یہ فکر ستاتی کہ بڑی بہوئیں بھی کسی طرح اپنی ذمہ داری کا احساس کر لیں۔ سمیرا کے تین بچے تھے اور امبر کے دو۔ وہ دادی سے کہانیاں سن کر خوش ہوتے تھے۔

اماں انھیں نبیوں کے قصے سناتیں، مگر بہوؤں کو ناگوار گزرتا۔ ان کا خیال تھا کہ اماں کی صحبت میں بچے دقیانوسی ہو رہے ہیں۔ اس لیے ایک دن انھوں نے الگ ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ مگر شوہروں کے پاس اتنی رقم نہ تھی کہ ان کی مرضی کے نئے گھر خریدتے۔ اماں نے یہ سنا تو انھیں شدید صدمہ ہوا۔ اسی غم میں وہ بیمار پڑ گئیں۔ عارفہ نے ان کی بہت تیمارداری کی مگر بیماری بڑھتی گئی۔ ایک رات وہ اپنے دل میں یہ حسرت لیے کہ گھر جیسا وہ چاہتی تھیں ویسا ہو جائے، دنیائے فانی سے کوچ کر گئیں۔

کچھ دن گھر کا ماحول سوگوار رہا۔ پھر سب اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ عارفہ کو اماں کی باتیں بہت یاد آتیں۔ عاصم بھی چپ رہنے لگے۔ عارفہ سے بچے بہت گھل مل گئے تھے، اس لیے وہ فارغ وقت بچوں کے ساتھ گزارتی۔ ایک دن عارفہ اپنے کمرے میں نماز ظہر ادا کر رہی تھی کہ بچوں کے رونے کی آواز آئی۔ سلام پھیر کر باہر آئی تو پتا چلا، سارے بچے فیل ہو گئے ہیں۔ جیٹھانیوں نے بچوں کو بہت مارا۔

عارفہ نے انھیں بہلایا، کھانا کھلا کر اپنے کمرے میں لے آئی اور سمجھایا "پڑھو گے نہیں تو اچھی جگہ ملازمت بھی نہیں ملے گی۔ پھر تم غریب رہو گے، تمھارے پاس کھانے کے لیے بھی پیسے نہیں ہوں گے۔ پھر کیا کرو گے؟" یہ سن کر بچے پریشان ہو گئے۔

انھیں گھبرایا ہوا دیکھ کر عارفہ نے کہا "آج سے شام کو میں تم سب کو پڑھاؤں گی مگر میری باتیں ماننا ہوں گی۔"

بچے خوش ہو گئے اور انھوں نے دل لگا کر پڑھنے کا عہد کیا۔ دن پر لگا کر اڑنے لگے۔ اگلی بار جب بچوں کا نتیجہ آیا تو یہ دیکھ کر سب کی خوشی کی انتہا نہ رہی کہ انھوں نے بہت اچھے نمبر لیے تھے۔ تب اظہر اور محمود نے اپنی بیویوں کو خوب ڈانٹا کہ انھی کی غیر ذمے داری کے باعث گھر اور بچے، سب کچھ بگڑ گیا تھا۔ بلکہ اماں بھی یہ حسرت دل میں لیے اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ سمیرا اور امبر کو سمجھ آ گئی تھی اور وہ شرمندہ بھی تھیں۔ عورتوں نے گھر کو بگاڑا تھا اور ایک عورت نے ہی اسے سنوار دیا۔ اب سمیرا اور امبر عارفہ کے ساتھ گھر کے کام کرانے لگیں جو بڑی خوشگوار تبدیلی تھی۔

ایک شام عارفہ نماز عصر پڑھ کر بچوں کو پڑھانے کی غرض سے باہر آئی تو یہ دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا کہ سمیرا بچوں کو پڑھا رہی تھی۔ امبر پودوں کو پانی دینے میں محو تھی۔ پھولوں کی خوشبو پورے صحن کو مہکا رہی تھی۔ اس نے چائے بنائی اور صحن میں جیٹھانیوں کے پاس آ بیٹھی۔ اب امبر بھی بچوں کو ہوم ورک کروا رہی تھی۔ یہ بات عیاں تھی کہ انھیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہو گیا تھا۔ عارفہ چائے پیتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھنے لگی اور تخت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑبڑائی "کاش آج یہاں اماں بیٹھی مسکرا رہی ہوتیں......!"

◆◆◆

صلے کی تمنا نہ ستائش کی پروا

لاہور ہائیکورٹ کا عوامی راہنما

عدالتوں میں بے جگری سے بے بس عوام کی آواز بلند کرنے والے ایک بہادر وکیل کے اوراقِ زیست

حامد ریاض ڈوگر

عدالتِ عالیہ لاہور کے احاطے میں یوں تو کئی برگد استادہ ہیں۔ یہ درخت اپنی عمر اور گھنے سائے کے لحاظ سے ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ مگر کراچی شہدا ہال، ہائیکورٹ بار ایسوسی ایشن کی لائبریری، دفاتر اور کیفے ٹیریا کی عمارتوں کے درمیان گھرا ہوا برگد سب سے نرالی شان کا مالک اور اپنے دامن میں ہماری آئینی، قانونی اور سیاسی تاریخ کی ان گنت داستانیں سموئے ہوئے ہے۔

اسی برگد کے سائے تلے، کیفے ٹیریا والی جانب چھوٹی میز جمائے ایک قدرے پستہ قد، درویش منش اور کم گو وکیل سالہا سال سے ڈیرہ جمائے نظر آتا۔ وہ اکثر دائیں بائیں بیٹھے دیہاتی وضع قطع والے سادہ لوح لوگوں کے مسائل سننے میں مگن ہوتا یا اخبار نویس دوستوں کی چائے پانی سے تواضع میں مصروف پایا جاتا۔ مگر اب یہ میز خالی ہو چکی کہ اس پر محفل سجانے والا وہاں جا چکا جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا۔ ایم ڈی طاہر نے یہیں اپنی زندگی کے پینتیس چھتیس سال ایک ہی ڈھب پر گزارے اور آخر ۲۱ راپریل ۲۰۰۸ء کو دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔

عدالتوں میں آمد و رفت رکھنے یا اخبار پڑھنے والا شاید ہی کوئی ایسا قاری ہو گا جس نے ایم ڈی طاہر کا نام پڑھا یا سنا نہ ہو۔ ان کی وجہ شہرت وہ ہزاروں کیس تھے جو انھوں نے کسی فیس کی لالچ یا معاوضہ کی خاطر نہیں بلکہ خالصتاً معاشرتی فلاح، مفاد عامہ اور عوامی مسائل حل کرنے کے لیے اپنے طور پر دائر کیے۔ ان میں سے اکثر تو ابتدا ہی ناقابل سماعت قرار دے دیے گئے یا بعد از سماعت مسترد ہوئے۔ لیکن سیکڑوں مقدمات ایسے ہیں جن میں ان کی دائر کردہ درخواست سے عام آدمی کو فائدہ پہنچا۔

وہ جہاں کہیں مفادِ عامہ کا کوئی معاملہ دیکھتے، ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا کیے بغیر درخواست تیار کرتے اور عدالت میں دائر کر دیتے۔ ایسی کتنی درخواستیں انھوں نے دائر کیں، صحیح تعداد تو شاید انھیں خود بھی یاد نہیں تھی لیکن ان کے بقول دس ہزار سے زائد تھیں۔ یہ تعداد عالمی ریکارڈ

کی حیثیت رکھتی ہے اوراس کا اندراج گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں کیا جانا چاہیے۔

وہ نہایت معمولی مسائل سے اہم ترین آئینی و قومی معاملات میں عدالتوں کا دروازہ کھٹکھٹاتے رہے۔ بظاہر ایک معمولی نظر آنے والا معاملہ یہ تھا: ۱۹۹۳ء میں انھوں نے عدالت عالیہ میں درخواست دائر کی کہ مختلف سرکاری محکمے سڑکوں پر کھدائی کرتے ہیں تو دھول اڑنے سے آلودگی پھیلتی ہے۔ ان کی اس درخواست پر عدالت عالیہ نے باقاعدہ حکم جاری کیا کہ سڑکوں کی کھدائی کرنے والے محکمے دھول اڑنے اور آلودگی پھیلنے سے روکنے کے لیے کھدی جگہ پر پانی کا چھڑکاؤ اس وقت تک کرتے رہیں جب تک سڑک اصل حالت میں بحال نہیں ہو جاتی۔

اسی طرح قومی زندگی کے اہم ترین سانحہ "سقوط مشرقی پاکستان" کے اصل حقائق منظر عام پر لانے کے لیے انھوں نے عدالت عالیہ میں درخواست دائر کی۔ اس میں صدر مملکت جنرل یحییٰ خان کا بیان قلم بند کیے جانے کی استدعا شامل تھی۔ اس پر چیف جسٹس مولوی مشتاق کی سربراہی میں قائم عدالت عالیہ کے بینچ نے انھیں یہ ذمہ داری سونپی کہ اگر جنرل یحییٰ خان انھیں اپنا وکیل مقرر کر دیں تو وہ ان کا بیان حاصل کر کے عدالت میں پیش کریں۔

چناں چہ انھوں نے یحییٰ خان اور ان کے اہل خانہ سے رابطہ کر کے اس حالت میں جنرل سے ملاقات کی جب وہ بستر علالت پر دراز اور بہ سبب لقوہ و فالج بولنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکے تھے۔ ایم ڈی طاہر نے ان کے بیٹے علی یحییٰ خان کا تحریری بیان حاصل کیا۔ اس طویل تحریری بیان میں شیخ مجیب

ہندی مکتب

اقبال! یہاں نام نہ لے علم خودی کا
موزوں نہیں مکتب کے لیے ایسے مقالات
بہتر ہے کہ بچارے مَمولوں کی نظر سے
پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات
آزاد کی اک آن ہے محکوم کا اک سال
کس درجہ گراں سیر ہیں محکوم کے اوقات!
آزاد کا ہر لحظہ پیامِ ابدیت
محکوم کا ہر لحظہ نئی مرگِ مفاجات
آزاد کا اندیشہ حقیقت سے منور
محکوم کا اندیشہ گرفتارِ خرافات
محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا
ہے بندۂ آزاد خود اک زندہ کرامات
محکوم کے حق میں ہے یہی تربیت اچھی
موسیقی و صورت گری و علم نباتات!

دین و تعلیم

مجھ کو معلوم ہیں پیرانِ حرم کے انداز
ہو نہ اخلاص تو دعوائے نظر لاف و گزاف
اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف
اُس کی تقدیر میں محکومی و مظلومی ہے
قوم جو کر نہ سکی اپنی خودی سے انصاف
فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

(علامہ اقبال)

الرحمٰن، ذوالفقار علی بھٹو، عبدالحمید بھاشانی، ائیر مارشل رحیم اور جنرل گل حسن وغیرہ جیسی نامی گرامی شخصیات کے متعلق اہم انکشافات موجود تھے۔ یہ بیان ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے جسے بعدازاں حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ کا حصہ بھی بنایا گیا۔ یوں ایم ڈی طاہر مرحوم نے ملک و قوم کی اہم خدمت انجام دی۔

انھوں نے چھوٹی بڑی نوعیت کے بے شمار معاملات کی جانب عدالتوں اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے پوری قوم کو متوجہ کیا۔ ان میں موٹر سائیکل پر ڈبل سواری کی پابندی، موٹر سائیکل سواروں کے لیے ہیلمٹ لازمی قرار دیا جانا، کھلے مین ہولز میں گر کر معصوم بچوں کی ہلاکت، ماحولیاتی آلودگی کا مسئلہ، مہنگائی، بے روزگاری، بجلی اور گیس وغیرہ کے نرخوں میں اضافہ، قومی دولت لوٹنے اور بینکوں سے اربوں روپے کے قرضے معاف کرانے والوں کا احتساب، جیلوں میں قیدیوں کی مشکلات اور جرمانہ ادا نہ کر سکنے والے غریب قیدیوں کی دادرسی جیسے بے شمار مسائل شامل ہیں۔

فوجی افسروں کو چولستان میں برائے نام قیمت پر زمینوں کی الاٹمنٹ کے خلاف درخواست بھی اسی مرد درویش نے دائر کی تھی۔ وہ عدالت سے رجوع کرنے کے لیے کسی سائل کا انتظار نہ کرتے بلکہ اخبارات میں شائع ہونے والی خبروں اور ملک بھر سے آئے خطوط کو بنیاد بنا کر درخواست لکھتے اور عدالت میں خود سائل کی حیثیت سے پیش ہو جاتے۔ ان کے اس طرز عمل سے بعض جج حضرات بہت نالاں تھے اور انھیں سخت سست بھی کہتے۔ مگر "وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے، ہم اپنی وضع کیوں بدلیں" کے مصداق اپنی ہی دھن میں مگن ایم ڈی طاہر نے ہر طرح کے حالات میں اپنا کام جاری رکھا اور ہر قسم کی مشکلات، عدلیہ کے حوصلہ شکن رویے اور ساتھی وکلا کے طعن و تشنیع کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔

میاں نواز شریف اور چیف جسٹس پاکستان سجاد علی شاہ کے مابین تنازع کے دنوں میں انھوں نے عدالت عالیہ لاہور میں جسٹس صاحب کی حمایت میں درخواست دائر کر دی۔ عدالت عالیہ نے نہ صرف ان کی درخواست کو مسترد کیا بلکہ انھیں پچاس ہزار روپے جرمانہ بھی کر ڈالا۔ اسی طرح ایک درخواست کی سماعت کے دوران عدالت عالیہ لاہور کے چیف جسٹس، افتخار محمد حسین چودھری سے ان کی تلخ کلامی ہو گئی۔ چیف جسٹس نے انھیں توہین عدالت کے جرم میں سزا سنا کر جیل بھجوا دیا۔ بعدازاں عدالت عظمیٰ نے ان کی سزا معطل کر کے انھیں رہا کرایا۔ اس طرح کے ناگوار واقعات مرحوم کی عدالتی زندگی میں روزمرہ کا معمول بن چکے تھے مگر انھوں نے گھبرانے یا خوفزدہ ہونے کے بجائے جرأت سے ان کا سامنا کیا۔

ایک نیک روح جسے خدا نے جلد اپنے پاس بلالیا

☆

ایم ڈی طاہر کا اصل نام محمد دین طاہر تھا۔ وہ ۱۹۴۲ء

میں بھارت کے شہر انبالہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں آزادی کے بعد نہایت کمسنی میں اپنے خاندان کے ہمراہ پاکستان چلے آئے۔ ہجرت کے بعد پیش آنے والے دلدوز حادثات میں ایک بہن کے علاوہ ان کے تمام عزیز و اقارب کام آئے۔ انتہائی مشکل حالات میں بڑی بہن نے ان کی پرورش کی۔

وہ اپنے رشتہ داروں کے پاس منڈی بہاؤالدین میں مقیم ہوئے۔ ایم ڈی طاہر اپنا اور بہن کا پیٹ پالنے کے لیے برف بیچتے رہے، بکریاں چرائیں اور کلرکی بھی کی۔ ناسازگار حالات میں بھی ہمت نہیں ہاری اور انہی ناگفتہ بہ حالات میں زمیندار کالج گجرات سے گریجویشن اور پنجاب یونیورسٹی کالج سے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد ۱۹۷۲ء میں وکالت کرنے لگے۔

انھوں نے محنت و لگن سے خوب نام کمایا، مگر کبھی عجز و انکسار کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اچھے دنوں میں بھی انھوں نے اپنے مشکل وقت کو یوں یاد رکھا کہ ہر مصیبت زدہ، غریب اور مفلوک الحال سائل کا کیس فیس اور معاوضے کی پروا کیے بغیر قبول کرتے اور پھر اس کی دادرسی کے لیے جان تک لڑا دیتے۔

ایم ڈی طاہر اولیائے کرام سے بہت زیادہ عقیدت رکھتے تھے۔ کم و بیش پچیس سال قبل راقم الحروف مفادِ عامہ کے کیسوں سے متعلق گفتگو کرنے ان کے چیمبر میں حاضر ہوا۔ یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کہ اس اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص کے چیمبر میں قانون کی کتابوں سے بھری الماریوں کے اوپر بہت سے روایتی بزرگوں کی تصاویر آویزاں ہیں۔ راقم سے رہا نہ گیا اور ان کی بابت استفسار کیا مگر وہ بات گول کر گئے اور اس موضوع پر پھر کبھی بات کرنے کا کہہ کر معاملہ ٹال دیا۔

بعد میں معلوم ہوا کہ یہ ان کی اولیائے کرام سے بے پناہ عقیدت کا کمال تھا۔ وہ بری پاک قلندری (گجرات) کے مرید تھے۔ اظہارِ عقیدت کے لیے ہی انھوں نے بری پاک قلندری (گجرات) بابا حسین بادشاہ شکر گڑھی اور حضرت گلزار (چندو دادن خان) کے مزارات تعمیر کرائے۔ جی ٹی روڈ شاہدرہ کے قریب رچنا ٹاؤن میں جامع مسجد طاہر المسلمین اور دینی مدرسے کی تعمیر بھی شروع کر رکھی تھی کہ بلاوا آ گیا۔ چناں چہ انھیں وصیت کے مطابق اسی مسجد سے ملحق احاطہ میں دفن کیا گیا۔

ایم ڈی طاہر معروف قانون دان تھے مگر اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات کے ساتھ ساتھ شعر و شاعری اور تصنیف و تالیف کے لیے بھی وقت نکال لیتے۔ ان کی صوفیانہ پنجابی شاعری کے دو مجموعے "ہجناں گھنڈ اٹھا" اور "ماں دی ٹھنڈی چھاں" شائع ہو چکے۔ ان کی شاعری مرشد سے اظہارِ محبت کا ذریعہ ہے۔ اس کے علاوہ "وکالت اور عدالت، ایڈووکیٹ اینڈ کورٹس" اور "کردار سازی کے لیے پانچ انمول موتی" کے نام سے ان کی کتب بھی چھپ چکیں۔ مفادِ عامہ کی رٹ درخواستوں کا مجموعہ دو جلدوں میں شائع ہوا۔ اس کی تقریبِ رونمائی میں وہ ایک حرفِ انکار پر شہرت کی بلندیوں کو چھونے والے سابق چیف جسٹس افتخار محمد حسین چودھری کو بلانا چاہتے تھے مگر موت نے مہلت نہ دی۔ تقریب سے قبل ہی وہ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ، کل ہماری باری ہے

◆◆◆

آپ بیتی

دیہی زندگی کے ایک سو سال

ہیر وارث شاہ سے موبائل تک

انسانی زندگی میں مشینی تفریح کا بڑھتا عمل دخل ہماری کچھ اقدار بھی تلپٹ کر چکا...... تصویر کا دوسرا رخ

احسان اللہ گھرل

میرے بزرگ بتایا کرتے تھے کہ برسوں پہلے گاؤں میں بجلی نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ ان کی تفریح صرف یہ تھی کہ موسمِ گرما میں گاؤں کے قریب ایک دو میلے منعقد ہوا کرتے۔ ان میں کھانے پینے کی چند دکانیں ہوتیں۔ تفریح کے نام پر ، بھانڈ اپنی بولیاں بولتے ناچ گاتا ہوتا۔ ہر سال میلے پر چند قوال تشریف لاتے۔ قبرستان کے ملنگ نے قوالوں کے لیے دو تین دیسی مرغے پال رکھے ہوتے جو ذبح کیے جاتے۔ قوال خود ہی وہ مرغے پکاتے اور خوب سیر ہو کر کھاتے۔ اس کے بعد قوالی شروع ہو جاتی اور خوب سماں بندھتا۔

شام کو بزرگ اور جوان چوپال یا تھڑوں میں جمع ہوتے۔ کوئی خوش گلو جوان ہیر وارث شاہ یا میاں محمد بخش کا کلام پڑھتا اور حاضرین کو محظوظ کرتا۔ ایک دفعہ نمبردار کی شادی پر لاہور سے عالم لوہار کو بلوایا گیا۔ مرحوم نے اونچے سُروں میں جگنی گا کر سماں باندھا کہ لوگ اش اش کر اٹھے۔ برسوں بعد جب گاؤں میں ایک تھانیدار کی شادی میں عارف لوہار کو سنا گیا تو نوجوان طبقہ خاصا لطف اندوز ہوا۔ مگر بزرگوں نے کہا، وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔ بزرگوں کو عالم لوہار کی گائیکی میں مزہ زیادہ آتا تھا۔

پھر گاؤں کے ایک چودھری صاحب ریڈیو لے آئے۔ اب چیدہ چیدہ لوگ شام کو چودھری کی بیٹھک میں جمع ہو جاتے۔ ملکی اور غیر ملکی خبریں سنتے اور ساتھ ساتھ موسیقی سے لطف اندوز ہوتے۔ اسی ریڈیو پر لوگوں نے ہندوستان کی آزادی کا اعلان سنا کہ ملک دو حصوں میں تقسیم ہو گیا اور اب ان کا وطن پاکستان ہے۔ ۱۹۶۵ء اور پھر ۱۹۷۱ء کے جنگی واقعات بھی اسی ریڈیو کے ذریعے لوگوں کو معلوم ہوئے۔ نور جہاں کے ملی ترانے بھی ان کی یادوں میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ریڈیو پاکستان کے معروف کمپیئر نظام دین کا نام آج بھی بزرگوں کو یاد ہے۔ مرحوم حالات حاضرہ کو دلچسپ باتوں اور لطیفوں میں بیان کرتے تھے۔

ریڈیو کے بعد ٹیلی ویژن آیا جو آواز کے ساتھ تصویر بھی دکھاتا۔ گاؤں کے دو تین متمول خاندان جن کے جوان بہ سلسلہ روزگار سعودی عرب میں مقیم تھے، ٹیلی ویژن لے آئے۔ سرِ شام صحن میں چٹائی یا دری ڈال دی جاتی۔ اڑوس پڑوس کے بچے اور خواتین جمع ہوتیں۔ ہفتہ وار اقساط میں ڈرامے دکھائے جاتے۔ لوگ پورا ہفتہ ایک ڈرامے کا انتظار کرتے۔ بچوں کو نصیحت کی جاتی کہ پاؤں دھو کر آئیں اور شور نہ مچایا کریں۔

سونا چاندی، اندھیرا اجالا اور وارث نامی ڈرامے اس دور کی یادوں میں شامل ہیں۔ مقبول ترین ڈراما اندھیرا اجالا ہوا کرتا۔ جس دن یہ ڈراما لگتا، شام کو گاؤں میں ہُو کا عالم ہوتا۔ اگر کبھی کبھار لوڈشیڈنگ ہو کرتی تو یار لوگ اپنے ٹریکٹروں کی بیٹریوں پر ٹیلی ویژن چلاتے اور ڈراما ضرور دیکھتے۔ عرفان کھوسٹ بطور ''ڈائریکٹ حوالدار'' بہت پسند کیا گیا۔

پھر رنگین ٹیلی ویژن آیا اور ٹی وی کا مزہ دوبالا ہو گیا۔ ٹی وی دیکھنے والے بچوں سے چھوٹے موٹے کام بھی لیے جاتے۔ مثلاً اینٹوں کا ڈھیر ایک سے دوسری جگہ منتقل کرنا ہوتا تو بچے منٹوں میں یہ کام خوشی خوشی کر دیتے۔ بعض عورتیں لنڈے سے اُونی جرسیاں منگوا لیتیں۔ ٹی وی دیکھنے کے ساتھ ساتھ بچے جرسیاں بھی اُدھیڑتے رہتے۔ قریبی شہر میں سینما گھر بھی موجود تھا۔ اتوار کے روز گاؤں کے نوجوان اکٹھے ہو کر فلم کا بارہ بجے والا شو دیکھنے جاتے۔ صادق ماچھی کو لوگ آج بھی فلم مولا جٹ کے حوالے سے چھیڑتے ہیں۔

فلم چل رہی تھی۔ مولا جٹ گنڈاسا لیے سامنے آیا تو بھولے بھالے صادق کے ساتھ بیٹھے شرارتی نوجوان نے کان میں کہا ''صادو! بھاگ مولا جٹ تیری طرف آ رہا ہے۔'' سادہ لوح صادق نے گھبرا کر سینما ہال میں ہی دوڑ لگا دی۔ یہ دیکھ کر پورا سینما ہال قہقہوں سے گونج اٹھا۔

پھر وی سی آر نام کی ایک مشین ایجاد ہوئی۔ یہ وہ ایجاد ہے جس نے پوری نسل کو برباد کر ڈالا۔ نوجوان، بچے، بوڑھے اور خواتین سبھی وی سی آر کے شوقین نکلے۔ گاؤں کے دو تین گھروں میں وی سی آر تھا۔ وہ ہفتہ میں ایک دو دن وی سی آر پر لوگوں کو فلم دکھاتے۔ پھر گاؤں کے نوجوان محلے میں مختلف گھروں سے دس دس روپے اکٹھے کرنے لگے۔ وہ

شہر سے کرائے پر وی سی آر لے آتے۔

چار پانچ نوجوانوں کا گروہ ہوتا۔ ایک نوجوان نے سر پہ ٹیلی ویژن، دوسرے نے وی سی آر اور تیسرے نے ویڈیو کیسٹوں کا شاپر اٹھایا ہوتا۔ وہ گاؤں میں داخل ہوتے، کبھی پیدل، کبھی تانگے پر اور کبھی چارہ ڈھونڈنے والے گدھے پر! جب یہ قافلہ گاؤں میں داخل ہوتا تو بچے نعروں سے ان کا استقبال کرتے۔ مخبر سارے گاؤں میں خبر پھیلا دیتا کہ آج فلاں محلے میں فلم دیکھنے کا پروگرام ہے۔ شام کو پورا گاؤں وہاں جمع ہو جاتا۔ چوک میں رکھ کے ٹی وی اور وی سی آر چلا دیا جاتا۔ چھوٹے بچے آگے زمین پر بیٹھ جاتے۔ بوڑھے اور نوجوان چارپائیوں اور خواتین چھتوں پر بیٹھ جاتیں۔ رات دو تین بجے تک یہ شغل جاری رہتا۔

موسم گرما خیریت سے گزر جاتا کیوں کہ فلم کا پروگرام چوک میں ہوتا اور کافی دنیا سما جاتی۔ سردیوں میں البتہ مشکل پیش آتی۔ وی سی آر کا پروگرام کسی بیٹھک میں ہوتا۔ اس کمرے میں صرف مخصوص افراد ہی کے بیٹھنے کی جگہ ہوتی جو آپس میں کرائے کے لیے رقم اکٹھی کرتے تھے۔ وہ آرام سے بیٹھک میں بیٹھ کر فلم دیکھتے۔ منت خورے بچوں اور لڑکوں کا ہجوم بازار میں کھڑا رہتا اور اندر بیٹھے لوگوں کو طرح طرح سے تنگ کرتا۔ کبھی دروازہ بجایا جاتا۔ کبھی دروازوں اور کھڑکیوں پر پتھر برسائے جاتے۔ شرارت کر کے نوجوان بھاگ جاتے۔ جب کسی طرح سے دال نہ گلتی تو منچلے نوجوان گاؤں کے ٹرانسفارمر سے چھیڑ خانی کرتے۔ گویا خود کھیلیں گے اور نہ ہی کھیلنے دیں گے۔

اس زمانے میں اکثر نوجوانوں کے ہاتھوں میں درسی کتب کی جگہ ویڈیو کیسٹ نظر آتے اور جوانوں اور بوڑھوں کی محفلوں میں فلمیں ہی زیرِ بحث رہتیں۔ ہر طرح کی پاکستانی، بھارتی فلمیں دیکھی جاتیں۔ بزرگ حضرات پنجابی فلموں کی فرمائش کرتے جب کہ نوجوان طبقہ مار کٹائی والی فلموں کو زیادہ پسند کرتا۔ لوگوں نے ڈائریاں بنا رکھی تھیں جن میں دیکھی گئی فلموں کے نام اداکاروں سمیت درج ہوتے۔

گاؤں کے ایک بزرگ جب دوسروں کے گھر جاتے تو آتے ہی فلم 'دھی رانی' لگانے کی فرمائش کرتے۔ مرحوم کو فلم میں مشہور اداکارہ انجمن کا کردار ''بلو'' بڑا پسند تھا۔ آتے ہی کہتے کہ بلو والی فلم لگاؤ۔ رفتہ رفتہ گاؤں کے منچلوں نے بابا جی کا نام ہی ''بابا بلو'' رکھ دیا۔ یہ نام باقاعدہ ان کی چھیڑ بن گیا۔ لڑکے بالے جہاں بھی بابا جی کو دیکھتے، آوازے کستے اور بھاگ جاتے۔ مرحوم لاٹھی لے کر پیچھے بھاگتے۔

جلد ہی قریبی شہروں میں سیکڑوں کے حساب سے منی سینما گھر بن گئے۔ ان میں ہر طرح کی اخلاق سوز فلمیں دکھائی جاتیں اور کوئی پوچھنے والا اس وقت تھا نہ اب ہے۔ وی سی آر کے بعد سی ڈی اور ڈی وی ڈی کا چلن عام ہوا اور اسٹیج ڈراموں کی بہتات ہو گئی۔ اب ہر بندہ، کیا بوڑھا کیا جوان، جگتیں کرنے لگا۔ ہر نوجوان اپنی جگہ ایک بھانڈ بن بیٹھا۔ ذرا سی بھی آپ نے کوئی سنجیدہ بات کی، اس نے جگتوں میں اڑا دی۔ پھر کیبل کا دور آ گیا۔

گاؤں کے ایک مولوی صاحب اور چند صاحبانِ عقل کیبل کی مخالفت میں پیش پیش رہے۔ لیکن زیادہ تر لوگ اس کے حمایتی نکلے۔ انھوں نے یہ جواز پیش کیا کہ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ شہروں میں ہر گھر میں کیبل موجود ہے۔ اس پر دنیا بھر کی خبریں سنی جاتی ہیں۔ مذہبی پروگرام پیش کیے جاتے ہیں۔ نعت اور قوالیوں کے پروگرام ہوتے ہیں۔ چناں چہ مخالفت کے باوجود لوگوں نے کیبل کے کنکشن لیے اور دو تین برس کے دوران ہر گھر میں کیبل داخل ہو گئی۔ اب ہر گھر میں سینما گھر موجود ہے۔ وہاں دنیا بھر کی فلمیں لگتی ہیں اور ناچ گانا ہوتا ہے۔ کہیں کہیں آنے میں نمک برابر لوگ مذہبی پروگرام بھی دیکھ لیتے ہیں۔

کیبل کے بعد موبائل کا دور آ گیا۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن، سینما اور وی سی آر سے مستفید ہونے کے لیے تو ہاتھ پاؤں ہلانے پڑتے تھے، موبائل نے یہ مسئلہ بھی ختم کر ڈالا۔ اب ہر شخص کی جیب میں دنیا جہاں کی خبریں، فلمیں اور موسیقی سمائی ہوتی ہے۔ جب اور جہاں جی چاہا، جیب سے موبائل نکالا اور ہر چیز سے لطف اندوز ہونے لگے۔ اس کی افادیت اپنی جگہ مگر غلط استعمال اخلاقیات کا جنازہ نکال رہا ہے۔

مہمان بھی میزبان کے گھر پہنچ کر اہلِ خانہ کی خیریت دریافت کرنے سے پہلے پوچھتا ہے ''آپ کے گھر میں باریک پن والا چارجر ہے؟''

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

◆◆◆

بالِ جبریل

بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے میخانے
یہاں ساقی نہیں پیدا، وہاں بے ذوق ہے صہبا

نہ ایراں میں رہے باقی، نہ توراں میں رہے باقی
وہ بندے فقر تھا جن کا ہلاکِ قیصر و کسریٰ

یہی شیخِ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیمِ بوذرؓ و دلقِ اویسؓ و چادرِ زہراؓ!

حضورِ حق میں اسرافیل نے میری شکایت کی
یہ بندہ وقت سے پہلے قیامت کر نہ دے برپا

ندا آئی کہ آشوبِ قیامت سے یہ کیا کم ہے
'گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا!'

لبالب شیشۂ تہذیبِ حاضر ہے مے 'لا' سے
مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانۂ 'اِلّا'

دبا رکھا ہے اس کو زخمہ ور کی تیز دستی نے
بہت نیچے سُروں میں ہے ابھی یورپ کا واویلا

اسی دریا سے اٹھتی ہے وہ موجِ تند جولاں بھی
نہنگوں کے نشیمن جس سے ہوتے ہیں تہ و بالا

(علامہ اقبالؒ)

ایک صدی قبل کا دلچسپ واقعہ

جب علامہ اقبالؒ نے مجھے ہندوؤں سے لڑوا ڈالا

ممتاز اردو ادیب کے قلم سے ان لمحات کا شگفتہ تذکرہ جو شاعرِ مشرق کی معیت میں بسر ہوئے

ایم۔ اسلم

میں نے ۱۹۰۸ء میں اسلامیہ ہائی اسکول شیرانوالہ گیٹ سے میٹرک کیا اور اردو میں ہائی پرانی منشی کا سرٹیفکیٹ حاصل کر لیا۔ پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ مجھے اسکول کے زمانے سے شعر و شاعری کا بھی شوق تھا۔ اس کے علاوہ ادبی طرز کے چھوٹے چھوٹے مضامین بھی لکھا کرتا۔ یہ مضامین ''کشمیری میگزین'' میں چھپتے جو لاہور سے منشی محمد دین فوق کی زیرِ ادارت ماہ بماہ شائع ہوتا تھا۔

منشی محمد دین فوق کے جناب ڈاکٹر پروفیسر شیخ محمد اقبال سے گہرے مراسم تھے۔ میرے کالج میں سالانہ امتحان کے نتیجہ میں جو انعامات دیے جاتے' ان میں نیچرل شاعری کے لیے بھی ایک انعام تھا۔ ایک بار میں نے ''وسط ایشیا'' کے عنوان سے نظم لکھ کر پیش کر دی۔ شاعری کے انعام کا فیصلہ بھی حضرت ڈاکٹر صاحب نے کرنا تھا۔ پہلا انعام مجھے ملا۔ انعامات پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر دیتے تھے۔ جس روز انعام تقسیم کیے جاتے اسی رات کالج کی ڈراماٹک سوسائٹی ایک ڈراما پیش کیا کرتی اور اس کے بعد انعامی نظم سنوائی جاتی۔ اس موقع پر سب کالجوں کے پروفیسر اور عمائدینِ شہر بھی مدعو ہوتے۔ چناں چہ جب ڈراما ختم ہوا تو مجھے نظم سنانے کو کہا گیا۔

اس زمانے میں لاؤڈ اسپیکر نہیں ہوتے تھے۔ کالج کا وسیع ہال مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ میری آواز بلند تھی اور میں نظم لے سے پڑھا کرتا۔ مجھے یہ کہتے ہوئے فخر محسوس ہوتا ہے کہ نظم بہت پسند کی گئی۔ اگلے روز کالج میں چھٹی تھی۔ ان ایام میں جناب ڈاکٹر پروفیسر شیخ محمد اقبال بار ایٹ لا بھاٹی دروازے رہتے تھے۔ میرا بھی گھر سے کالج آنے جانے کا یہی راستہ تھا۔

گرمیوں کا موسم تھا۔ کالج گیارہ بارہ بجے کے درمیان بند ہو جاتا۔ میرا ایک دوست بھاٹی دروازے ہی میں کہیں رہتا تھا۔ چونکہ اس نے ایف۔ اے میں فلسفہ رکھا ہوا تھا، وہ اکثر ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا۔ میں نے جلسے میں جو نظم پڑھی تب ڈاکٹر صاحب

بھی موجود تھے۔ ہم جب ڈاکٹر صاحب کے مکان کے قریب سے گزرے تو میرا دوست مجھے یہ کہہ کر" آؤ ڈاکٹر صاحب کو سلام کرتے جاؤ۔" اوپر لے گیا۔

ایک کمرے میں دو پلنگ ساتھ ساتھ بچھے تھے۔ ایک پر جناب ڈاکٹر صاحب اور دوسرے پر حضرت گرامی جو فارسی کے مشہور شاعر تھے، استراحت فرما رہے تھے۔ حضرت گرامی جب کبھی لاہور آتے تو ڈاکٹر صاحب کے ہاں ہی قیام فرمایا کرتے۔ چھت پر پنکھا لٹک رہا تھا۔ ایک ملازم دروازے پر بیٹھا جھلنے میں محو تھا۔

ہم نے سلام کیا اور فرش پر بیٹھ گئے۔ اچانک ایک طرف سے ڈاکٹر صاحب کا ملازم علی بخش آ گیا اور مجھے دیکھتے ہی پنجابی میں بولا "اسلم جی تساں رات جلسے میں حد کر دتی۔" (اسلم صاحب، آپ نے رات جلسے میں حد کر دی۔)

حضرت گرامی اونچا سنتے اور اونچی آواز ہی میں ٹھیٹھ پنجابی میں بات چیت کرتے تھے۔ انھوں نے علی بخش سے مخاطب ہو کر کہا:

"اوئے کی کہیا ای؟" (ارے تم نے کیا کہا ہے؟)

علی بخش نے میرا نام لے کر کہا کہ میں نے کالج کے رات کے جلسے میں بڑی پیاری آواز سے ایک نظم سنائی تھی۔ یہ سن کر حضرت گرامی نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا:

"او منڈیا! سانوں وی کجھ سنا۔" (او لڑکے ہمیں بھی کچھ سنا)

میں جب سے کالج آیا تھا، میں نے حضرت ڈاکٹر صاحب کو یہ کبھی نہیں بتایا کہ میں شعر بھی کہتا ہوں۔ میں اشعار کی اصلاح جناب چودھری خوشی محمد ناظم بی۔اے سے بذریعہ خط لیا کرتا تھا۔ ان ایام میں چودھری صاحب ریاست جموں و کشمیر میں عہدۂ وزارت پہ فائز تھے۔ میں شش و پنج میں تھا کہ حضرت گرامی ذرا غصے سے بولے:

"او منڈیا تو سنیا نئی۔" (او لڑکے تم نے سنا نہیں)

میرے دوست نے ہولے سے کہا کہ کوئی شعر سنا دو۔ میں نے کہا "عرض کرتا ہوں۔"

چناں چہ میں نے دو شعر سنائے ؎

تیرا آباد رہے میخانہ مگر اے ساقی
چشم اندوزیِ دل کے تو وہ ساماں نہ رہے
قیس اڑائے نہ جنوں سے جو کہیں گرد و غبار
سرمہ پھر زیب وہ چشم غزالاں نہ رہے

حضرت گرامی بولے:

"اوئے ایہہ تے تیرے استاد و ارنگ اے۔ کوئی ہور سنا۔" (یہ تو تمھارے استاد کا رنگ ہے کوئی اور شعر سنا)

میں نے عرض کیا ؎

جس طرح بنے گزارہ کر
اب زمانہ نہیں شکایت کا

حضرت گرامی خوش ہو کر بولے:

"چنگا شعر اے، ول شعر اے (خوب شعر ہے، اچھا شعر ہے)

حضرت علامہ نے پھر فرمایا: "پھر پڑھو۔"

میں نے یہی شعر پھر پڑھ دیا۔ دو چار منٹ خاموش رہنے کے بعد حضرت علامہ نے فرمایا "اسلم شعر مت کہا کرو، نثر لکھا کرو۔"

کچھ دیر بعد ہم دونوں اجازت لے کر واپس آ گئے۔ مجھے تعجب تھا کہ ایک دو روز پہلے تو مجھے شاعری پر پہلا انعام ملا اور آج شعر کہنے سے منع فرما دیا۔

شش و پنج سے چھٹکارا پانے کی خاطر میں دو چار روز بعد پھر حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ بڑی خندہ پیشانی سے ملے، باتوں باتوں میں، میں نے عرض کیا:

"ڈاکٹر صاحب، (عام و خاص آپ کو ڈاکٹر ہی کہا

کرتے تھے) اس روز آپ نے مجھے شعر کہنے سے منع اور نثر لکھنے کی ہدایت فرمائی۔ میں زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا ہوں کہ انگریزی کہانیاں اردو میں منتقل کر دوں۔"

ارشاد ہوا "کچھ مذائقہ نہیں، فضا بدل دیا کرو۔ لیکن جو کچھ لکھو، قومی نکتہ نگاہ سے لکھو۔ محنت سے سب کچھ ہو سکتا ہے۔" اس سے زیادہ نہ میں نے کچھ پوچھا، نہ حضرت علامہ نے کچھ فرمایا۔

اسی زمانے میں پنجاب گورنمنٹ نے لائل پور (فیصل آباد) میں "پنجاب ایگری کلچرل کالج" فیصل آباد قائم کر دیا۔ یہ تین سال کا کورس تھا۔ پہلے سال کے لیے پنجاب بھر سے صرف تیرہ طالب علم منتخب کیے گئے۔ لاہور ڈویژن سے مجھے لیا گیا۔ ایگری کلچرل کالج میں داخل ہونے والا میں پہلا طالب علم تھا۔ کمشنر لاہور ڈویژن کے حکم سے مجھے گورنمنٹ کالج چھوڑنا پڑا۔ کالج چھوڑنے سے پیشتر میں نے حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہو کر مشورہ کیا۔ آپ نے مسکرا کر صرف اتنا کہا "حکم حاکم مرگ مفاجات۔"

میں پانچ سال لاہور سے باہر رہا۔ دو سال بعد گورنمنٹ نے مجھے محکمۂ انہار میں بطور ضلعدار لے لیا۔ میں نے صرف تین سال ملازمت کی پھر استعفا دے دیا۔ ملازمت کے دوران دو سال سے زیادہ میں ان علاقوں میں رہا جہاں کے رہنے والوں کو "جانگلی" کہا جاتا ہے۔ ان لوگوں کی تہذیب، رسم و رواج، عادات اور زندگی میں قدم قدم پر روحانیت جلوہ گر نظر آتی۔ گویا مذہب کے نقطۂ نظر سے وہ "اصلی مسلمان" تھے۔

ملازمت کے دوران میں ہر سال تین چار بار رخصت پر لاہور آتا اور آتے ہی حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ آپ جانگلیوں کے حالات بڑے شوق سے سنتے اور ان کی زندگی کو فطری زندگی کہتے۔ کبھی مسکرا کر مجھے فرماتے:

"اسلم! تم بہت خوش نصیب ہو کہ رومانوں کی دنیا میں رہتے ہو۔ افسانوں کے لیے تمھیں بہت مواد ملتا ہو گا۔ اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرو۔"

بالِ جبریل سے انتخاب

گیسوئے تاب دار کو اور بھی تاب دار کر
ہوش و خرد شکار کر، قلب و نظر شکار کر

عشق بھی ہو حجاب میں، حُسن بھی ہو حجاب میں
یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر

تُو ہے محیطِ بے کراں، میں ہوں ذرا سی آبجو
یا مجھے ہمکنار کر یا مجھے بے کنار کر

میں ہوں صدف تو تیرے ہاتھ میرے گہر کی آبرو
میں ہوں خزف تو تُو مجھے گوہرِ شاہوار کر

نغمۂ نو بہار اگر میرے نصیب میں نہ ہو
اس دمِ نیم سوز کو طائرک بہار کر

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے، اب مرا انتظار کر

روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل
آپ بھی شرمسار ہو، مجھ کو بھی شرمسار کر

(علامہ اقبال)

اور یہ حقیقت ہے کہ بسلسلہ ملازمت میں جتنا عرصہ جانگلیوں کے علاقے میں رہا، میرا قلم انہی لوگوں کے رومانوں اور عجیب عجیب واقعات کی دنیا آباد کرتا رہا۔ میرے افسانے اردو ادبی رسائل میں کثرت سے شائع ہوتے۔ اس زمانے میں معاوضہ لینے کی رسم بالکل مفقود تھی۔

چودھری محمد حسین ایم۔اے ان ایام میں سول سیکرٹریٹ میں ملازم تھے (پھر پریس برانچ کے سیکرٹری ہوگئے)۔ آپ فرصت کے لمحات حضرت علامہ کی خدمت میں گزارتے۔ حضرت علامہ کو بھی ان سے دلی لگاؤ اور محبت تھی۔ چودھری صاحب کبھی کبھی میرا کوئی افسانہ حضرت علامہ کو سنایا کرتے تھے اور بذریعہ خط ان کی رائے سے بھی مطلع کرتے۔ مجھے حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کا ارشاد یا ہدایت ابھی تک یاد تھی: "اسلم! جو کچھ لکھو، قومی نقطۂ نظر سے لکھو۔" چناں چہ میں جو کچھ لکھتا رومانی رنگینیوں کے ساتھ ساتھ ان میں قومی رنگ بھی خوب نمایاں ہوتا۔ یعنی وہی بقول حضرت علامہؒ ؎

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پَر نہیں، طاقت پرواز مگر رکھتی ہے

یہ وہ زمانہ تھا جب کانگریس اور ہندو مہا سبھا شدت سے مسلمانوں کی مخالفت کر رہی تھیں۔ اور انگریزی حکومت ان کی پیٹھ ٹھونکتی۔ اسی زمانے میں، میں نے انگریزی کی ایک مزاحیہ کہانی، The jumping Frog کو مرزا مینڈکی کے نام سے اردو کا جامہ پہنایا۔ اس افسانے کو قدرت الٰہی نے بہت قبولیت بخشی۔ حضرت علامہ علیہ الرحمۃ نے بھی بہت پسند فرمایا۔

میں پھر ملازمت چھوڑ کر لاہور چلا آیا اور لکھنا پڑھنا ہی میرا اوڑھنا بچھونا بن گیا۔ ایک روز حضرت علامہ نے مجھے فرمایا کہ میں اسی رنگ میں کانگریس اور مہا سبھا سے متعلق بھی لکھوں۔ لیکن مضمون ذاتیات سے پاک ہو، صرف ہندو کی اسلام دشمنی، تنگ نظری اور غلامانہ ذہنیت کو مزاح کے رنگ میں کسی افسانے میں شامل کر دیا کروں...... افسانے کا نام یا عنوان کچھ بھی ہو، لیکن افسانہ ذاتیات سے بالکل پاک ہو۔

میں نے حضرت علامہؒ کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے تین چار مہینے محنت سے مزاحیہ مضامین لکھے، ایک مجموعہ ترتیب دیا اور اس کتاب کا نام "مرزا جی" رکھا۔ جس روز کتاب تیار ہوئی میں نے ایک جلد حضرت علامہ کی خدمت میں پیش کر دی۔ آپ سرورق کی تصویر دیکھ کر مسکرا اٹھے۔

"مرزا جی" اردو دان طبقے میں بہت مقبولیت ہوئی۔ لیکن ہندو اس سے بہت برہم ہوئے۔ ہندوستان کے تمام ہندو اخبارات میرے اور مرزا جی کے خلاف خوفناک حد تک غوغا آرائی مرزا کرنے لگے۔ حکومت سے پُرزور یہ مطالبہ ہونے لگا کہ "مرزا جی" بحق سرکار ضبط کر کے مصنف کو پنجاب "بدر" کر دیا جائے۔ لاہور میں ہندو روزنامے "ٹریبیون" انگریزی "ملاپ" اور "پرتاپ" میں ہر روز مرزا جی اور میرے متعلق بڑی شدت سے زہر اگلا جانے لگا۔ بنگال میں ہندوؤں کا مشہور اخبار، امرت بازار پتریکا بھی بڑی شدت سے ہندو عوام کے مطالبے کی شد و مد سے حمایت کرتا۔

پنجاب گورنمنٹ کا چیف سیکرٹری، مسٹر گاربٹ اپنی تند مزاجی کے باعث بہت بدنام تھا۔ چودھری محمد حسین اس وقت پنجاب پریس برانچ کے سیکرٹری تھے۔ ایک روز انھوں نے مجھے بتایا کہ مسٹر گاربٹ نے حکم دیا ہے "مرزا جی" کے جن مضامین پر ہندوؤں کو اعتراض ہے، اس کا انگریزی میں ترجمہ کرا کر حکومت کے پاس بھیج دیا جائے۔"

ہندوؤں کی اس غوغا آرائی سے میرا سارا خاندان بہت پریشان تھا۔ میں ہر روز حضرت علامہؒ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا۔ جب بھی حضرت علامہ کو ہندوؤں کی غوغا آرائی کی طرف توجہ دلاتا تو آپ مسکرا کر ہمیشہ یہی فرماتے "کچھ نہیں ہوگا۔"

وقت گزر رہا تھا۔ ہندو پریس میرے اور میری کتاب "مرزا جی" کے خلاف زہر اگلتا رہا۔ کچھ عرصہ بعد ایک روز چودھری محمد حسین نے مجھے اپنے دفتر سے ٹیلی فون کیا اور کہا "مبارک ہو، مسٹر گاربٹ (چیف سیکرٹری پنجاب نے فیصلہ کر دیا اور لکھا ہے:

Mirzaji is humourous and harmless. No action is needed.

(مرزا جی مزاحیہ اور بے ضرر ہے۔ اس کے خلاف کسی اقدام کی ضرورت نہیں۔)

میں اسی روز حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور چودھری محمد حسین نے مجھے ٹیلی فون پر جو کچھ کہا تھا، وہ بھی عرض کر دیا۔ یہ سن کر حضرت علامہ نے حسب دستور مسکرا کر فرمایا "میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا، کچھ نہیں ہوگا۔" پھر باتوں باتوں میں پہلی بار مجھے کتاب کے متعلق مسکرا کر فرمایا: "میں نے "مرزا جی" پڑھا ہے۔ خوب لکھی ہے آپ نے۔"

علامہ کی خدمت میں کالج کے طلبا بھی فیض و برکت حاصل کرنے اکثر آیا کرتے تھے۔ مختلف موضوع پر بحث بھی ہوتی۔ حضرت علامہ بڑی خندہ پیشانی سے مسکرا مسکرا کر ان سے باتیں کرتے۔ قومیت کا موضوع اکثر زیر بحث رہتا۔ حضرت علامہ فرمایا کرتے تھے کہ انسان کی عزت (کردار) سے ہے۔ خصوصیت سے قومی کردار پر بہت زور دیتے۔ آپ کا ارشاد تھا کہ مسلمان کی پہچان صرف اس کے کردار سے ہوتی ہے۔ آپ کو نوجوانوں میں قومی جذبہ دیکھنے کی بہت آرزو رہتی۔

مخلوط تعلیم کے سختی سے مخالف تھے۔ گرمیوں کا موسم تھا، حضرت علامہ حسب دستور برآمدے سے باہر پلنگ پر لیٹے تھے۔ چودھری محمد حسین اور میں کرسیوں پر بیٹھے تھے کہ پردے کے متعلق باتیں ہونے لگیں۔ اتنے میں ایک صاحب بائیسکل پر آئے۔ گھبرائے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ انھوں نے آتے ہی بائیسکل زمین پر ڈال دی اور حضرت علامہ کو سلام کر کے کہا:

"ڈاکٹر صاحب! آج خلیفہ شجاع الدین نے سینٹ میں مخلوط تعلیم کا ریزولیشن منظور کرا لیا۔" خلیفہ شجاع الدین انجمن حمایت اسلام لاہور کے جنرل سیکرٹری تھے۔ یہ سنتے ہی حضرت علامہ کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ آپ نے پلنگ پر زور سے ہاتھ مار کر فرمایا "آج مسلمانوں کی بدبختی پر مہر لگ گئی۔"

مجھے حضرت علامہ کے درج ذیل تین شعر بہت پسند ہیں۔

خدا تو ملتا ہے لیکن بشر نہیں ملتا
یہ چیز وہ ہے جو دیکھی کہیں کہیں میں نے

☆☆

اجاڑا ہے تمیزِ ملت و آئین نے قوموں کو
میرے اہل وطن کے دل میں کچھ فکر وطن بھی ہے

☆☆

خدا کے بندے تو ہیں ہزاروں، بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندے سے پیار ہو گا

(ایم اسلم اردو کے ممتاز افسانہ نگار اور ناول نگار گزرے ہیں۔ سطحی جذبوں سے مبرا رومان اور قومی مسائل آپ کی تخلیقات کے موضوع تھے) ◆◆◆

تازہ افسانہ

دورِ جدید کے انسانوں نے زمانے کو بنایا

ایک بدقسمت بیوی کی غمناک کتھا، بے حیائی کا سیلاب اُسے بیٹھے بٹھائے تباہ و برباد کر گیا

توقیر عائشہ

ریحان نے گھڑی پر نظر ڈالی، میز سے اٹھا اور حسب معمول کل کے کاموں کی خاطر کمرا ترتیب دینے لگا۔ یہ اس کی عادت تھی تاکہ دوسرے دن جب دفتر آئے تو دن کا آغاز ترتیب سے ہو۔ زندگی میں نظم و ضبط کی عادت نے اسے کئی فائدے پہنچائے تھے جن میں سے ایک جدہ میں اس کی یہ شاندار ملازمت تھی۔

وہ جدہ میں پاکستانی سفارت خانے کے ایک ذیلی دفتر میں اہم عہدے پر فائز تھا۔ کمرے پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے اس نے دیکھا کہ ملاقاتیوں کے لیے رکھے گئے صوفے پر ایک بٹوہ پڑا تھا۔ وہ ٹھٹک گیا کہ یہ کون ہو سکتا ہے جسے پورا دن گزار کر بھی یاد نہ آیا کہ میرا بٹوہ کہاں ہے۔ تمام ملاقاتیوں کو ذہن میں لانے سے بہتر تھا کہ وہ اسے کھول کر نام و پتا معلوم کرنے کی کوشش کرتا۔

بٹوہ کھولا، کچھ رسیدیں تھیں اور چند ریال، وزٹنگ کارڈز اور کچھ تصاویر۔ اوہ، یہ تو اس کے دوست راشد کی پاسپورٹ سائز تصویر تھی۔ اس سے پرسوں سفارت خانے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے سرراہ ملاقات ہوئی تھی۔ ریحان نے اسے اپنے دفتر آنے کی دعوت دی۔ وہی آج ملنے آیا تھا۔

ریحان کے چہرے پر مسکراہٹ تیر گئی۔ یہ ہیں سدا کے لاپروا راشد! کالج میں تھا، تو کیفے ٹیریا میں کتابیں چھوڑ جانا، بل ادائی کے بعد بقایا رقم چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہونا، بائیک میں پٹرول ڈلواتے وقت ٹنکی کا ڈھکنا ڈالنے والے کے ہاتھ میں تھما کر اِدھر اُدھر ڈھونڈنا اسے سب یاد آ گیا "تو تم اب تک نہیں سدھرے۔" اس نے سوچا اور بے دھیانی میں بقیہ دو تصاویر دیکھنے لگا۔

یہ کسی خاتون کی تصویر تھی۔ ہو سکتا ہے بیوی ہو اور دوسری تصویر...... اسے زبردست جھٹکا لگا۔ وہ بھی ایک خاتون ہی کی تھی...... مگر ہو بہو شیما سے ملتی جلتی، اس کی اپنی بیوی! پرتکلف لوازمات سے سجی میز پر بیٹھی، بے ساختہ مسکراتے ہوئے! تصویر اتنی واضح تھی کہ اس کے گال پر پڑنے والے گڑھے بھی نمایاں تھے۔ پس منظر میں ایک معروف ریستوران کا مخصوص نشان نظر آ رہا تھا۔ وہ الجھن میں پڑ گیا۔ آخر راشد سے اس کا کیا تعلق ہے؟ کبھی شیما نے کسی حوالے سے راشد کا ذکر تو نہیں کیا۔

اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف راشد ہی تھا۔ اسے اب یاد آ گیا تھا کہ بٹوہ ریحان کے دفتر میں ہو سکتا ہے۔ اسی کے متعلق پوچھ رہا تھا۔ ریحان کے منہ سے آوہاں کے بے ربط جملے نکلے۔ اُدھر راشد بھی کچھ جلدی میں تھا، کل آنے کا کہہ کر کال ختم کر دی۔ ریحان بے مقصد تصویروں کو گھورتا رہا۔ پھر بٹوہ دراز میں رکھ کر چابی گھمائی اور بوجھل قدموں سے لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔

......☆......

"پھپھو! منگنی تک تو رک جائیں گی نا!" شیما نے لندن سے آئی اپنی پھوپھو کے پاس بیٹھ کر بڑی امید سے پوچھا۔

"نہ بیٹا! یہاں کے حالات کا کچھ بھروسہ نہیں، پندرہ دن کے لیے آئی تھی، بارہ تو پر لگا کر ہی اڑ گئے۔ تقریب جلد ہوتی تو شاید شریک ہو جاتی۔" پھپھو نے صاف جواب دے دیا۔

"تو کیا ہوا، ہم تقریب جلد کر لیتے ہیں۔" یاسر نے کہا جو ابھی کمرے میں داخل ہوا تھا۔ بات یہ تھی کہ شیما کا رشتہ طے ہوا چکا تھا۔ اب لڑکے والے منگنی کی تقریب رکھنا چاہ رہے تھے۔ شیما کی امی نے جو بچوں کے یہ ارادے سنے تو ہڑبڑا گئیں۔ کہنے لگیں "ہال کی بکنگ، مہمانوں کا چناؤ، کھانے کا انتظام، لین دین، کیسے ہوگا اتنی جلدی سب کچھ؟"

"ارے امی! سب کچھ ہو جائے گا، آپ ابو سے بات تو کریں۔" یاسر نے جوش سے کہا۔

"بھابی! ایک رسم تو میرے سامنے کر لیجیے۔ پھر آپ جاتی رہیے گا لڑکے والوں کے ہاں۔" پھپھو کو یہ پروگرام بڑا اچھا لگا۔

"تقریب تو خیر اب ایک ہی دن ہوتی ہے۔ لڑکے کو وہیں بلا لیتے ہیں۔ جو لین دین ہونا ہے، وہیں کر لیں گے۔" شیما کی امی نے کہا۔

"بھابی! یہ تو اور اچھا ہے۔ ورنہ دو دن وقت نکالو۔ اور اخراجات بھی کرو۔"

نند کو سمجھاتے ہوئے امی کہنے لگیں "ارے سمیں! میں اخراجات تو ٹھیک ٹھاک ہی آتے ہیں۔ لڑکے والے بھی تو اپنے مہمان لاتے ہیں۔ اب ہم ان سے یہ تھوڑی کہیں گے کہ آدھے اخراجات آپ اٹھائیں۔"

"تو بھابی! آپ نکاح ہی کر لیں۔" سمیں نے مشورہ دیا۔

"نہیں بھئی!" وہ جو منگنی کرنے سے ڈر رہی تھیں، اب نکاح کے مشورے پر بہت گھبرا گئیں۔ "بس منگنی ہی ٹھیک ہے۔ منگنی کے بعد ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع

مل جاتا ہے، ہم آہنگی ہو جاتی ہے۔ نکاح کر کے پھنس گئے تو برا ہوگا۔"

ثمین نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "بھابی! زمانہ کتنا بدل گیا ہے۔ پہلے تو لڑکا لڑکی کا ایک دوسرے کو دیکھنا، بات کرنا بڑا معیوب سمجھا جاتا تھا۔" وہ لندن میں رہتے ہوئے بھی پرانا زمانہ یاد کر رہی تھیں۔

"بس زمانے کے ساتھ تو چلنا ہی پڑتا ہے ورنہ لڑکی اپنے گھر بیٹھی رہے۔" شیما کی امی نے اٹھتے ہوئے کہا اور ابو سے بات کرنے کمرے کی طرف چل دیں۔

......☆......

منگنی کا دن جلد آ گیا۔ شیما پارلر سے تیار ہو کر آئی۔ لڑکے کی تیاری بھی دیدنی تھی۔ دونوں ساتھ بیٹھے بڑے پیارے لگ رہے تھے۔ مٹھائی، انگوٹھیوں کا لین دین، فوٹو سیشن سب ہی کچھ ہوا، بس نکاح ہی کی کسر رہ گئی۔

مہمانوں کے تعریفی کلمات دونوں کو بھرپور اعتماد دے گئے۔ پُرتکلف کھانے کے بعد تقریب اختتام کو پہنچی۔ دوسرے ہی دن پھپھو لندن روانہ ہو گئیں۔

اگلے ہفتے لڑکے گھر والوں نے پھر پُرتکلف دعوت رکھ لی جو ایک بڑے ہوٹل میں تھی۔ دونوں نے ملبوسات اور کچھ نئی تیاریوں کے ساتھ شریک ہوئے۔ دونوں خاندان روشن خیال تھے لہٰذا کبھی فون پر، کبھی ہوٹل میں اور کبھی تفریحی مقام پر ملاقاتوں کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ آپس میں ہم آہنگی کے اب یہی طریقے رواج پا چکے۔

ابتدا کی فطری جھجک قدرے بے تکلفی میں بدل گئی۔ بلکہ شیما تو ابھی سے ہونے والے شوہر کی "کلاس" لینے لگی۔ "اس دن تائی امی کے ہاں کیوں نہیں آئے؟"...... "خاکی پتلون کے ساتھ سفید قمیص کیوں نہیں پہنی۔ اسکول یونیفارم لگ رہا ہے؟......
"اس دن کھانے پر ماموں کو اتنی لمبی کال کیوں کی؟" ساتھ فرمائشیں بھی جاری رہتیں۔

مشین میں لگانے کی خاطر ایک دھاتی پرزے کی قوت برداشت جانچنے کے لیے اسے آزمائشی مدت سے گزارنا سمجھ آنے والی بات ہے۔ مگر دو جیتے جاگتے انسانوں کے نازک جذبات و احساسات ہم آہنگی کے نام پر آزمائش کی بھٹی سے گزارنا کبھی کبھی سنگین کھیل ثابت ہوتا ہے۔ اس سے مرد کو تو کوئی فرق نہیں پڑتا مگر صنف نازک کے حصے میں عموماً رسوائی ہی آتی ہے۔

وہ جرح جو شیما بلا شرکت غیرے اپنا حق سمجھ کر کرتی تھی، اس نے منگیتر کی رائے کو بدل دیا۔ لڑکے کے ذہن میں یہ خیال جونک کی طرح چمٹ گیا کہ ایسی روک ٹوک کے ساتھ زندگی گزارنا مشکل ہو جائے گا...... چناں چہ اس نے بڑی آسانی سے منگنی توڑ دی کہ نکاح تو ہوا نہ تھا۔

لڑکے کو نیا رشتہ مل ہی جاتا، البتہ کئی دن منگنی رہنے اور اپنی سہیلیوں کو منگیتر کے ساتھ گزرے خوشگوار لمحات کی روداد سنانے کے بعد ساری رسوائی شیما کے حصے میں آئی۔ یہ تو ابھی رسوائی کی محض پہلی قسط تھی۔

مسترد کیے جانے کے احساس نے اس کی روح کو بوجھل کر دیا۔ اب کسی سے کہنے سننے کی کوئی بات ہی نہ رہی تھی۔ دل چاہتا، کمرا بند کیے بیٹھی رہے۔ والدین کے لیے بھی یہ ایک بڑا صدمہ تھا۔ اب کوئی نیا رشتہ دور دور تک آنے کا امکان نہ تھا۔ خاندان میں موجود تمام لڑکوں کی

مائیں نیک اور پارسا دلہنوں کی تلاش میں تھیں۔ منگیتر سے گپ شپ کرنے والی شیما انھیں ایک آنکھ نہ بھاتی۔ حالانکہ یہ وہی تھیں جو منگنی کے موقع پر "ماشا اللہ! بڑی خوبصورت جوڑی ہے" کہہ رہی تھیں۔ اب انھیں اس گھر میں جھانکنا اور میل رکھنا بھی گوارا نہ تھا کہ کہیں شیما کی امی رشتے کے لیے ان ہی کی طرف اشارہ نہ کر بیٹھیں۔

یوں بھرے پرے خاندان کے ہوتے ہوئے بھی اب وہ تنہا رہ گئے۔ بس کسی طرح وقت گزر رہا تھا، امنگ، جوش اور کسی زندہ دلی کے بغیر! اب والدین اس فکر میں تھے کہ ملک سے باہر کا کوئی رشتہ آ جائے۔ ایسے میں ہی پھپھو کام آئیں۔ انھیں اپنی سہیلی کے توسط سے جدہ میں رہائش پذیر ایک صاحب حیثیت خاندان سے ملاقات کا موقع ملا۔ ان کا بیٹا پاکستانی سفارت خانے میں اہم عہدے پر فائز تھا۔ یہ ریحان تھا۔ چند ملاقاتوں میں بات بن گئی۔ شیما سے فوری نکاح طے پا گیا۔ تین ماہ کاغذات کی تیاری میں لگے اور یوں وہ جدہ پہنچ گئی۔ نئی زندگی کی خوش رنگیوں نے پچھلی تلخیوں کو بھلا دیا۔ والدین بھی مطمئن تھے۔ زندگی کی گاڑی ہموار رستے پر رواں دواں تھی کہ ایک خوفناک گڑھا آ گیا۔

......☆......

ریحان گھر پہنچا تو بے حد الجھا ہوا تھا۔ تصویر کے بارے میں کس سے پوچھے؟ شیما سے، مگر وہ تو بھائی کی شادی میں پاکستان گئی ہوئی تھی۔ سوچا، راشد کل آئے گا، کل تک انتظار کرنا ہی بہتر ہے۔ مگر وقت تو جیسے ٹھہر گیا تھا۔ صبح وہ وقت سے کچھ پہلے ہی دفتر جا پہنچا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی بٹوہ نکال کر تصویر دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ اس کے پاس بسلسلہ کام لوگ آنے لگے۔ وہ الجھن سے نجات پا کر مصروف ہو گیا۔ راشد دوپہر کو فارغ ہوا تو ریحان کے پاس پہنچا۔ ریحان نے اپنی پریشانی ظاہر کیے بغیر خوشدلی سے اس کا استقبال کیا اور بٹوہ نکال کر میز پر رکھ دیا۔

"معاف کرنا یار! میں نے مالک کا پتا لگانے کے لیے اسے کھول کر دیکھ لیا تھا۔ مگر اب پتا چلا کہ آپ اب بھی جیب میں خواتین کی تصاویر لیے گھومتے ہیں۔" ریحان نے موڈ خوش گوار بناتے ہوئے کہا۔

راشد یہ سن کر ہنسا۔ بٹوہ میز پر الٹ دیا اور کہا "ارے بھائی! ایک تصویر تو میری بیوی کی ہے۔ دوسری میری سابقہ منگیتر کی۔"

ریحان کو ایک دم جھٹکا لگا مگر اپنی حالت پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔ "اب تو تم نے شادی بھی کر لی ہے۔ اسے اب تک نہیں بھولے؟"

"نہیں، نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ اصل میں وہ زندگی کا ایک اہم دور تھا میرے لیے! یار! ایک خوبصورت لڑکی کے ساتھ وقت گزارنا کسے برا لگتا ہے۔ اب یہ اور بات کہ وہ قسمت میں نہیں تھی۔"

ریحان نے سنبھل کر پوچھا "ہوا کیا تھا آخر؟"

راشد نے بے پروائی سے جواب دیا "بس اس کے ساتھ ہم آہنگی نہیں ہو سکی۔"

"تمھاری بیگم تصویر جیب میں لیے پھرنے پر اعتراض نہیں کرتی؟" ریحان نے سوال کر ڈالا۔

راشد نے فوراً تردید کر دی۔ "ارے نہیں، میری بیگم تو کھلے ذہن کی مالک ہے۔ وہ تو ایسی تصویریں دیکھ کر لطف اٹھاتی ہے۔ میرے پاس تو سابقہ منگیتر کی اور

بھی تصویریں ہیں۔" راشد نے چائے رکھتے ہوئے کہا "اچھا اب اجازت دو۔ مجھے بیگم کے ساتھ ایک دوست کے گھر جانا ہے۔"

وہ تو چلا گیا مگر ریحان کے دماغ میں دھماکے ہونے لگے..... اچھا تو یہ اس کی سابقہ منگیتر تھی۔ کتنی خوش نظر آ رہی تھی تصویر میں! پتا نہیں کہاں کہاں گھومے پھرے ہوں گے۔ نجانے بات کہاں تک پہنچی ہو گی۔ کیا کچھ نہ کہا ہو گا ایک دوسرے سے۔ نہ جانے.....؟ ذہن میں انتشار تھا۔ خاکے بن اور بگڑ رہے تھے۔ اگر راشد اپنی بیوی کے ساتھ خوش ہے تو شیما کی تصویر لیے کیوں گھومتا ہے؟ وہ تو کہتا ہے کہ میری بیوی کھلے ذہن کی ہے۔ لیکن ایسا ہوتا تو بیگم راشد آپ کی مجبوری ہے، اس کے علاوہ آپ کر بھی کیا سکتی ہیں؟ مگر کھلے ذہن کا مالک ہونا میری مجبوری نہیں۔ آج وہ دفتر جلد آیا تھا اور جلد ہی اٹھ بھی گیا۔ اسے چند ضروری کام نمٹانے تھے۔

☆

شیما کے بھائی کی شادی کو ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ دو دن بعد شیما کی واپسی تھی۔ ادھر ریحان کے ضروری کام بھی انجام کو پہنچ گئے۔ واپسی والے دن ہی "ریپڈ کوریئر سروس" سے شیما کو ایک لفافہ موصول ہوا۔ ان خاص دستاویز میں ریحان اور شیما کے قانونی تعلق ختم ہونے کا واضح اعلان درج تھا۔

شیما کی والدہ کا خیال تھا' زمانے کا ساتھ نہ دیا تو بیٹی گھر بیٹھی رہ جائے گی۔ بیٹی تو پھر بھی واپس آ گئی۔ زمانہ ایسا معبود ہے جو اپنی پرستش کرنے والوں کو بڑا تکلیف دہ بدلہ دیتا ہے۔ پھر بھی اس کی پوجا زور و شور سے جاری ہے۔

◆◆◆

بالِ جبریل سے انتخاب

غلامی کیا ہے ذوقِ حُسن و زیبائی سے محرومی
جسے زیبا کہیں آزاد بندے ہے وہی زیبا

بھروسا کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردانِ حُر کی آنکھ ہے بینا

وہی ہے صاحبِ امروز جس نے اپنی ہمت سے
زمانے کے سمندر سے نکالا گوہرِ فردا

فرنگی شیشہ گر کے فن سے پتھر ہو گئے پانی
مری اکسیر نے شیشے کو بخشی سختیِ خارا

رہے ہیں اور ہیں فرعون میری گھات میں اب تک
مگر کیا غم کہ میری آستیں میں ہے یدِ بیضا

وہ چنگاری خس و خاشاک سے کس طرح دب جائے
جسے حق نے کیا ہو نیستاں کے واسطے پیدا

محبت خویشتن بینی' محبت خویشتن داری
محبت آستانِ قیصر و کسریٰ سے بے پروا

عجب کیا گر مہ و پرویں مرے نخچیر ہو جائیں
'کہ بر فتراکِ صاحب دولتے بستم سرِ خود را'

(علامہ اقبال)

دنیا میں مسلم حکومتوں کا طوطی بولتا

ترکی جب سپرپاور تھا

عثمانی ترک خلافت کے خلاف مغربی ممالک کی سازشوں اور اپنوں کی غداری کا عبرت ناک قصہ

محسن فارانی

یہ ۶۹۹ھ/۱۳۰۰ء کی بات ہے جب اناطولیہ یا ایشیائے کوچک (موجودہ ترکی) میں ترکمان سردار عثمان خان نے عالم اسلام کی سب سے بڑی سلطنت کی بنیاد ڈالی جو تاریخ میں سلطنت عثمانیہ کہلاتی ہے۔ عثمانی سلطنت کے تیسرے سلطان مراد اوّل نے یورپ میں فتوحات کے جھنڈے گاڑے۔ ادرنہ (ایڈریانوپل) اور فلپ پولس (بلغاریہ) کی فتح کے بعد سلطان مراد اوّل نے خلیفۃ المسلمین کا لقب بھی اختیار کر لیا۔

تاہم عالم اسلام میں مصر کی خلافت عباسیہ کی مرکزی حیثیت مسلم رہی۔ چناں چہ سلاطین ہند محمد تغلق اور فیروز تغلق نے قاہرہ ہدایا بھیج کر عباسی خلیفہ ہی سے سندِ حکومت حاصل کی تھی۔ ساتویں عثمانی سلطان، محمد ثانی نے قسطنطنیہ (شہرِ قیصر) فتح کر کے گیارہ سو سال سے قائم بازنطینی رومی سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔ یوں وہ حدیثِ رسول ﷺ پہ پورا اترنے والا مجاہد بن گیا۔ تاریخ نے اسے محمد فاتح کا لقب دیا۔

خلافت عثمانی ترکوں کو منتقل ہو گئی

سولھویں صدی عیسوی کے اوائل میں پرتگالی مسیحی ہندوستان اور جزائر شرق الہند (انڈونیشیا و ملایا) کی بندرگاہوں سے لے کر ہرمز (ایران)، مسقط (عمان) اور عدن (یمن) تک پھیل گئے۔ ان کے بحری حملوں سے ارض حرمین تک کو خطرات لاحق تھے۔ جب کہ ممالیک مصر جن کی عملداری میں حجاز شامل تھا، کمزور پڑ چکے تھے۔ ان حالات میں نویں عثمانی سلطان سلیم اول (۱۵۱۲ء۔۱۵۲۰ء) نے شام و مصر فتح کر کے حجاز کو بھی اپنی تحویل میں لے آخری عباسی خلیفہ متوکل علی اللہ سے منصب خلافت حاصل کر لیا۔ یوں خلافت عباسیوں سے عثمانی ترکمانوں کو منتقل ہو گئی اور قاہرہ کے بجائے قسطنطنیہ دارالخلافہ قرار پایا۔

عثمانیوں کی یورپ میں فتوحات

دسویں عثمانی خلیفہ سلیمان اعظم (۱۵۲۰ء۔۱۵۶۶ء) نے یورپ میں فتوحات کا دائرہ ہنگری سے آگے آسٹریا کی حدود تک پھیلا دیا۔ اس کے جانشین سلیم ثانی نے بحیرہ روم میں قبرص کا صلیبی مرکز فتح کر لیا۔ سلیم ثانی کے فرزند خلیفہ مراد ثالث کے عہد (۱۵۷۴ء۔۱۵۹۵ء) میں اسلامی سلطنت و خلافت کو جو عروج حاصل ہوا، اس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔

تب خلافت عثمانیہ تقریباً ۲ کروڑ مربع کلومیٹر پر محیط تھی۔ مشرق میں اس کی عملداری میں ریاست آچے (انڈونیشیا) مغرب میں سلطنت فاس (مراکش)، جنوب میں افریقا کے اندر ریاست بورنو (نائیجیریا) اور بگیرمی (چاڈ) اور ریاست ممباسہ شامل تھیں اور شمال میں یورپ کے اندر یونان، مقدونیہ، البانیہ، کوسوو، مونٹی نیگرو، سربیا، بوسنیا و ہرزیگووینا، کروشیا، سلاوینیا، ہنگری، رومانیہ، بلغاریہ، مالدووا، یوکرائن، آرمینیا اس کا حصہ تھے۔ غرض سولھویں اور سترھویں دو صدیاں عثمانی سلطنت و خلافت کے عروج و کمال کا زمانہ تھیں۔ ایران کی صفوی سلطنت، ہندوستان کی مغل بادشاہت اور سمرقند و بخارا اور خوارزم کی ریاستوں کے سوا پورا عالم اسلام ایک مرکز خلافت کے تحت جمع تھا۔

اسلامیوں کا وقار عروج پر

اس دوران مغرب میں غرناطہ (اندلس) اور مشرقی یورپ میں قازان (موجودہ تاتارستان) اور استراخان کی مسلم تاتاری ریاستوں پر مسیحی قابض ہو گئے۔ سقوط غرناطہ (۱۴۹۲ء) اور روس کے ہاتھوں سقوط قازان (۱۵۵۲ء) اور سقوط استراخان (۱۵۵۵ء) کے المیوں سے قطع نظر خلافت عثمانیہ کے دم قدم سے دنیا بھر میں اسلام کا وقار اور دبدبہ قائم تھا۔ حتیٰ کہ ملکہ انگلستان الزبتھ اول نے ۱۵۸۰ء کی اسپین کے خلاف بحری جنگ میں عثمانی بحریہ کی معاونت پر خلیفہ مراد ثالث کو شکریے کے خطوط لکھے۔

دنیا بھر کے حکمران اور بادشاہ عثمانی خلیفہ کا دم بھرتے۔ قسطنطنیہ (استنبول)، ادرنہ، بلغراد، ایتھنز، بوداپسٹ، حلب، اسکندریہ، سرائیوو، انطاکیہ، قاہرہ، طرابلس (لبنان)، دمشق، موصل، بغداد، بصرہ، تونس، الجزائر، فاس، خرطوم، مسقط، ممباسہ، بیت المقدس، بورنو، عدن، طرابلس (لیبیا) خلافت اسلامیہ کے قابل فخر اور پھولتے پھلتے شہر تھے۔ ان کے درمیان مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے آفتاب و ماہتاب جگمگاتے۔

جب خلافت میں دراڑیں پڑیں

عثمانی خلافت میں کمزوری کی پہلی علامت ۱۶۸۳ء میں نمودار ہوئی۔ تب عثمانی ترکوں کو وی آنا (آسٹریا) کے دوسرے محاصرے میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ تین سال بعد ہنگری ترکوں کے ہاتھ سے نکل گیا جو ۱۵۲۶ء سے ترکوں کے زیر تسلط تھا۔ اگلی سوا دو صدیوں میں روس اور آسٹریا کی مسیحی بادشاہتیں طاقت پکڑ کر بار بار عثمانی سلطنت سے ٹکراتی رہیں۔

انیسویں صدی عیسوی میں فرانس اور برطانیہ (انگلستان) بھی سلطنت عثمانیہ کے خلاف محاذ آرائی میں شامل ہو گئے۔ ان مسیحی طاقتوں کی سازشوں اور پے در پے حملوں سے یونان، رومانیہ، مالدووا، بلغاریہ، مونٹی نیگرو، سربیا، بوسنیا و ہرزیگووینا، کروشیا و سلاوینیا، جارجیا اور کریمیا (یوکرائن) عثمانیوں کے ہاتھ سے نکل گئے۔ ادھر الجزائر اور تیونس پر فرانس اور مصر و سوڈان، عدن (یمن) اور عمان (مسقط) پر برطانیہ نے تسلط جما لیا۔ بایں ہمہ خلافت عثمانیہ کا پرچم البانیہ و مقدونیہ سے لے کر بغداد و بصرہ اور حدود یمن تک لہراتا تھا اور حرمین شریفین اسی کی عملداری میں تھے۔

مراد ثالث جس کے دور میں خلافت عثمانیہ اپنے عروج پر پہنچی

یورپ کا مرد بیمار

۱۸۲۶ء میں سلطان محمود ثانی نے عثمانی افواج کے بازوئے شمشیر زن ینی چری فوج کو توڑ دیا۔ سلطان عبدالمجید اول (۱۸۳۹ء۔۱۸۶۱ء) کے عہد میں انگریزوں نے عدن سے اپنے جنگی جہاز بھیج کر جدہ پر گولہ باری کرائی اور ہزاروں عرب شہید کر ڈالے۔ اس برطانوی جارحیت کا سبب یہ تھا کہ عربوں نے چند انگریزوں کو شعار اسلامی کی بے حرمتی کرنے پر موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا۔ خلیفہ عبدالمجید جنگ کریمیا (۱۸۵۳ء) میں روس کے خلاف ترکوں کا ساتھ دینے پر برطانیہ اور فرانس کے لیے نرم گوشہ رکھتا اور انگریزوں سے الجھنے کو تیار نہ تھا۔

خلیفہ نے یورپی طاقتوں کے ایما پر ''خط ہمایوں'' کے نام سے ایک دستوری اعلان بھی نشر کیا جس میں ہر فرقے اور ہر مذہب کے پیروکاروں کو اپنے مذہبی فرائض ادا کرنے کی پوری آزادی دی گئی۔ ان دنوں روس اور فرانس بڑھ چڑھ کر خلافت عثمانیہ کی عملداری میں بسنے والے عیسائیوں کے حقوق کے محافظ بنے ہوئے تھے۔ انھیں نام نہاد حقوق دلوانے کی آڑ ہی میں انھوں نے یونان، مونٹی نیگرو، رومانیہ اور سربیا کو آزادی دلائی۔ البتہ جنگ کریمیا کے بعد روس مملکت خلافت کے عیسائیوں کی حمایت اور سرپرستی سے دست بردار ہو گیا اور اس کی جگہ برطانیہ نے لے لی۔ ترکی کو اب یورپ کا مرد بیمار کہا جانے لگا۔

سلطنت عثمانیہ میں مغربیت کا نفوذ

خلیفہ عبدالعزیز (۶۱۔۱۸۷۱ء) کے عہد میں سلطنت عثمانیہ میں مغرب کا اثر تیزی سے پھیلا جو خلافت کے بقا اور استحکام کے لیے بہت مضر ثابت ہوا۔ ترکی میں آزاد

خیالی کو فروغ ملا۔ آزاد خیال ڈراما نگار نامق کمال اس تحریک کا سرخیل تھا۔ مغربی طاقتوں کے اکسانے پر ۶۶-۱۸۶۸ء میں جزیرہ کریٹ کے یونانیوں نے بغاوت کر دی۔ یہ جزیرہ دو صدیوں سے ترکوں کے زیرِ تسلط تھا۔ جزیرے کے عیسائیوں نے یونان سے الحاق کا اعلان کر دیا۔ عثمانی فوج نے ایک سال کے اندر بغاوت فرو کر دی۔

۱۸۷۵ء میں بوسنیا، ہرزیگروینا اور بلغاریہ میں بغاوتیں ہوئیں۔ ترکی کے نام نہاد اصلاح پسندوں کا سرخیل مدحت پاشا تھا جو ۱۰ مئی ۱۸۷۶ء کو وزیرِاعظم بنا۔ ۳۰ مئی کو مدحت اور اس کے ساتھیوں نے عبدالعزیز کو تخت سے اتار اس کے بھتیجے کو مراد خامس کے نام سے خلیفہ بنا دیا، تاہم اگست میں خلل دماغ کی بنا پر اسے معزول کر دیا گیا۔

اب عبدالحمید ثانی (۱۹۰۹ء-۱۸۷۶ء) خلیفہ بنا۔ وہ چاہتا تھا کہ خلافت کے منصب اور ترکوں کا وہی وقار بحال کر دے جو اس کے اسلاف کا طرۂ امتیاز تھا۔ وہ سید جمال الدین افغانی کی تحریک اتحادِ عالمِ اسلام (پان اسلامزم) کا ہم خیال اور اسلامی حمیت کا علمبردار تھا۔ اس کی اسلامی حمیت کے باعث نام نہاد آزاد خیال اور جدیدیت پسندوں نے اس پر طرح طرح کے الزام لگائے۔ ان میں صدرِ اعظم مدحت پاشا پیش پیش تھا۔

خلیفہ نے فروری ۱۸۷۷ء میں مدحت پاشا کو برطرف کر کے جلاوطن کر دیا۔ ۱۹ مارچ کو پہلی ترکی پارلیمان کا افتتاح ہوا۔ جب پارلیمان نے ترکی کو مغربیت کی راہ پر ڈالنے میں تیزی دکھائی تو ۱۸۷۸ء میں سلطان نے اسے معرضِ التوا میں ڈال کر وہ دستور معطل کر دیا جس کا مدحت پاشا نے دسمبر ۱۸۷۶ء میں اعلان کیا تھا۔ کچھ عرصہ بعد سابق خلیفہ عبدالعزیز نے خودکشی کر لی یا اسے قتل کرا دیا گیا۔ ۱۸۸۱ء میں مدحت اور اس کے ساتھیوں پر عبدالعزیز کے قتل کا مقدمہ چلا اور ان پر جرم ثابت ہو گیا۔ مگر برطانوی حکومت کی مداخلت نے انھیں سزائے موت سے بچا لیا۔

اصلاح پسندوں کا سرخیل مدحت پاشا

آخری روس۔ ترکی جنگ

۱۸۷۶ء میں سربیا اور مونٹی نیگرو کی مسیحی ریاستوں نے مغربی طاقتوں کی شہ پر ترکی کے خلاف لڑائی کا بازار گرم کیا۔ ۱۸۷۷ء میں روس نے ترکی کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ غازی عثمان پاشا نے قلعہ پلونا میں زبردست مزاحمت کی، تاہم روسی فوجیں ادرنہ تک آ پہنچیں اور اس پر قابض ہو گئیں۔ ۱۸۷۸ء میں یورپی طاقتوں برطانیہ، فرانس اور جرمنی نے جنگ بند کرا دی۔ تاہم جنگ بندی کی آڑ میں برطانیہ نے قبرص پر قبضہ کر لیا۔

اس پر فرانس نے ناراضی ظاہر کی تو جرمن چانسلر بسمارک نے یہ کہہ کر فرانس کو خاموش کر دیا کہ وہ موقع ملنے پر تیونس پہ قبضہ کر سکتا ہے۔ اس حملے پر برطانیہ کو کوئی اعتراض نہ ہو گا، چناں چہ ۱۸۸۱ء میں فرانس نے فوج کشی کر کے تیونس پر قبضہ کر لیا۔ بعدازاں معاہدۂ برلن (۱۸۷۸ء) کی رو سے بلغاریہ نے برائے نام عثمانی سیادت کے تحت آزادی حاصل کر لی اور بوسنیا و ہرزیگووینا کا علاقہ آسٹریا کی تحویل میں دے دیا گیا۔ ادھر خفیہ سامراجی منصوبے کے مطابق ۱۸۸۲ء میں برطانیہ نے مصر پر قبضہ جما لیا۔

۱۸۹۷ء میں یونان نے ترکی سے جنگ چھیڑ دی۔ غازی ادہم پاشا نے یونان پر لشکر کشی کر کے چند دن کے اندر اندر بیشتر یونانی علاقہ فتح کر لیا۔ قریب تھا کہ ترک یونانی دارالحکومت ایتھنز پہ قابض ہو جاتے کہ برطانیہ اور دیگر طاقتوں نے ترکی اور یونان میں اس شرط پر صلح کرا دی کہ ترک مفتوحہ علاقے چھوڑ دیں اور جزیرہ کریٹ میں ترک حاکم کے بجائے یونانی گورنر مقرر کر دیا جائے۔ یوں عالمی طاقتوں کی چودھراہٹ کے باعث الٹا یونان کو جنگ چھیڑنے کا انعام مل گیا۔

عالمی صہیونیت کی پیشکش اور خلیفہ عبدالحمید کا انکار

۱۸۹۷ء ہی میں سوئٹزرلینڈ کے شہر بازل (Basel) میں یہودیوں کی عالمی تحریک، صہیونیت (Zionism) کا ایک اجلاس منعقد ہوا جس میں "صہیونی بڑوں" (Zionist Elders) نے پروٹوکولز (دستاویز) منظور کیے۔ ان میں اہم نکتہ فلسطین میں یہودی وطن کا قیام تھا۔

چناں چہ عالمی صہیونی تنظیم (World Zionist Organisation) کا ایک وفد خلیفہ عبدالحمید ثانی سے ملا اور درخواست پیش کی کہ فلسطین میں یہودی وطن قائم کر دیا جائے، اس کے عوض وہ سلطنت عثمانیہ کے تمام قرضے ادا کر دے گی۔ خلیفہ عبدالحمید نے اسلامی حمیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے صاف انکار کر دیا اور یہودی بڑوں کو باور کرایا کہ وہ فلسطین کا ایک تنکا بھی یہود کو دینے کا حق نہیں رکھتا۔ اس یہودی وفد کا ایک رکن خلیفہ کی رعایا میں سے تھا، حاخام قرہ صو آفندی جس نے عثمانی خلافت کی شکست و ریخت میں اہم کردار کیا۔

خلیفہ عبدالحمید ثانی جو تادمِ آخر مسلم دشمنوں کا مقابلہ کرتے رہے

صہیونی خلافت کی جڑیں کاٹنے پر تل گئے

جب خلیفہ عبدالحمید ثانی کے دربار سے صہیونی وفد ناکام لوٹا تو صہیونیوں نے خلافت کی جڑیں کاٹنے کے منصوبے پر عمل شروع کر دیا۔ اپنے مذموم مقصد کو عملی جامہ پہنانے کے سلسلے میں نوجوان ترکوں (Young Turks) کی تحریک ان کے بہت کام آئی۔ یہ خفیہ تحریک ۱۸۹۶ء میں قائم ہوئی تھی جس میں زیادہ

تر وہ نوجوان ترک شامل تھے جو خلافت دشمن سرگرمیوں کے باعث فرانس، سوئٹزرلینڈ اور برطانیہ میں جلاوطن تھے۔ یورپی خیالات سے متاثر یہ لوگ خلافت کے خاتمے کے لیے سرگرم تھے۔ اس تحریک میں قرہ صوآفندی جیسے یہودی، مسیحی ارمنی اور مقدونی وغیرہ بھی شامل تھے۔

۱۹۰۴ء میں نوجوان ترک پارٹی کے ایک لیڈر طلعت بے نے پیرس میں علانیہ پارٹی کا مرکز قائم کر لیا تاکہ اس کے اغراض و مقاصد کی کھلم کھلا نشرواشاعت ہو سکے۔ نوجوان ترکوں نے عثمانی فوج میں بھی اثر و رسوخ پیدا کر لیا اور ہزاروں فوجی افسر اس تحریک کے حامی بن گئے۔ پیرس ہی میں انجمن اتحاد و ترقی کی داغ بیل ڈالی گئی۔ ۱۹۰۰ء۔۱۹۰۸ء دمشق سے مدینہ منورہ تک حجاز ریلوے کی تکمیل ہوئی۔ یہ ریلوے چونکہ عوام کے چندے سے بنی تھی۔ اس سے شام و فلسطین، ترکی اور یورپ کے زائرین اور حجاج کرام کو عرب آنے جانے میں بڑی سہولت پیدا ہوئی۔

یہود نواز انجمن اتحاد و ترقی

دسمبر ۱۹۰۷ء میں نوجوان ترکوں اور خلافت کے مخالف دیگر انقلابی گروہوں کا پیرس میں اجلاس ہوا۔ اس اجلاس میں غیر مطمئن ترک فوجی افسروں کے گروہوں اور سالونیکا و دیگر شہروں میں فری میسنوں (آزاد خیالوں) کے حلقوں سے رابطے کا فیصلہ کیا گیا۔ اب انجمن اتحاد و ترقی نے اپنا مرکز پیرس سے سالونیکا منتقل کر لیا۔ یاد رہے مصطفیٰ پاشا (اتاترک) سالونیکا میں پیدا ہوا جو اس وقت سلطنت عثمانیہ میں شامل تھا مگر اب یونان کے زیر تسلط ہے۔

ترکی میں انقلابی تحریک کا سب سے بڑا منتظم نیازی بے تھا۔ اس نے ۵ر جولائی ۱۹۰۸ء کو مقدونیہ میں بغاوت کا علم بلند کیا۔ انور پاشا کی قیادت میں مقدونیہ کی فوج نے اس کا ساتھ دیا۔ خلیفہ نے باغیوں کی سرکوبی کے لیے عزیز بے کو مقدونیہ کا حاکم بنا کر بھیجا۔ اس نے سالونیکا میں کئی افسر گرفتار کر لیے مگر حکومت کے خلاف تحریک بہت زور پکڑ چکی تھی۔ سلطان نے اب شمسی پاشا کو لشکر دے کر مقدونیہ بھیجا۔ انور پاشا نے مناستر (مقدونیہ) میں شمسی پاشا سے ملاقات کر کے نوجوان ترکوں کے خلاف کارروائی سے باز رہنے کو کہا۔ اگلے ہی دن شمسی پاشا کو قتل کر دیا گیا۔

نوجوان ترک پارٹی کا امیر رہنما' طلعت بے پاشا

خلیفہ عبدالحمید ثانی کی معزولی

خلیفہ عبدالحمید نے اب عثمان پاشا کو باغیوں کی سرکوبی پر مامور کیا۔ مگر اس کی فوج باغیوں سے جا ملی۔ ادھر انجمن اتحاد و ترقی نے خلیفہ کو معزول کرنے کا عزم کر لیا۔ انجمن کی تحریک سے مختلف مراکز کے فوجی

افسروں نے ایک ہی دن خلیفہ کو برقی پیغام بھیجے کہ دستوری حکومت کے قیام کا فوری اعلان کیا جائے۔ چناں چہ خلیفہ نے ۲۴ر جولائی ۱۹۰۸ء کو ۱۸۷۶ء کا دستور بحال کر دیا۔ اسی سال اکتوبر میں بلغاریہ نے مکمل آزادی کا اعلان کیا اور آسٹریا نے اپنے ساتھ بوسنیا و ہرزیگووینا کا الحاق کر لیا۔

پارلیمان کا پہلا اجلاس ۱۷ر دسمبر ۱۹۰۸ء کو منعقد ہوا۔ اس میں نوجوان ترکوں کی بھاری اکثریت تھی۔ انھوں نے فروری ۱۹۰۹ء میں اعتدال پسند صدر اعظم (وزیر اعظم) کامل پاشا کو استعفا دینے پر مجبور کیا اور اپنے ایک ہمدرد حلمی پاشا کو صدر اعظم بنوا لیا۔ ۱۳ر اپریل کو قسطنطنیہ میں مقیم پہلی فوج نے جو زیادہ تر البانویوں پر مشتمل تھی، بغاوت کر دی۔

اس موقع پر خلافت کے حامیوں اور اسلامی گروہوں کی مخالفت کے باعث حلمی پاشا نے استعفا دے دیا۔ ۲۴ر اپریل کو انجمن کا لیڈر محمود شوکت پاشا نیازی، حقی اور انور پاشا جیسے فوجی افسروں کے ساتھ "عسکرِ آزادی" لیے قسطنطنیہ پہنچا جس کی تعداد ۲۵ ہزار تھی۔ پانچ گھنٹے کی جنگ کے بعد وہ شہر پر قابض ہو گیا۔ خلیفہ عبدالحمید کے بہت سے حامی مارے گئے۔ ۲۶ر اپریل ۱۹۰۹ء کو پارلیمان کی منظوری سے خلیفہ معزولی کا اعلان کر دیا گیا۔

ستم ظریفی یہ کہ انور پاشا کی قیادت میں جو وفد خلیفہ کے پاس معزولی کا پروانہ لے کر گیا، اس میں یہودی حاخام قرہ صوآفندی بھی شامل تھا۔ خلیفہ عبدالحمید کو سالونیکا بھیج دیا گیا جہاں فروری ۱۹۱۸ء میں اس نے وفات پائی۔

(اس تاریخی داستان کی آخری قسط اگلے شمارے میں ملاحظہ فرمائیے۔)

◆◆◆

لالۂ صحرا

یہ گنبدِ مینائی، یہ عالمِ تنہائی
مجھ کو تو ڈراتی ہے اس دشت کی پہنائی

بھٹکا ہوا راہی میں، بھٹکا ہوا راہی تو
منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی!

خالی ہے کلیموں سے یہ کوہ و کمر ورنہ
تُو شعلۂ سینائی، میں شعلۂ سینائی!

تُو شاخ سے کیوں پھُوٹا، میں شاخ سے کیوں ٹُوٹا
اک جذبۂ پیدائی، اک لذتِ یکتائی!

غوّاصِ محبّت کا اللہ نگہباں ہو
ہر قطرۂ دریا میں دریا کی ہے گہرائی

اُس موج کے ماتم میں روتی ہے بھنور کی آنکھ
دریا سے اُٹھی لیکن ساحل سے نہ ٹکرائی

ہے گرمیِ آدم سے ہنگامۂ عالم گرم
سُورج بھی تماشائی، تارے بھی تماشائی

اے بادِ بیابانی! مجھ کو بھی عنایت ہو
خاموشی و دل سوزی، سرمستی و رعنائی!

(علامہ اقبال)

ایک مشہور قول ہے کہ مال و دولت قارون جبکہ ''علم'' انبیا کی میراث ہے۔ دنیا میں ہزار ہا قسم کے علوم رائج ہیں اور ہر علم کی مزید ذیلی شاخیں ہیں۔ گویا ہر علم کا ایک بے کنار سمندر ہے جو ازل سے رواں دواں ہے اور ابد تک رہے گا۔ علوم خواہ سائنسی ہوں یا روحانی' انہی میں علم ہپناٹزم یا ٹیلی پیتھی بھی شامل ہے۔ اُسے ماہرین نے اپنی کدوکاوش سے اس مقام پر پہنچا دیا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

دوسروں کو اپنے سحر میں گرفتار کرنے والا

ہپناٹزم کا ماہر بابا

ٹیلی پیتھی کے راز جاننے والے دو ماہرین کا حیرت انگیز ماجرا......

روحانیت کی دنیا سے توشہ خاص

حبیب اشرف صبوحی

ہپناٹزم یا ٹیلی پیتھی کیا ہے؟ اس کی وضاحت یوں سمجھیے کہ کسی مادی واسطے کے بغیر ایک دماغ کا دوسرے سے رابطہ ٹیلی پیتھی کہلاتا ہے۔ گویا روحانی دنیا کا یہ بے تار (کارڈلیس) رابطہ ہوا۔ اس کیفیت میں دونوں دماغ بالکل وائرلیس اسٹیشن کے مانند کام کرتے ہیں۔ یعنی انسانی دماغ سے غیرمرئی لہریں خارج ہوتی ہیں جن کے ذریعے انسان ایک دوسرے سے تعلق قائم کر لیتے ہیں۔ شرط یہ ہے کہ یہ لہریں طاقتور ہونی چاہئیں۔ ان غیرمرئی لہروں کے حامل انسانوں کی قوت ارادی بہت مضبوط ہوتی ہے۔ نیز رابطہ قائم کرنے کا طریقہ بھی آنا چاہیے۔ کہا جاتا ہے کہ مشہور مفکر اور فلاسفر ارسطو جہاں بہت سے علوم کا موجد ہے' وہیں اس نے ''ہپناٹزم'' کو بھی ایجاد کیا۔

اس سلسلے میں ایک حکایت کا اکثر تذکرہ ہوتا ہے۔ ایک روز ارسطو اپنے شاگردوں کے درمیان جنگل میں بیٹھا درس و تدریس میں مصروف تھا۔ اتفاق سے بادشاہ وقت کا اُدھر سے گزر ہوا۔ ارسطو کے علم و فن کے بہت چرچے تھے۔ بادشاہ نے سوچا کہ اس سے ملاقات کی جائے۔ چناں چہ وہ خود اس کے پاس گیا اور کہا ''سنا ہے آپ کئی علوم کے موجد ہیں۔ کسی دن دربار میں تشریف لائیے اور ہمیں اپنے فن سے روشناس کرائیے۔''

ارسطو نے کہا ''بادشاہ سلامت! آپ اگلے ہفتے یہاں تشریف لے آئیے۔ دوپہر کا کھانا میرے ساتھ تناول فرمائیے۔''

بادشاہ نے کہا ''جب ہم کہیں جائیں تو ہمارا لاؤلشکر بھی ساتھ ہوتا ہے۔ اتنے زیادہ لوگوں کے کھانے کا انتظام تم کس طرح کرو گے؟''

ارسطو نے کہا ''آپ فکر نہ کیجیے سب انتظام ہو جائے گا۔ آپ بس تشریف لائیے۔''

چناں چہ جب مقررہ وقت پر بادشاہ سلامت لاؤلشکر سمیت پہنچے تو دیکھ کر حیران رہ گئے کہ جنگل میں منگل کا سماں تھا۔ وہاں خوبصورت شامیانے لگے تھے۔ قیمتی قالین' جھولداریاں اور حسین خادمائیں! خدام اور خادماؤں نے ایسی نفیس پوشاکیں زیب تن کر رکھی تھیں کہ ان کی مثال ملنی مشکل تھی۔ بادشاہ بڑا حیران ہوا کہ ایسی شاندار چیزیں تو اس کے دربار میں بھی میسر نہیں تھیں۔

تھوڑی دیر بعد کھانا پیش کیا گیا۔ کھانا جن برتنوں میں تھا وہ سونے چاندی کے تھے اور کھانا اتنا پُرذائقہ کہ سب نے خوب سیر ہو کر کھایا۔ کھانے کے بعد محفل موسیقی کا پروگرام شروع ہوا۔ وہ بھی اعلیٰ درجے کا تھا۔ اس کے بعد ایک مشروب پیش کیا گیا۔ اُسے پیتے ہی سب کو خمار آ گیا اور وہ مدہوش ہو گئے۔ جب کافی دیر بعد ہوش آیا تو بادشاہ اور درباریوں نے دیکھا کہ وہاں نہ شامیانے ہیں نہ جھولداریاں اور نہ ہی وہ قالین۔ سب کے سب زمین پر پڑے ہوئے تھے۔ ارسطو سے پوچھا گیا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟

ارسطو نے کہا ''بادشاہ سلامت! یہ میرے علم کا ایک ادنیٰ سا مظاہرہ اور نظر کا دھوکا تھا۔ میں نے آپ سب کو ہپناٹائز کر دیا تھا اور ساری چیزیں آپ کو مصنوعی طور پر دکھائیں۔ البتہ کھانے کا انتظام ضرور کر رکھا تھا۔''

☆☆

اب کچھ ذاتی تجربات کے سہارے واقعات پیش ہیں جنھوں نے بارہ سال قبل مجھے ششدر کر دیا تھا۔ انھیں پڑھ کر قارئین بھی حیران رہ جائیں گے۔

میں بسلسلہ ملازمت چھے سال ایبٹ آباد مقیم رہا

ہوں۔ وہاں سے آنے کے پانچ سال بعد میں اپنے دوستوں سے ملنے ایبٹ آباد گیا۔ جن افسر کو میں نے چارج دیا تھا، دو تین دفعہ اُن کے پاس دفتر گیا لیکن ملاقات نہ ہو سکی۔ لاہور آنے سے قبل اتوار کو ان کے گھر فون کیا تو بات ہو گئی۔ کہنے لگے "مجھے آپ کے آنے کی خبر مل گئی تھی۔ جب آپ مجھ سے ملنے دفتر آئے تو اتفاق سے میں بسلسلہ سرکاری کام باہر گیا ہوا تھا۔ اب آپ میرے گھر فوراً آ جائیں۔ میں آپ کو ایک بزرگ سے ملانا چاہتا ہوں۔ آپ مل کر خوش ہوں گے۔"

میں جلد اُن کے گھر پہنچ گیا۔ ایک باریش شخصیت سے ملاقات ہوئی۔ اُن کا نام دوست نے بابا سلیمان بتایا۔ بابا جی نے ہمارے محکمے کے چار پانچ بڑے بڑے افسروں کے نام لیے اور بتایا "وہ میرے مرید ہیں اور میری بڑی عزت کرتے ہیں۔ ہو سکے تو انھیں سلام کہہ دینا۔" اُس کے بعد انھوں نے ایک اور افسر کا ذکر کیا جو مجھ سے پہلے ایبٹ آباد میں تعینات تھے۔

میں بابا سلیمان سے بہت متاثر ہوا۔ اُن سے کہا کہ آپ اپنے روحانی مشاہدات سے ہمیں بھی فیض یاب کیجیے۔ کہنے لگے "بسم اللہ۔" انھوں نے پھر ایک سادہ کاغذ منگوایا۔ اُس کی لمبی لمبی چھے سات کترنیں بنائیں جو کافی چوڑی تھیں۔ پھر ان پر کچھ لکھنے لگے۔ اُس کے بعد کترنوں کی تہیں بنا دیں۔ پھر میری طرف متوجہ ہوئے اور کہا کہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھو۔ میں اُن کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ اُس کے بعد انھوں نے کہا "ایک نمبر والی کترن اٹھاؤ۔ اس کے اوپر شخص بول کے ایک سے چار تک گنتی لکھو۔"

میں نے بول کر گنتی لکھ دی، تو کہا "اس میں سے کسی ایک نمبر کو کاٹ دو۔" میں نے چار نمبر کاٹ دیا۔

پھر کہا کہ اس کٹے نمبر پر کسی پھول کا نام لکھ دو۔ میں نے بول کر اُس پر گلاب کا پھول لکھ دیا۔ کہا "اب کاغذ کی تہیں کھولو۔" جب کاغذ کھولا تو اس پر چار نمبر کٹا ہوا اور گلاب کا پھول لکھا تھا۔

یہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ اُس کے بعد کہا "اب دل ہی دل میں دوسری کترن پر کوئی چار اعداد لکھو اور انھیں جمع کرو۔" میں نے چار اعداد لکھ کر ان کا حاصل جمع کر لیا۔ بابا جی نے کہا کہ اب کاغذ کو کھولو۔ جب کاغذ کھولا تو اس پر وہی چار اعداد لکھے تھے اور اُس کا حاصل جمع بھی وہی تھا جو میں نے سوچا تھا۔ انھوں نے بقیہ کترنوں پر بھی مختلف تھوڑی باتیں لکھوائیں۔ جب کترن کھلتی تو اُس پر میری پہلے سے سوچی گئی بات تحریر ہوتی۔ یہ "کرامت" دیکھ کر میں حیرت زدہ رہ گیا۔

تھوڑی دیر بعد ملازم چائے وغیرہ لے کر آیا۔ میں نے ملازم سے کہا "چائے میں چینی نہیں ڈالنا۔ مجھے منع ہے اور نہ میں کوئی میٹھی چیز کھاؤں گا۔" بابا جی کہنے لگے: آج آپ چائے میں چینی پئیں گے اور مٹھائی بھی کھائیں گے۔ نزدیک ہی پھولوں کا گلدستہ رکھا تھا۔ انھوں نے اُس میں سے گلاب کی چھوٹی سی پنکھڑی توڑی، اُس پر کچھ لکھا اور مجھے کہا کہ اسے اچھی طرح دانتوں کے نیچے دباؤ اور پھر تھوک دو۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ پھر کہنے لگے کہ اب مٹھائی کھاؤ اور چائے میں چینی کے تین چمچ ڈالو۔ جب میں نے چائے پی تو وہ بالکل پھیکی لگی۔ حتیٰ کہ مٹھائی بھی پھیکی محسوس ہوئی۔

اُس کے بعد وہ میرے نئے دفتر کے متعلق بتانے لگے کہ وہاں تمہارے مخالفین پیدا ہو چکے اور تمہاری ترقی میں بھی رکاوٹ آ رہی ہے۔ میں نے کہا، بابا جی اس مسئلے کا حل بھی آپ نے نکالنا ہے۔ کہنے لگے "تم پر بندشیں ہیں، ان کا توڑ میں کروں گا۔ اس کے لیے مجھے وظیفہ پڑھنا پڑے گا۔ تمھیں ایک تعویذ بھی دوں گا۔ یہ تعویذ بڑا کرشماتی ہے۔ اُسے پہن کر تم اپنے اندر تبدیلی محسوس کرو گے۔ تمہارے سب کاموں میں آسانیاں پیدا ہو جائیں گی۔"

میں نے کہا "بابا جی میں آپ کا شکرگزار ہوں گا۔ آپ مجھے وہ تعویذ دے دیجیے۔"

کہنے لگے "اس تعویذ کا ہدیہ صرف دو ہزار روپے ہے۔ آپ رقم دیجیے، میں ابھی کو تعویذ دیتا ہوں۔"

میں نے کہا "بابا جی میں چند گھنٹے بعد لاہور جا رہا ہوں۔ ابھی میرے پاس اتنے پیسے نہیں۔" وہ کہنے لگے، لاہور جا کر فوراً بھیج دینا۔ میں نے آج سے تمہارے لیے پڑھائی شروع کر دی ہے۔ تمھیں جلد تبدیلی محسوس ہو گی۔

میں اُن سے بہت زیادہ متاثر تھا۔ چناں چہ بڑے ادب و احترام سے رخصت ہوا۔ میں ایبٹ آباد اپنے ایک عزیز کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ جب شام کو وہ آئے تو بابا سلیمان سے ملاقات کا ذکر کیا اور ان کی روحانیت کے قصے سنائے۔ انھوں نے فوراً پہلا سوال یہ کیا "پیسے تو نہیں دیے؟"

میں نے حیرانی سے کہا "نہیں۔"

انھوں نے کہا "اللہ کا شکر ادا کرو کہ فراڈ سے بچ گئے۔"

میں حیرانی سے بولا "آپ ایسی نیک شخصیت کو فراڈیا کہہ رہے ہیں؟"

کہنے لگے کہ یہ حقیقت ہے۔ انھوں نے پھر بتایا "چند سال قبل یہی شخص میری دکان میں آیا۔ اُس زمانے میں مجھے کئی گھریلو اور کاروباری پریشانیاں لاحق تھیں اور میں ذہنی طور پر بہت پریشان تھا۔ اتفاقاً ان بابا جی سے ملاقات ہو گئی۔ ان کی باتوں سے میں بھی بہت متاثر ہوا۔ انھوں نے بتایا کہ آپ کے کاروبار کو کسی نے "باندھ" دیا ہے اور کئی "شعبدے" بھی دکھائے۔ میں بھی آپ کی طرح بہت متاثر ہوا اور اُن کی خوب خاطر و مدارات بھی کی۔

"میرا ایک ملازم کسی کام سے باہر گیا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ دکان میں چلا آیا۔ وہ بابا جی کو اچھی طرح جانتا اور ان کے کرتوتوں سے واقف تھا۔ اُس نے اشارے سے مجھے بلایا اور کہا کہ بابا جی کی باتوں میں مت آئیے اور نہ انھیں کوئی رقم وغیرہ دیں بلکہ ان سے کہیں کہ اپنی "شعبدے بازی" اس پہ بھی آزمائیں۔ چناں چہ کچھ وقفے کے بعد میں نے بابا جی سے کہا کہ یہ ہمارا ملازم ہے اور روحانی چیزوں کو نہیں مانتا۔ آپ اپنا علم اس پر بھی آزمائیں۔

"بابا جی نے اُسے اپنے سامنے بٹھایا اور کہا کہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھو۔ ملازم اس کے برعکس آنکھیں جھپکنے لگا۔

"بابا جی نے کہا "یہ کیا کر رہے ہو؟" ملازم نے کہا کہ یہ اس کی عادت ہے۔ تب بابا جی نے کہا کہ اس پر میرا "عمل" نہیں چل سکتا اور چپ چاپ دکان سے چلے گئے۔

بعد میں میرے ملازم نے بتایا کہ اس کی "شعبدے بازی" ختم کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ آنکھیں جھپکتے رہیں۔ یوں میں ملازم کی مہربانی سے اس کے فراڈ سے بچ گیا۔ اپنے عزیز کی باتیں سن کر مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہ بابا ہپناٹزم کا ماہر تھا۔ اسی کے سہارے وہ دوسروں کو الو بنا دیتا۔"

لیکن بعض لوگ ہپناٹزم کی مدد سے اپنے کام کراتے

ہیں اور اپنے علم کا چرچا نہیں کرتے۔ اسی ضمن میں ایک واقعہ پیش ہے۔

میرا ساتھی زاہد میرے محکمے میں سینئر آفیسر تھا۔ بڑی سخت طبیعت کا آدمی تھا اور ضرورت سے زیادہ اصول پسند۔ اُس کا کام ڈیمانڈ نوٹس جاری کرنا تھا۔ ایک روز ایک بزرگ اُس کے پاس آئے اور کہا "میں دو دفعہ پہلے بھی اپنے ڈیمانڈ نوٹس کے سلسلے میں آ چکا۔ آپ نے کہا تھا کہ گھر پہنچ جائے گا لیکن ابھی تک نہیں پہنچا۔ آج میں ہر صورت لے کر جاؤں گا۔"

زاہد نے کچھ دفتری مسائل بتائے اور کہا کہ اگلے ہفتے تک آپ کا کام ہو جائے گا۔ بابا جی بولے "میں آج ہر صورت ڈیمانڈ نوٹس لے کر جاؤں گا ورنہ تم خود میرے گھر لے کر آؤ گے اور ڈیمانڈ نوٹس کی فیس بھی تم خود جمع کراؤ گے۔"

اس پر زاہد نے غصے میں کہا "تمہارے جیسے روزانہ کئی آتے اور دھمکیاں دے کر چلے جاتے ہیں۔ میں کسی سے نہیں ڈرتا۔"

بابا جی نے زاہد کو کہا "میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالو اور مجھے اچھی طرح پہچان لو تاکہ تمھیں پہچاننے میں دقت نہ ہو۔ یہ میرا پتا بھی سمجھ لو۔ کچھ دیر بعد تم خود میرے آستانے پر آؤ گے۔"

زاہد نے کہا "میں نے تمھیں اچھی طرح دیکھ لیا اور پہچان بھی لیا۔ جو کرنا ہے کر لینا۔"

اس کے بعد بابا جی چلے گئے۔ کچھ دیر بعد زاہد کو پیشاب کی حاجت محسوس ہوئی۔ وہ جب جائے حاجت گیا تو یہ دیکھ کر اسے بڑی تشویش ہوئی کہ اُس کا آلہ بول ہی غائب تھا۔ اُسے تبھی بابا جی کے الفاظ یاد آئے "تم خود میرے آستانے پر آؤ گے اور ڈیمانڈ نوٹس لے کر آؤ گے۔" زاہد کی یہ ایسی پریشانی تھی کہ وہ کسی کو اپنا شریک بھی نہیں بنا سکتا تھا۔ تشویش بڑھتی جا رہی تھی۔

جائے حاجت سے نکلتے ہی اس نے فوراً ڈیمانڈ نوٹس تیار کر والیا اور بابا جی کے گھر پہنچ گیا۔ وہ گھر میں نہیں تھے۔ زاہد بے چینی سے باہر ٹہلنے اور اُن کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد بابا جی آتے دکھائی دیے۔ انھیں دیکھتے ہی زاہد نے اُن کی جانب دوڑ لگا دی اور بابا جی کے گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر معافی مانگنے لگا۔ بابا جی نے اُسے پہچاننے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں تمھیں نہیں جانتا لہٰذا کس بات کی معافی دوں؟

جب بابا جی نے زاہد کو اچھی طرح خوار کر لیا تو پھر معافی دی اور کہا "ہر آدمی کو ایک جیسا نہ سمجھا کرو۔ آئندہ لوگوں سے پیار اور محبت سے پیش آنا۔ ورنہ ہر فرعون کے لیے ایک موسیٰ پیدا ہوتا ہے۔" بابا جی نے زاہد کو اس شرط پر معاف کیا کہ آئندہ اُس کی کوئی شکایت نہیں آنی چاہیے۔

یہ واقعہ عیاں کرتا ہے کہ زاہد جسمانی طور پر بالکل تندرست تھا لیکن بابا جی نے اُسے ہپناٹائز کر کے دماغی طور پر مفلوج کر دیا۔ زاہد سے میری بڑی دوستی تھی۔ اس واقعے کے بعد وہ بزرگوں کی تعظیم کرنے لگا۔ جب اُسے کسی بزرگ کا پتا چلتا تو وہ فوراً اُس کے پاس حاضر ہوتا۔ میرے ساتھ بھی کئی دفعہ پیروں کے پاس گیا جن کے واقعات کسی دوسری نشست میں سناؤں گا۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ بیرونی ممالک میں ہپناٹزم سے مریضوں کا علاج ہوتا ہے اور کئی دوسرے مثبت اقدام بھی کیے جاتے ہیں۔ گویا وہاں بنیادی طور پر ہپناٹزم فراڈ، دھوکے اور کمائی کا ذریعہ نہیں بلکہ ایک طرح کا فلاحی کام ہے۔ ◆◆◆

انگلستان جاؤ یا امریکستان مگر

اپنی پہچان کبھی نہ بھولو

پاک مٹی سے جڑے اس روایتی رہن سہن کا دلچسپ تذکرہ
جس سے ہماری مغرب زدہ نئی نسل بیگانہ ہو چکی

سراج دین

ایک انگریز کسی گاؤں کی سیاحت کرنے گیا، تو نمبردار نے اُس کی خوب آؤ بھگت کی۔ مرغ مسلم، چاٹی کی لسی، دیسی گھی کے پراٹھے، اچار اور دیگر نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کے بعد اُسے گاؤں کی خاص سوغات مکئی کی روٹی پر ساگ اور مکھن کا پیڑا رکھ کر پیش کی۔ گورے نے مزے سے مکھن اور ساگ کھایا اور شکریے کے ساتھ روٹی واپس کر دی۔

یہ تو ایک چٹکلا ہے، لیکن درحقیقت کچھ ایسا ہی حال ہماری نوجوان نسل کا ہے جو اپنی ثقافت، بود و باش، بول چال، کھانا پینا اور اپنی زبان تک فراموش کرتی جا رہی ہے۔

☆☆☆

ایک بار شکرقندی کھانے کو بڑا جی چاہا۔ بیٹھے بٹھائے یہ نعمت کھانے کو طبیعت مچلنے لگی۔ قرب و جوار کی دکانوں پر گیا، مگر کسی کے پاس شکرقندی نہیں تھی۔ آخر ایک دکاندار کہنے لگا "باؤ جی! آپ دہلی دروازے چلے جاؤ، وہاں سے ملے گی۔"

گھر لوٹا تو بیگم نے خالی ہاتھ دیکھ کر استفسار کیا۔ میں نے

مدعا بیان کیا' تو محترمہ نے جھٹ برقع پہنا اور کہنے لگیں "میں نے بھی وہاں سے خریداری کرنی ہے۔"

یوں تو اتوار کا بڑی شدت سے انتظار ہوتا ہے کہ ہفتہ بھر کی تکان اُتاریں گے' مگر یہ دیوانے کا خواب ہی ہے۔ بچے سیر سپاٹے کی فرمائش کرتے ہیں اور بیگم کے کاموں کی تفصیل نہ ہی پوچھیں تو اچھا ہے۔ مثلاً واشنگ مشین ٹھیک کروادیں' رک رک کر چلتی ہے...... پانی کا پائپ ٹپکتا ہے جس کے باعث صحن میں کیچڑ ہو جاتا ہے...... باورچی خانے کی چھت بھی ٹپکتی ہے...... بچوں کے جوتے مرمت کے لیے موچی کو دینے ہیں۔

غرض ایسے بے شمار کام میرا منہ چڑا رہے ہوتے۔ ان ڈھیر سارے کاموں میں سے ایک آدھ سہل سا کام انجام دے کر میں بقیہ آئندہ کے لیے ڈال دیتا' تو بیگم روہانسی صورت بنا کر کہتی "یہ کام آپ ہی کو کرنے ہیں' آپ کو نہ کہوں تو کس سے کہوں؟"

بیگم کی بات دل کو لگتی' مگر میں خود کو جسمانی طور پر ایسی مشقتوں کا متحمل نہ پاتا۔ یوں کہہ لیں کہ عمر کے اُس حصے میں ہوں جب انسان آرام اور سکون تلاش کرتا ہے...... مگر میرے لیے یہ انہونی بات بن چکی۔

بیگم نے تھیلے میں بٹوہ ڈال اُسے لپیٹ کر ہاتھ میں تھام لیا۔ دہلی دروازہ ہمارے گھر سے دو تین فرلانگ کی مسافت پر ہے۔ مغلیہ دور کی یہ یادگار قدیم لاہور کے بارہ دروازوں میں سے ایک ہے۔ یہ عظیم الشان دروازہ آج بھی اپنی باقیات کے ساتھ اُسی طمطراق سے استادہ ہے۔ خدوخال دیکھ کر ہی زمانہ ماضی میں اُس کی شان و شوکت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

دروازے کا رخ دہلی شہر کی جانب ہے' اسی نسبت سے یہ دہلی دروازہ کے نام سے موسوم ہوا۔ محکمہ آثار قدیمہ کی بے پروائی اور حکومت کی عدم توجہ کے باعث اس کے مضبوط در و دیوار سال خوردہ اور بے یار و مددگار محسوس ہوتے ہیں۔ خوانچہ فروشوں اور پھیری والوں نے بھی مغلیہ دور کی اس دیو ہیکل یادگار کا حسن گہنا رکھا ہے۔

موٹر سائیکل پر ہم چند منٹوں میں وہاں پہنچ گئے۔ ۲۴۰ روپے کے عوض دونوں نعمتیں دو دو کلو کے حجم میں مل گئیں۔ بیگم نے دو کلو بھٹے بھی تلوا لیے کہ بچوں کو کھلاؤں گی۔ گھر کی جانب رخ کیا' تو محترمہ نے خریداری کا ذکر چھیڑ دیا۔ میں وقت گزاری کے لیے دہلی دروازے کی طرز تعمیر کا بغور معائنہ کرنے لگا اور بیگم اپنی خریداری میں مصروف ہو گئی۔

بچوں کے پیچیدہ سوالات

شکر قندی' سنگھاڑے' کماد (گنا) جیسی نعمتوں سے آج کی نسل قطعی نا آشنا ہے۔ جب کبھی بھولے سے انھیں یہ نظر آ جائیں' تو ان کی حیرت دیدنی ہوتی ہے اور وہ ان کے متعلق سوالات بھی عجیب و غریب کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کیا چیز ہے؟ اسے کیا کہتے ہیں؟ یہ کھاتے بھی ہیں' ایسے ہی یا پکا کر۔ بعض بچے تو سنگھاڑا ہاتھ میں پکڑتے ہی پھینک دیتے اور فخریہ انداز میں کہتے ہیں کہ میں تو یہ کبھی نہ کھاؤں......

میرے بھتیجے' عبدالعاشر اور عبدالاحد جڑواں بھائی اور بلا کے ذہین ہیں۔ ایسے پیچیدہ سوال کرتے ہیں کہ اُن کے جواب دینا مشکل ہو جاتا ہے۔ بروز اتوار ٹی وی کے ایک پروگرام میں پر کسی گاؤں کی سیر کرائی گئی۔ اچانک اسکرین پر ٹنڈاں والا کھوہ (کنواں) دکھایا گیا۔ بڑا ہی خوبصورت منظر تھا۔ ایک بیل جس کی آنکھوں پر ٹوپے چڑھے ہوئے تھے' چرخی کے ساتھ بندھا گرد و پیش سے بے نیاز مسلسل کنوئیں کے گرد گھوم رہا تھا۔ بوکوں کا بار دھڑا دھڑ کنوئیں سے پانی نکال فولادی چادر سے بنے کھال میں انڈیلتا۔ وہاں سے پانی کی موٹی دھار کھیت کو سیراب کر رہی تھی۔ بس جی دونوں کے سوال شروع ہو گئے: کنواں کیا ہوتا ہے' اس میں پانی کہاں سے آتا ہے' یہ کتنا گہرا ہوتا ہے' اس میں مچھلیاں بھی ہوتی ہیں؟ ہم نے بھی کنواں دیکھنا ہے۔

میں نے جواب دینے کے بجائے اُنھیں کنواں دکھانے کا فیصلہ کیا اور دونوں کو ساتھ لیے گاڑی پر نکل پڑا۔ اتوار تھا' اسی لیے یہ کشٹ اُٹھانے کا حوصلہ مل گیا۔ دونوں بڑے خوش تھے جیسے کوئی بڑی ہی نایاب چیز دیکھنے جا رہے ہیں۔ پورا لاہور چھان مارا مگر کنواں کہیں نظر نہ آیا۔ ایک وہ بھی دور تھا جب ہر دوسرے تیسرے گھر کنواں ہوتا جسے عام طور پر "کھوئی" کہتے۔ مسجدوں میں بھی کنوئیں ہوا کرتے تھے جن کا ٹھنڈا میٹھا پانی وضو اور غسل کے کام آتا۔ بعض کنوؤں کا پانی کھارا ہوتا تھا جو صرف نہانے' کپڑے دھونے اور گائے بھینسوں کی پیاس بجھانے کے کام آتا۔ ہم اکثر ثواب کی نیت سے کنوئیں سے سیکڑوں بوکے نکال کر مسجد کی ٹینکی بھرا کرتے تاکہ نمازیوں کو وضو کے دوران پانی کی قلت نہ ہو۔ یوں کہہ لیں تب کنوئیں زندگی کی علامت تھے۔

محنت کا پھل میٹھا ہوتا ہے

میں نے اپنے دوست شہزاد بٹ کو فون کیا اور بتایا کہ بچوں کو ٹنڈاں والا کھوہ دکھانے نکلا تھا' مگر تا حال کامیاب نہیں ہوا۔ موصوف اس قسم کی خاصی معلومات رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے دریائے راوی سے ملحق کسی گاؤں کا نام بتایا اور ڈیرے دار سے ملنے کو کہا۔ تھوڑی دیر میں ہم ڈیرے پر موجود تھے۔ شہزاد کے توسط سے ہماری خوب آؤ بھگت ہوئی۔ وہاں بچھی دیو ہیکل چارپائی (جسے مقامی زبان میں "ہماچہ" کہا جاتا ہے) پر ہمیں بٹھایا گیا۔ بچوں کے لیے یہ انوکھی چیز تھی۔ وہ ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے "اس پر تو کوئی جن ہی سوتا ہو گا۔" سرسبز و شاداب درختوں کے جھنڈوں سے مزین ڈیرا دیکھ کر بچے بھی کھل اُٹھے۔

ایک جانب درخت کی چھاؤں تلے تندرست و توانا بھوری بھینس اپنے بچھڑے کے ساتھ بیٹھی جگالی کر رہی تھی۔ دو بکرے بھی قریب ہی بندھے تھے جبکہ سات آٹھ دیسی مرغیاں بڑے ہی خوبصورت مرغ کے ساتھ پھر رہی تھیں۔ ڈیرے کے ساتھ ہی ہری بھری فصلیں لہلہا رہی تھیں جنھیں سیراب کرنے کو ٹنڈاں والا کھوہ موجود تھا۔ بچے کنوئیں کی جانب لپکنے لگے' تو میں نے رعب دار آواز میں اُنھیں روکا' مبادا اٹھکیلیاں کرتے اس میں نہ جا پڑیں۔

میں خود بچوں کے ساتھ گیا اور ان کا ہاتھ پکڑ کر کنوئیں میں جھانکنے کو کہا۔ دونوں گھبرا کر پیچھے ہٹ گئے۔ پھر اُنھیں بوکوں کے بار دکھا کر بتایا کہ ان کی مدد سے کنوئیں کی تہ سے پانی نکالا جاتا ہے۔ وہ بڑی

حیرت سے سب کچھ دیکھتے اور سنتے رہے۔ پھر بچوں کے کہنے پر ڈیرے دار نے بیل جوت کر کنوئیں سے پانی نکال کر دکھایا' تو وہ بہت خوش ہوئے۔ میں نے ڈیرے دار کا شکریہ ادا کیا۔ رخصت ہونے لگے' تو موصوف نے قریبی استادہ نیم کے درخت سے ایک شاخ توڑی اور منہ میں چبانے لگا۔

راستے میں دونوں پوچھنے لگے "اُس درخت کی شاخیں کیا میٹھی تھیں جو وہ آدمی چبا رہا تھا؟" میں دل ہی دل میں مسکرایا۔ پھر انھیں بتایا کہ نیم کا درخت کڑوا اور کسیلا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے بے شمار خوبیوں سے نوازا ہے۔ اس کا پھل' پتے اور شاخیں کئی بیماریوں میں کام آتی ہیں۔ شاخ بطور مسواک دانتوں کے لیے نہایت مفید ہے۔ نیم کی مسواک کرنے والوں کے دانت مضبوط ہوتے اور کیڑا لگنے سے محفوظ رہتے ہیں۔ مختصر یہ کہ میں اپنے تئیں انھیں اپنی ثقافت اور بود و باش کے متعلق بتاتا رہا۔ جب انھیں یہ بتایا کہ ماضی میں مردوں کا ننگے سر پھرنا بھی معیوب سمجھا جاتا تھا' تو وہ بہت حیران ہوئے۔ تب ہر کوئی پگڑی' پرنا' صافہ یا رومال سر پہ رکھتا۔ کسی محفل میں کوئی ننگے سر آتا تو یہی سمجھا جاتا کہ میاداً اسے کوئی پریشانی ہے جو ننگے سر ہی گھر سے نکل آیا۔

گھر میں ایک ہی کنگھی' سرے دانی اور ایک ہی تولیہ ہوا کرتا حتیٰ کہ سر پہ تیل لگانے کے لیے تیل کی شیشی بھی ایک ہی ہوتی۔ اس کے باوجود نہ کوئی چھوت چھات نہ کوئی موذی بیماری۔ "یہ تیری چیز ہے اور وہ میری" جیسی باتوں کا فقدان تھا۔ کھانے میں چھری کانٹے کا تصور ہی نہ تھا۔ ایک ہی تھال میں سب مل بیٹھ کے ہاتھ سے کھاتے۔

قصور بچوں کا بھی نہیں بلکہ جدت پسندی اور مغربی تہذیب پہ آنکھیں بند کر کے عمل کرنے سے ہم اپنی ثقافت' بود و باش اور قومی زبان تک فراموش کرتے جا رہے ہیں۔

کاشت کاری کے جان گسل مراحل

"چھوٹی ڈبل روٹی اور تین انڈے لے آؤ۔ باقی پیسے دھیان سے لانا۔" میں نے سو کا نوٹ دیتے ہوئے منجھلے بیٹے افنان سے کہا۔ "پینتیس روپے کی ڈبل روٹی اور گیارہ روپے کا انڈا ہے' بتیس روپے واپس آئیں گے۔"

افنان مسکراتے ہوئے بولا "پاپا انگلش میں بتایئے' مجھے سمجھ نہیں آئی۔" یہ سن کر میں حیرت سے اُس کا منہ تکنے لگا۔

انگلش میڈیم اور او لیول کا طالب علم یہ جانتا ہی نہیں کہ گندم' چاول اور دیگر اجناس کاشتکار کن جان گسل مراحل سے گزر کر حاصل کرتا ہے۔ وجہ یہی ہے کہ انھیں فاسٹ فوڈ اور ڈبا بند غذائیں ہر اسٹور سے بنا کسی مشقت کے بہ عوض چند روپے مل جاتی ہیں۔ وہ اِن باتوں سے بے خبر ہیں کہ کسان ہل' بیلچے' درانتی' کھرپے اور چوپائے (بیل) سے لیس ہو کر منہ اندھیرے کھیتوں میں ہل چلاتا اور زمین کا سینہ بڑی محنت سے چیر کر یہ نعمتیں حاصل کرتا ہے۔

لُو چلتی گرم ہواؤں کی پروا کیے بغیر کھڑے پانی والے کھیت اور حبس زدہ ماحول میں جہاں سانس لینا بھی دشوار ہوتا ہے اور ٹانگوں کی کھال تک جھلس جاتی ہے' جفاکش کسان رکوع کے انداز میں کھڑے ہو کر وسیع رقبے پر چاولوں کی پنیری لگاتا ہے۔ پھر روزانہ کھیت کی دیکھ بھال اور دعائیں مانگ مانگ کر فصل پکنے کا انتظار کرتا ہے۔

جب فصل تیار ہوتی' تو کٹائی کے بعد اسے دھوپ میں سکھایا جاتا۔ پھر تَر فصل کے ڈھیر سے گٹھی بنا کر کسان دھوبی کے مانند اُسے پیروں میں رکھے درخت کے تنے پر پٹختا' تو چاول شاخوں سے علیحدہ ہو کر زمین پر گرتے جاتے۔ یہ مرحلہ طے کرنے کے بعد چھلکے اُتارنے کے لیے چاولوں کو شیلر یا گاؤں ہی میں چکی پر لے جاتے۔ چکی والا ایک من چاولوں کی چھلائی کے بدلے دو کلو چاول رکھ لیتا۔ تب کہیں جا کر لمبے لمبے خوشبودار چاول کھانے کو ملتے جو موجودہ نسل اسٹوروں سے خوبصورت پیکنگ میں خریدتی اور کھا کر لطف اُٹھاتی ہے۔

محنتی کسان پنیری لگاتے ہوئے

گندم کی فصل بھی کچھ اسی طرح حاصل ہوتی۔ فصل پک جاتی' تو تپتی دھوپ میں کٹائی ہوتی۔ پھر بالیوں کے گٹھے باندھ ایک جگہ ڈھیریاں لگائی جاتیں اور بارش ہونے کی صورت میں انھیں پانی سے محفوظ رکھا جاتا۔ یہ بڑے ہی کٹھن مراحل تھے۔

ہمارے دور میں گندم کی چھٹائی ہوا کے دوش پر منحصر تھی۔ تپتی دھوپ میں کھلے آسمان تلے، سروں پر سفید پرنے لپیٹے کسان گندم سے بھوسی الگ کرنے کی خاطر ہوا کے "چلنے" کے منتظر ہوتے۔ جیسے ہی "رحمت" کا در کھلتا' بھاگم بھاگ اُس سمت گندم اُچھالی جاتی۔ ہوا بھوسی اُڑا دیتی اور دانے زمین پر گر جاتے۔ یہ عمل پورے کھیت میں کسانوں کو نچائے رکھتا۔ جیسے ہی ہوا رخ بدلتی بیچارہ دہقان بھی تنگلی (بیلچہ نما) اُٹھائے اُدھر کا رخ کرتا۔

پیاس بجھانے کے لیے برف اور فریج کا تصور ہی موجود نہ تھا۔ پانی سے بھرا مٹی کا گھڑا گھاس پھونس سے ڈھانپ کر ایک جگہ رکھ دیا جاتا۔ جب کسی کو پیاس لگتی' وہ گھاس ہٹا کر گھڑے پہ رکھے مٹی کے پیالے میں پانی پی لیتا۔ یہی پیالہ گھڑا ڈھانکنے کے بھی کام آتا۔ کھانے کے وقت دیسی گھی سے چپڑی روٹیاں' آم کے اچار کی پھانک اور چاٹی کی لسی کا جگ گھر کا کوئی فرد لیے کھیت پہنچ جاتا۔ بعض کسان اپنا کھانا ساتھ ہی لائے ہوتے۔ سب مل بیٹھ کر کھاتے' تو پیار محبت اور بھائی چارے کی عجب بُو باس ہوتی۔

اُن دنوں ولایتی گھی' کوکنگ آئل' چائے' برائلر مرغی کا گوشت' فارمی مچھلیاں' برگر' شوارما وغیرہ ناپید تھے۔ ہر نعمت فطری اصول کے تحت میسر تھی۔ بس اُسے دھو کر پکانے کا اہتمام کر لیا جاتا۔ مکھن اور دیسی گھی خواتین گھر ہی میں بناتیں' دودھ بھی خالص ملتا جو آج کے دور میں جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ غربت ضرور تھی (میں اسے غربت کے بجائے سادگی کہوں گا) مگر صحت کے معاملے میں لوگ امیر تھے۔

جب کبھی گھر میں کوئی بیمار ہوتا' تو ڈاکٹر مریض کو

نرم غذا کھانے میں تجویز کرتا۔ تب (بی پی) نامی ڈبل روٹی کی شکل دیکھنا نصیب ہوتی جو سفید کاغذ میں لپٹی آتی۔ وہ بھی کسی خاص دکان سے لانی پڑتی تھی۔ اب تو ناشتے میں ڈبل روٹی نہ ہو تو بچے منہ بنا لیتے ہیں۔

جب کسی نے کوٹھا لیپنا یا نیا بنانا ہوتا' تو ساتھی کسان مقررہ دن اور وقت پر پہنچ جاتے اور بنا کسی اُجرت کے دن بھر مزدوروں کی طرح کام کرتے۔ پھر شام ڈھلے گھر کی روکھی سوکھی کھا کر اپنے گھر لوٹ جاتے۔ یہ مشقت سب ایک دوسرے کے لیے خوشی خوشی اور بلا معاوضہ کرتے۔

اسی طرح جب گندم کی فصل پک کر تیار ہوتی' تو لڑکے بالے اور کسان اپنی اپنی درانتیاں لیے فصل کی کٹائی میں جت جاتے۔ یہ بھائی چارے کا بڑا ہی خوبصورت اکٹھ ہوتا۔ یوں ہفتوں کا کام ایک ہی دن میں انجام پا جاتا۔ اب جدید مشینری نے فصلوں کی کٹائی کا کام قدرے آسان کر دیا جو دانہ اور بھوسی خود بخود الگ کر دیتی ہے' مگر افسوس اس سہولت نے باہمی محبت کا بھی تیا پانچہ کر ڈالا۔ اجتماعی سوچ ناپید ہوئی اور اُس کی جگہ نفسانفسی نے لے لی۔

تب دانے اور بھوسی الگ کرنے کا کام "قدرتی تھریشر" یعنی بیلوں سے لیا جاتا۔ اس عمل کو وہیں زبان میں "گاہ" کہتے تھے اور سب بڑھ چڑھ کر اس میں حصہ لیتے۔ کیونکہ اُس روز بھنا ہوا گوشت اور حلوہ کسان کی طرف سے کھانے کو ملتا۔ "گاہ" کا منظر بھی خوب ہوتا۔ سوکھی فصل کھیت میں بچھا دی جاتی اور اُس پر ایک موٹے تازے بیل سے "گاہ" کروایا جاتا۔ بعض سادہ لوح دیہاتی گوشت اور حلوہ کھانے کے منتظر رہتے اور گاہے گاہے کسان سے پوچھتے کہ "گاہ" کب ہوگی ہے؟ گندم کے خوشے بیل کے وزنی پیروں تلے آتے ہی چھلکوں سے باہر آ جاتے اور ذرا سی ہوا چلنے پر چھلکے اُڑ کر پرے جا گرتے۔ یہ کام کسان سمیت دیگر دیہاتی مل کر انجام دیتے۔

ایک شخص بیل کی رسی تھامے اُسے فصل پر گھماتا' دوسرا گندم کے بندھے گٹھے کھول کھول کر بیل کے قدموں تلے بچھاتا' تیسرا آدمی ایک بڑا سا برتن تھامے ہمہ وقت تیار رہتا۔ جیسے ہی بیل حاجت کے لیے دُم اُٹھاتا ایک دیہاتی زور سے آواز لگاتا "اوئے! پھوسی پھوسی۔" برتن والا مددگار فوری بیل کی جانب دوڑتا۔ عجلت میں اگر برتن ہاتھ سے گر جاتا' تو دونوں ہاتھ جوڑ کر گوبر ہاتھوں میں لے لیتا تاکہ گندم خراب نہ ہو۔

گڑ بنانے کا بھی اپنا ہی لطف تھا۔ پورے گاؤں کو علم ہوتا کہ آج فلاں چودھری یا ملک کا بیلنا چلنا ہے' تو لوگ گاہے گاہے اُدھر آ نکلتے۔ اُنھیں کشادہ دلی سے خوش آمدید کہا جاتا اور گرما گرم گڑ یا "رو" سے اُن کی تواضع بھی کی جاتی۔

کماد (گنے) کی کئی قسمیں ہیں مگر کالا کماد گڑ بنانے کے لیے بہترین ہے کیونکہ یہ خوب رسیلا ہوتا ہے۔ کٹائی اور چھلائی کے بعد جب کماد کا ڈھیر لگتا' تو بیلنے کے ساتھ بیل جوت دیا جاتا۔ جیسے ہی بیل گھومنا شروع کرتا ایک آدمی بیلنے میں گنے ٹھونستا جاتا۔ رس کی موٹی سی دھار بیلنے کے نیچے رکھی بالٹی میں گرنے لگتی۔ جیسے ہی بالٹی لبالب بھرتی' اُس کی جگہ چھوٹی بالٹی رکھ پہلی والی بھٹی پر رکھی دیوہیکل کڑاہی میں انڈیل دی جاتی۔ دو ڈھائی من رس اکٹھا ہو جاتا' تو بھٹی میں آگ سلگائی جاتی۔

اس دوران گنے چوپنے اور آئے گئے مہمانوں کو جی بھر کے رو پلانے کا عمل بھی جاری رہتا۔ جیسے ہی کڑاہی میں رو کھولتی' سطح پر ڈھیر ساری جھاگ اکٹھی ہوتی جو ایک بڑی سی چھلنی کی مدد سے اُتار کر کنستر میں ڈال دی جاتی۔ اسی جھاگ کو "راب" کہتے ہیں جو سرطان کے مریضوں کے لیے اکسیر ہے۔

یہ جھاگ رو اُبالنے کے دوران کئی بار اُتاری جاتی حتیٰ کہ کنستر لبالب بھر جاتا۔ آخر رو اُبل اُبل کر گاڑھی ہو جاتی۔ یہ پرکھنے کے لیے کہ اس کا گڑ بن سکتا ہے یا نہیں' رو میں گنا ڈبو کر ہوا میں بلند کیا جاتا۔ اگر رو کی تار بن جاتی تو سمجھ لیں کہ اُس کا گڑ بن سکتا ہے ورنہ اُسے مزید پکایا جاتا۔

رو پک کر تیار ہو جاتی' تو ایک بڑے سے چکور تسلے میں انڈیل دی جاتی اور کچھ دیر اُسے ٹھنڈا ہونے دیا جاتا۔ تب تک دوسرے ضروری کام نمٹا لیے جاتے۔ لیجیے جناب گڑ بننے کا آخری مرحلہ آ گیا۔ تسلے کے قریب ہی ایک صاف ستھری چادر بچھا دی جاتی۔ ایک آدمی کفگیر نما چوبی ڈوئی لیے تسلے میں سے مخصوص انداز میں تین چھٹانک کے لگ بھگ مطلوبہ نکالتا اور ہاتھ میں رکھ پیڑا بنا چادر پر رکھتا چلا جاتا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ جم کر گڑ کی ڈلی بن جاتی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ڈھیروں گڑ بن جاتا۔ پھر گھر میں استعمال کرنے کے لیے خاص گڑ تیار ہوتا جو گھر آئے مہمانوں کی تواضع کرنے میں کام آتا یا شہر میں کسی عزیز کے ہاں جاتے ہوئے بطور سوغات پیش کیا جاتا۔ بادام' اخروٹ' کشمش' ناریل' سونف اور خشخاش ملا کر یہ گڑ تیار ہوتا تو جو واقعی خاصے کی چیز ہوتی۔

کوا چلا ہنس کی چال

افسوس جدید دور نے آپس میں پیار محبت اور یگانگت کے ماحول کو معدوم کر دیا۔ لوگ روپے پیسے کمانے کی دوڑ میں ایسے اُلجھے کہ ساری قدریں پس پشت ڈال دیں۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

چنگے طور طریقے چھڈ کے "زہری" ہوندے جاندے نیں
ہولی ہولی پنڈاں والے "شہری" ہوندے جاندے نیں

رہی سہی کسر سائنس نے فطرت کے کاموں میں دخل اندازی کر کے پوری کر دی۔ کئی زمیندار اب زرعی زمینوں میں مصنوعی کھاد ڈال کر سال میں دو کے بجائے چار چار فصلیں لیتے ہیں۔ لیکن یہ عمل زمین کی زرخیزی ختم کر دیتا ہے۔ چناں چہ اب ہم کم توانائی والی اجناس کھا رہے ہیں۔

یوں سمجھ لیجیے کہ جدت ہماری ہر اقدار پر اثر انداز ہو چکی۔ ایک اور افسوس ناک رجحان یہ بھی ہے کہ ہماری نسل اُردو زبان سے نابلد ہو رہی ہے۔ یونیورسٹیوں اور کالجوں کے بعض جوان لڑکے اور لڑکیاں جب یہ کہیں کہ وہ اُردو نہیں جانتے' تو حیرت ہوتی ہے۔ تب خیال آتا ہے کہ لاکھوں کی تعداد میں ہمارے نامور مصنفین اور علمائے کرام کی لکھی اُردو کتابوں سے استفادہ کون کرے گا؟ ہمارے اربابِ اختیار کو اس جانب خلوصِ دل سے متوجہ ہونے کی اشد ضرورت ہے۔

پاکستان میں اُردو قومی اور سرکاری زبان ہے مگر نئی نسل میں اس کے فروغ سے دانستہ آنکھیں چرائی جا رہی ہیں۔ یہ ہمارے لیے لمحہ فکریہ ہے۔ وائے افسوس' مغربی تہذیب کی اندھا دھند تقلید نے ہم سے سب کچھ چھین لیا حتیٰ کہ قومی زبان ہی نہیں ہمیں دین سے بھی دور کر دیا۔ ڈرتا ہوں اپنا حال اُس کوے جیسا نہ ہو جائے جو ہنس کی پیروی کرتے کرتے اپنی چال بھی بھول جاتا ہے۔

◆◆◆

تپتی دھوپ میں ٹھنڈی چھاؤں

بزرگوں کا نشیمن

اولاد کی بے اعتنائی و ظلم کے مارے والدین کا نوحہ، ایک دردمند نوجوان نئی نسل کو ان کی چپ سنانا چاہتا ہے

سعید خان

ندیم مردم شماری کے دفتر میں ملازم تھا۔ انتخابات کی آمد آمد تھی، لہٰذا اُسے ووٹروں کی فہرستیں تیار کرنے کا حکم ملا۔ ندیم کو لکھنے پڑھنے کا شوق بھی تھا۔ اسی لیے وہ اخبار میں کالم لکھتا۔ ایڈیٹر نے اسے مشورہ دیا کہ تم گلی گلی قریہ قریہ جا رہے ہو، تو بزرگوں کے مسائل معلوم کر کے ان کے حالات، خیالات اور احساسات پہ لکھو۔ شروع میں ندیم کو ان مسائل پر لکھنا فضول لگا۔ لیکن جب وہ بزرگوں سے ملا تو اسے احساس ہوا کہ ہر بزرگ کے مسائل الگ ہیں۔ بالمشافہ گفتگو سے ایسی باتیں آشکار ہوئیں جن کے متعلق وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ تب اسے اپنا گاؤں اور وہاں کا ماحول یاد آیا جہاں سے اس کا خمیر اٹھا تھا۔

ندیم نے گاؤں میں آنکھ کھولی۔ بچپن گلیوں میں بھاگتے دوڑتے گزرا۔ جب بڑا ہوا تو پرائمری میں داخل ہو گیا۔ سب بچے مل کر اسکول جاتے۔ راستے میں پہاڑے یاد کرتے۔ چشمے کے کنارے بیٹھ کر اپنی تختیاں دھوتے۔ ہنسی مذاق کرتے وقت کا پتا ہی نہ چلتا۔ گاؤں میں ہر بڑا شخص چاچا، تا یا اور ہر بڑی عورت موسی۔ ہر بزرگ دادا جی کہلاتا۔ دن ڈھلے لوگ اپنے کھیتوں اور دوسرے کاموں سے فارغ ہو کر چوپال میں بیٹھتے۔ قصے کہانیاں ہوتیں۔ بچے شرارتیں کرتے آپس میں جھگڑتے تو بزرگ اُن کے کان مروڑتے۔ لیکن مجال ہے جو بچوں کے والدین یہ کہتے "تو نے میرے بچے کو ہاتھ کیوں لگایا؟"

نوجوانوں میں تکرار ہوتی تو کوئی بزرگ انھیں سمجھا کر بات ختم کرا دیتے۔ سب ایک دوسرے کی دلجوئی کرتے۔ کوئی بیمار ہوتا تو سب اس کی دوا دارو کا خیال رکھتے۔ کسی کو چلنے میں دقت ہوتی تو اسے چوپال میں چارپائی پر لٹا کر لایا جاتا۔ سب اس کی دیکھ بھال میں لگ جاتے۔ یوں پورا گاؤں ایک خاندان کی طرح تھا جن کے درمیان جھگڑے ہوتے' تو تبھی میں پیار بھی بہت تھا۔ کوئی اس دارِفانی سے کوچ کرتا' تو پورا گاؤں سوگوار ہو جاتا۔ مرحوم یا مرحومہ کے بچوں کا خیال رکھا جاتا۔ ندیم شہر آیا تو اسے وہاں کا ماحول مختلف لگا۔ گاؤں میں سب مل جل کر رہتے تھے مگر یہاں تو نفسانفسی کا عالم تھا۔

ایک دن اسے خیال آیا کہ شہروں میں بزرگوں کے گھر (اولڈ ہومز) بنے ہوئے ہیں۔ وہاں مقیم بزرگوں سے بھی ملنا چاہیے۔ ندیم نے پھر انٹرنیٹ میں یورپ اور امریکا میں "اولڈ ایج ہومز" سے متعلق معلومات حاصل کیں۔ اُسے معلوم ہوا ان گھروں میں بزرگوں کا بڑا خیال رکھا جاتا ہے۔ ہر ہفتے ڈاکٹر ان کا معائنہ کرتا' معالج کی ہدایت کے مطابق انھیں غذا دی جاتی' ان کے لیے کشادہ لائبریری ہے جہاں اخبارات اور مختلف موضوعات پر کتابیں رکھی ہوتیں۔ معذور افراد کی مدد کے لیے رضا کار موجود ہوتے جو انھیں وہیل چیئر پر سیر کراتے اور بازار بھی لے جاتے۔ یوں وہ بزرگ آرام سے رہتے۔ اکثر کے بچے سال میں دو دفعہ ملنے چلے آتے۔ گو یہ مغربی تہذیب کا منفی پہلو ہے کہ بچے بڑے ہو کر والدین سے زیادہ تعلق نہیں رکھتے۔

بہرحال ندیم کو محسوس ہوا کہ ترقی یافتہ معاشروں میں حکومت سے لے کر عام لوگ تک بزرگوں کا خیال رکھتے ہیں۔ ایک دن سروے کرتے کرتے وہ لاہور کی خوشحال بستی "ڈیفنس" جا پہنچا۔ ایک گھر کے دروازے پر ڈاکٹر امان اللہ خان کے نام کی تختی نصب تھی۔ ندیم نے چوکیدار سے کہا "میں مردم شماری کے دفتر سے آیا ہوں اور صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔ چوکیدار نے انٹرکام پر مالک سے بات کی تو اجازت ملنے پر ایک اور ملازم نے دروازہ کھولا۔ وہ ندیم کو وسیع لان میں لے گیا جہاں چند کرسیاں اور میز سلیقے سے رکھی تھیں۔ لان میں چاروں طرف خوبصورت پھولوں کے تختے لگے تھے۔ پھولوں کی خوشبو سے اس کا دماغ معطر ہو گیا۔

ابھی وہ لان کی سجاوٹ دیکھنے میں محو تھا کہ ایک بزرگ آتے نظر آئے۔ ہاتھ میں چھڑی تھامے وہ وجیہہ بزرگ شاندار لباس میں ملبوس تھے۔ قریب آنے پر ندیم نے اٹھ کر انھیں سلام کیا۔ وہ مسکرائے اور اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور ملازم کو چائے لانے کا کہا۔ ملازم رخصت ہوا، تو وہ ندیم سے مخاطب ہوئے "کہو میاں، کیسے آئے؟"

ندیم نے کہا "ڈاکٹر صاحب! میں محکمہ مردم شماری کی طرف سے حاضر ہوا ہوں۔ یہ فارم ہے، اسے پُر کر دیجیے۔ آپ کے علم میں ہو گا، انتخابات ہونے والے ہیں۔ مردم شماری کے ساتھ ووٹروں کی فہرستیں بھی بن جائیں گی۔"

"انھوں نے فارم پر طائرانہ نظر ڈالی اور بولے، "میں بتاتا ہوں آپ ہی بھر دیجیے۔"

ندیم نے کہا "بہت بہتر۔ مناسب ہو تو پہلے اپنے

بارے میں بتائیے۔ گھر میں کتنے افراد ہیں کیوں کہ ہر ایک کے متعلق لکھنا ہے۔"

انھوں نے ٹھنڈی سانس لی اور اداسی سے بولے "بیٹا میں اس وسیع مکان میں تنہا رہتا ہوں۔ چند ماہ قبل میری شریک حیات ملک عدم سدھار گئیں۔ اب میں ہوں اور میرے دو ملازم!"

"آپ کے بچے نہیں؟" ندیم نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

"دو بیٹے ہیں لیکن دونوں امریکا رہتے ہیں۔ ان کی بیگمات انگریز ہیں۔ بچے بھی وہیں پیدا ہوئے۔"

"وہ آتے تو ہوں گے؟"

"ہاں آتے تو ہر سال ہیں۔ ماں کے انتقال پر بھی آئے۔ ایک ماہ رہے۔ مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے لیکن میں نے انکار کر دیا۔ اپنا ملک اپنا ہی ہوتا ہے۔ میں امریکا جا چکا لیکن مستقل وہاں نہیں رہ سکتا۔"

ندیم کو احساس ہوا کہ تنہائی کا شکار ڈاکٹر صاحب دل کی بھڑاس نکالنا چاہتے ہیں۔ اس نے پوچھا "ڈاکٹر صاحب! اپنے بچوں کے بارے میں بتائیے کہ وہ وہاں کیا کرتے اور یہاں کب آتے ہیں؟ آپ کے تنہا رہنے سے پریشان تو ہوں گے؟"

"ہاں فکرمند تو ہیں لیکن میں وہاں جا کر کیا کروں؟ یہاں میری چھوٹی سی لائبریری ہے۔ مجھے لکھنے پڑھنے کا شوق ہے۔ میں نے ساری عمر پڑھایا لکھایا ہے۔ پھر ان کی ماں بھی امریکا نہیں جانا چاہتی تھی۔ یہ ملازم میرا خیال رکھتے ہیں۔"

"پھر بھی ڈاکٹر صاحب، میں حیران ہوں کہ بیٹوں نے آپ کو تنہا کیسے چھوڑ دیا۔ اپنے تو اپنے ہی ہوتے ہیں۔"

ڈاکٹر صاحب مسکرائے اور بولے "بھئی اب بچے بھی کیا کریں، ہم خود ہی نہیں گئے۔ وہ بیگمات کی وجہ سے یہاں نہیں آتے۔ ہم ایک دوسرے کی مجبوریاں سمجھتے ہیں۔ لہٰذا اب تو اسی طرح زندگی گزارنی ہے۔"

اسی دوران ملازم چائے لے آیا۔ میں چائے پیتا رہا اور وہ خود ہی بولتے رہے:

"ایک زمانے میں ہمارے ہاں مشترکہ خاندانی نظام رائج تھا۔ گھر بڑے نہ ہوتے، تب بھی سب مل جل کر رہتے۔ کئی لوگ ایک ہی کمرے میں سما جاتے۔ درحقیقت گھر تو مکینوں سے آباد ہوتے ہیں۔ ان گھروں میں خوشیاں اور غم سانجھے ہوتے۔ سب کے بچے اپنے ہی لگتے۔ وہاں کوئی ضعیف یا بیمار تنہائی کا شکار نہ ہوتا۔ جس گھر میں بچوں کی شرارتیں، نوجوانوں کے قہقہے اور بزرگوں کی دعائیں گونجتیں، وہاں خدا کی رحمت نازل ہوتی ہے۔ رات کو کھلے صحن میں سب سوتے۔ دادی اور نانی بچوں کو چاند والی بڑھیا کی کہانیاں سناتی۔"

ندیم کو یوں لگا جیسے ڈاکٹر صاحب نے اس کے گاؤں کا نقشہ کھینچ دیا ہے۔ وہ کہہ رہے تھے "تمہارا تعلق گاؤں سے لگتا ہے۔ مجھے بھی وہاں کی آب و ہوا پسند ہے۔ نہ گاڑیوں کا شور نہ ڈیزل کا دھواں۔ لوگ جسمانی محنت کرنے کے باعث دل اور ذیابیطس (شوگر) جیسی موذی بیماریوں سے بچے رہتے ہیں۔ قناعت پسند ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی سعی نہیں کرتے۔ شہر میں تو ایک دوڑ لگی ہے۔ جس کے پاس پیسا اور طاقت ہے، وہی راج کرتا ہے۔ رشوت، ملاوٹ، مار دھاڑ، قتل و غارت گری...... بس یہ کہ لوگ نفسانفسی کا عالم ہے۔"

ندیم غور سے ان کی باتیں سنتا رہا۔ ان کے چہرے پر دکھ کے آثار نمایاں تھے۔ بیوی کی وفات اور بچوں کی دوری نے انھیں تنہا کر دیا تھا۔ ندیم کے آنے پر وہ چند ساعتوں کے لیے ہی سہی اپنی تنہائی سے نکل آئے۔ تبھی انھوں نے ایک اجنبی کو اپنے دل کا حال کہہ سنایا۔ اسے احساس ہوا کہ ماضی ان کے حواس پر طاری ہے۔ انھوں نے اپنے ماضی کی جو عکاسی کی، ایسا وہی کر سکتا ہے جو مشترکہ خاندانی نظام کا حصہ رہا ہو۔ جیسے اپنے البم سے لگاؤ ہو جس کی نظریں پل پل یادوں کی دہلیز پر لگی ہوں۔ جو تصویروں سے باتیں کرتا اور خیالات کے دریچے سجاتا ہو۔ آخر ندیم نے ٹھنڈی سانس بھری، گھڑی پر نظر ڈالی، ڈاکٹر صاحب سے اجازت لی اور بولا "آپ سے مل کر بہت مسرت ہوئی۔ آپ کی باتیں ہم نوجوانوں کے لیے مشعل راہ ہیں۔ میں پھر آؤں گا جب بھی موقع ملا۔"

اولاد کا ستایا بوڑھا ریڈیو سے دل بہلاتے ہوئے

"ہاں ضرور آنا! مجھے بھی انتظار رہے گا اور فارم بھرنے کا شکریہ۔"

ندیم کوٹھی سے باہر چلا آیا لیکن انہی کے متعلق سوچتا رہا۔ اللہ تعالیٰ نے ڈاکٹر صاحب کو ہر آسائش سے نوازا لیکن تنہائی کا زہر انھیں آکٹوپس کی طرح جکڑے ہوئے ہے۔ جس اولاد کے لیے سب کچھ کیا، وہی چھوڑ گئی۔ اب وہ ہیں، تنہائی اور گھڑی کی ٹک ٹک...... ندیم کے دل سے دعا نکلی کہ اللہ ان کے بیٹوں کو نیکی کی ہدایت دے اور باپ کو اطمینان اور صبر!

دوسرے دن پھر اس نے سروے کا سامان اٹھایا اور ڈیوٹی پر نکل پڑا۔ مختلف گھروں سے معلومات اکٹھی کرنے کے بعد پیٹ پوجا کرنے ایک ہوٹل گیا۔ وہاں اس کی نگاہ باہر کھڑے ایک سفید پوش بزرگ پر پڑی جو خاموشی سے اندر جانے والے ہر فرد کو تک رہے تھے۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ کچھ کہنا چاہتے ہیں۔

ندیم ان کے پاس گیا اور پوچھا "میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں؟"

بزرگ نے جھکی نظروں سے کہا "اگر ہو سکے تو کھانا کھلا دیں۔"

ندیم نے ان کی خودداری کو محسوس کر لیا۔ اسے جھٹکا سا لگا۔ اس نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ دونوں اندر جا کر میز کے گرد بیٹھ گئے۔ کھانے کا آرڈر دے کر ندیم نے بزرگ کی طرف دیکھا، ان کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ دوران طعام خاموشی چھائی رہی۔ ہوٹل سے نکل کر ندیم نے کہا "میں آپ کو گھر چھوڑ آؤں؟"

بزرگ بولے "میرے بیٹے کا گھر قریب ہی ہے، لیکن میں اس کے ہاں جانا نہیں چاہتا۔"

ندیم نے پوچھا "کیا کوئی خاندانی مسئلہ ہے؟"

کہنے لگے "کیا بتاؤں بیٹا، گھر میں مالی تنگی ہے۔ میری پنشن ناکافی ہے۔ آدھی میری بیماری پر لگ جاتی ہے اور کچھ خورد و نوش پر! اب میں بیٹے سے کیا مانگوں، اس کی آمدنی بھی زیادہ نہیں۔ یہاں میں کھڑا ہوتا ہوں، تو کوئی نہ کوئی سخی کھانا کھلا دیتا ہے۔ اللہ پاک بڑا رازق ہے۔" یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

ندیم نے کہا "آپ بوڑھوں کے گھر چلے جائیے۔"

بزرگ بولے "میں ایسے کسی ادارے کو نہیں جانتا۔

اس نے کہا "آپ کل مجھے یہیں ملیے گا۔ میں آپ کو لے جاؤں گا۔" یہ کہہ کر اس نے خاموشی سے ایک سرخ نوٹ ان کی جیب میں رکھا اور اپنے کام پہ چلا گیا۔

گھر واپسی پر بزرگ کا چہرہ اس کی نظروں میں گھومتا رہا۔ ندیم نے سوچا، اس شہر میں نجانے کتنے بزرگ اپنی سفید پوشی کا بھرم رکھے فاقہ کشی کرتے ہوں گے۔ تبھی اسے حضرت عمرؓ کا فرمان یاد آ گیا۔ آپؓ نے فرمایا تھا "دریائے فرات کے کنارے اگر ایک کتا بھی بھوکا سویا تو اس کا حساب قیامت کے دن عمر کو دینا پڑے گا۔" اور ہم کیسے مسلمان ہیں کہ جنھیں اپنے پڑوسی کی بھی خبر نہیں؟

اگلے دن وہ سب سے پہلے بوڑھوں کے ایک گھر پہنچ گیا۔ دروازے پر لکھا تھا "جائے عافیت"۔ یہ بزرگوں کا سرکاری گھر تھا۔ وہ منتظم سے ملا اور اسے بتایا کہ ملک میں مردم شماری ہونے والی ہے۔ وزارتوں کا کام بھی جاری ہے۔ چناں چہ ادارے میں مقیم افراد کے کوائف درکار ہیں۔

اس نے بڑی نخوت سے کہا "آپ ان بوڑھوں کے کوائف لے کر کیا کریں گے؟ ان میں تو بیشتر معذور اور کمزور ہیں۔"

"اچھا میں ان سے بات چیت تو کر سکتا ہوں؟"

"ہاں کیوں نہیں؟ ضرور ملیے اور بات کیجیے۔ آپ کو خود ان کی حالت کا اندازہ ہو جائے گا۔"

تب ندیم نے کہا "کل مجھے ایک لاوارث بزرگ ملے تھے۔ اگر آپ انھیں داخل کر لیں تو مہربانی ہوگی۔"

منتظم بولا "کیوں نہیں، میں انھیں خوش آمدید کہوں گا۔"

ندیم نے نماز ظہر کے بعد آنے کا وعدہ کر لیا۔ وہ جب ہوٹل پہنچا تو بزرگ چھوٹا سا تھیلا لیے کھڑے تھے۔ ندیم نے سلام کیا اور انھیں کھانا کھلایا۔ پھر بتایا کہ میں آپ کے لیے "اولڈ ایج ہوم" والوں سے بات کر آیا ہوں۔ یہ سن کر وہ کچھ مطمئن ہوئے اور چلنے کی ہامی بھر لی۔ ندیم نے ان کا شناختی کارڈ دیکھا، تعلیم وغیرہ کا پوچھا اور انھیں "جائے عافیت" لے آیا۔ اس نے دفتر والوں سے کہا "یہ صدر الدین ہیں، پڑھے لکھے ہیں۔ سرکاری ملازمت میں رہے ہیں۔ جسمانی طور پہ فٹ ہیں۔ اگر ان کے ذمہ کوئی کام لگا دیا جائے تو میرے خیال میں اچھی طرح انجام دیں گے۔"

اہلکار نے انھیں خوش آمدید کہا اور کہنے لگا "آپ یقیناً ہمارے ادارے کے لیے بہت کارآمد ثابت ہوں گے۔" ان کا مسئلہ حل کرنے کے بعد ندیم نے اپنا سروے شروع کرنے کی اجازت مانگی جو اسے بخوشی مل گئی۔

ندیم ادارے کے اندر چلا گیا۔ سردیوں کے دن تھے۔ کچھ بزرگ کرسیوں پر بیٹھے دھوپ تاپ رہے تھے۔ برآمدے میں پلنگ بچھے تھے۔ بعض بزرگ ان پر لیٹے آرام کر رہے تھے۔ اس نے قریب جا کر دیکھا تو اکثر بیمار اور کمزور نظر آئے۔ بستر اور کپڑے بھی میلے تھے۔ کسی کے کان میں آلہ سماعت تھا، کسی نے موٹے دھاگے سے بندھی عینک لگا رکھی تھی۔ کوئی چلنے سے معذور تھا۔ ایک بزرگ کرسی پر براجمان تھے۔ ان کے کان میں آلہ اور ناک پر موٹے شیشوں والی عینک بھی تھی۔ ندیم نے سوچا، ابتدا اسی بزرگ سے کی جائے۔ صدر الدین بھی ساتھ تھے۔

ندیم نے انھیں سلام کیا اور صدر الدین کا تعارف کرایا کہ یہ صاحب آپ کے نئے ساتھی ہیں۔ ان بزرگ نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "میرا نام زاہد ہے اور آپ کون ہیں؟"

"میرا نام ندیم ہے اور میں محکمہ مردم شماری کی طرف سے سروے کر رہا ہوں تاکہ ملک کی صحیح آبادی کا پتا چل سکے۔ انتخابات ہونے والے ہیں، آپ بھی ووٹ ڈالیں گے نا؟"

"بہت خوب، کیا حکومت کو معلوم ہو گیا کہ ہم بھی اسی ملک کے شہری ہیں؟ اور ہمارے بھی کچھ حقوق ہیں۔ ہم نے ساری زندگی اس ملک کی خدمت کی ہے مگر ہمیں اس کا کیا صلہ ملا؟"

ندیم نے کہا "قبلہ! حکومت آپ بزرگوں کے لیے کچھ نہ کچھ کرتی رہتی ہے۔ مگر "کالی بھیڑیں" اپنی بدعنوانیوں کی وجہ سے سرکاری امداد آپ تک نہیں پہنچنے دیتیں۔ آپ کو یہاں حکومت ہی نے تحفظ دیا ہے لیکن اس جگہ کارندے ایماندار، محنتی اور خوش اخلاق ہوں تبھی آپ سرکاری سہولتوں سے فائدہ اٹھا سکیں گے۔" ندیم کو باتیں کرتا دیکھ کر دوسرے بزرگ بھی وہاں آ گئے۔

ندیم نے ایک نئے بزرگ سے پوچھا "آپ کے بچے ہیں؟"

وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولے "میرا کوئی بیٹا نہیں۔"

ندیم نے محبت سے ان کا ہاتھ پکڑا اور کہا "چلیے مجھے اپنا بیٹا بنا لیں۔"

دوسرے صاحب جو قریب ہی بیٹھے تھے، بولے "میرا بیٹا تو ہے مگر وہ یہاں نہیں رہتا۔"

ندیم نے ان کی طرف رخ کر کے پوچھا "پھر وہ کہاں رہتا ہے؟"

"کافروں کے دیس میں۔"

"چلیے بیٹا ہے تو سہی، آتا تو ہوگا؟"

"ارے نہیں، وہ یہاں کیوں آنے لگا۔ اس کی بیوی انگریز ہے۔ بیٹے نے اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش تو کی تھی لیکن میں کیوں جاؤں کافرستان! ہاں کبھی کبھی پیسے بھیج دیتا ہے۔ بس یہی گھر ٹھیک ہے۔ یہاں میرے کئی دوست اچھے ہیں۔ ان سے دل لگا رہتا ہے۔ کھانے کو روٹی مل جاتی ہے، رہنے کو چھت ہے، مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔"

"تو آپ یہاں خوش ہیں؟" ندیم مسکرایا۔

"ظاہر ہے۔ یہ میرا وطن ہے۔ اسے ہم نے بہت قربانیاں دے کر بنایا۔ کئی پاکستانی اپنے ملک کی قدر نہیں کرتے لیکن میں اسے چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا۔"

ندیم کو باتوں سے وہ پڑھے لکھے لگے۔ ان کی گفتگو سن کر وہ بہت خوش ہوا۔ وہ کچھ دیر رک کر بولے "اچھا اب میں آرام کروں گا۔" یہ کہہ کر انھوں نے اپنی چھڑی اٹھائی اور کمرے کی طرف چل دیے۔ چلنے میں انھیں کچھ دشواری محسوس ہو رہی تھی۔

تیسرے صاحب نے اپنی عینک درست کرتے ہوئے کہا "ارے تم یہ بتاؤ کہ ہو کون؟ ہماری خبر لینے تو کوئی بھی نہیں آتا؟"

اس سے پہلے کہ ندیم کچھ کہتا، صدر الدین جو خاموشی سے ساری باتیں سن رہے تھے، بولے "یہ ندیم صاحب ہیں۔ محکمہ بہبود آبادی میں کام کرتے ہیں۔ آج کل انتخابات

ہونے والے ہیں تو یہ ووٹروں کی فہرستیں تیار کر رہے ہیں۔ آپ کو بھی ووٹ ڈالنا ہے؟"

"یہ نوجوان تو ہمارے لیے مسیحا ثابت ہوا ہے۔" دوسرے بزرگ بھی ان کی طرف متوجہ ہوئے اور بولے "شکر ہے، کسی کو تو ہمارا احساس ہوا۔"

ندیم نے گھڑی دیکھی، اسے یہاں خاصا وقت بیت چکا تھا۔ وہ بولا "مجھے اجازت دیجیے۔ لیکن آپ حضرات ووٹ ضرور ڈالیے گا۔"

ایک صاحب بولے "بھئی کوئی بھی حکومت آئے' ہماری فکر کس کو ہوتی ہے؟ جب اپنی اولاد توجہ نہیں دیتی تو دوسروں کو کیسے ہوگی؟"

"چچا اگر آپ کا بیٹا ہے تو وہ خیال رکھے گا۔"

ارے میاں، اسے میری فکر ہوتی تو میں یہاں کیوں ہوتا؟ ہاں وہ میرا بیٹا ہے لیکن اس کے پاس میرے لیے وقت نہیں، وہ تو اپنی بیوی کا ہو کر رہ گیا ہے۔"

"اور آپ کی بیگم؟" ندیم نے استفسار کیا۔

"وہ انہی حالات کی وجہ سے پریشان رہتی تھی۔ آخر گزشتہ سال اللہ کو پیاری ہو گئی۔ اور میں یہاں چلا آیا۔ یہاں کم سے کم دو وقت کی روٹی تو مل جاتی ہے۔" یہ باتیں سناتے ہوئے وہ آبدیدہ ہو گئے۔

ایک اور بزرگ جن کے ہاتھوں میں رعشہ تھا، بولے "کم و بیش میری بھی یہی کہانی ہے۔ بس میرا بیٹا بیوی کو بغیر بتائے کبھی کبھی آتا اور کچھ پیسے دے جاتا ہے۔"

ندیم نے انھیں تسلی دی "میں بھی آتا رہوں گا۔ بس آپ شکر کیجیے کہ آپ کو رہنے کا ٹھکانا میسر ہے۔ لیکن یہ بتائیے' آپ لوگ مطمئن تو ہیں؟ یہاں کے منتظمین کا آپ کے ساتھ کیسا سلوک ہے؟"

ایک بزرگ نے کہا "حکومت نے اولڈ ایج ہوم بنا

آج تجھے کیوں چپ سی لگی ہے
کچھ تو بتا کیا بات ہوئی ہے
آج تو جیسے ساری دنیا
ہم دونوں کو دیکھ رہی ہے
تُو ہے اور بے خواب دریچے
میں ہوں اور سنسان گلی ہے
خیر تجھے تو جانا ہی تھا
جان بھی تیرے ساتھ چلی ہے
اب تو آنکھ لگا لے ناصر
دیکھ تو کتنی رات گئی ہے
(ناصر کاظمی)

کر مغرب کی نقالی کی ہے۔ مگر یوں ہمیں سر چھپانے کی جگہ مل گئی۔ لیکن ہماری آواز حکومت تک پہنچا دو کہ مغرب والوں جیسا اخلاق بھی پیدا کرے۔ بوڑھوں سے محبت کرو' انھیں عزت دو' پنشن کی وصولی میں جو مشکلات ہیں، ان کا خاتمہ کرو اور نوجوان نسل کو بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے، اپنے ماں باپ کے سامنے اُف تک نہ کرو۔ ان کا ہر طرح خیال رکھو نہ کہ انھیں بوڑھوں کے گھر ڈال کر خود بے فکر ہو جاؤ۔ اب یہ ہمارے ساتھ جو بھی سلوک کریں، تم نے دیکھ ہی لیا۔"

"میں کل ہی کے اخبار میں آپ کا پیغام شائع کر دوں گا۔ آپ بالکل فکر نہ کیجیے۔" ندیم کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ اس نے بزرگوں سے اجازت طلب کی۔

صدرالدین نے کہا "ندیم' ہم سے ملنے آتے رہنا۔ تم سے مل کر دل کا بوجھ ہلکا ہو گا اور ہم سمجھیں گے کہ کسی نوجوان کو تو ہمارا خیال آیا۔"

اس نے کہا "آپ فکر نہ کیجیے' میں اور میرے ساتھی بھی آپ لوگوں کے پاس آتے رہیں گے۔"

ندیم وہاں سے نکلا تو اس کے دل پر بڑا بوجھ تھا۔ وہ

سوچ رہا تھا کہ ہم پاکستانیوں میں سے اکثر والدین اور بزرگوں کے ساتھ ناروا سلوک کرتے ہیں۔ وہاں جس کسمپرسی کے عالم میں وہ رہ رہے ہیں اور جو گندگی کا حال تھا، اللہ کی پناہ......

یہ خیالات اس کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے تھے کہ اچانک اس کی نظر خانہ بدوشوں کی ایک بستی پر پڑی۔ دل میں آیا کہ ان کے بزرگوں سے بھی بات چیت کرنی چاہیے۔ یوں پتا چلے گا کہ وہ کس حال میں ہیں۔ چناں چہ وہ اس طرف بڑھا۔ سڑک سے تھوڑا نیچے جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ بچے ننگے پاؤں اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ چند کتے، بندر اور بکریاں چارپائی کے پائے سے بندھے اونگھ رہے تھے۔ خیموں کے اندر باہر مرد اور عورتیں کام کاج میں مصروف تھے۔ ندیم ان کی طرف بڑھا۔ اسے دیکھ کر بچے دوڑتے ہوئے اس کی طرف لپکے۔ ندیم نے کہا "سامنے جو شخص بیٹھا ہے، اس کو بلاؤ' وہ تمھارا کون ہے؟

کسی نے کہا "چاچا' کسی نے کہا "ماما" اور کوئی شرما کر بھاگ گیا۔ ندیم نے آدمی کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ وہ آتے ہی بولا "کیا آپ بندر کا تماشا دیکھنا چاہتے ہیں؟"

ندیم نے کہا "نہیں، آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔"

وہ حیران ہوا تو ندیم نے کہا "گھبراؤ نہیں، میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ ان خیموں میں کتنے لوگ رہتے ہیں اور جب بارش ہو تو اس سے کیسے بچاؤ کرتے ہیں؟"

اس نے کہا "صاحب جی ہم تو بنجارے ہیں اور آپ جانتے ہو کہ ہمارا کوئی ٹھکانا نہیں ہوتا۔ جہاں جگہ ملے، خیمہ لگا لیتے ہیں۔ وہ سامنے والی عمارت خالی ہے۔ بارش ہو تو کچھ دیر وہاں سر چھپا لیتے ہیں۔"

ندیم نے بچوں کی طرف دیکھ کر کہا "یہ اسکول نہیں جاتے؟"

اس نے ہنس کر کہا "کیوں مخول کرتے ہو جی۔ جس کے باپ دادا نے اسکول کی شکل نہیں دیکھی تو یہ کیا دیکھیں گے۔ کھانے کو روٹی مل جائے' یہی بڑی بات ہے۔ فیس اور کتابوں کی رقم کہاں سے لائیں؟"

ندیم نے اطراف پر نظر ڈالی اور بولا "یہاں تو بہت گندگی ہے۔ کوڑے کے ڈھیر اور اس نالے کی بدبو، کیسے رہتے ہو؟"

"صاحب! ہم ان بدبوؤں کے عادی ہو چکے۔ بارش کے بعد نالہ بھر جائے تو ہم یہ جگہ چھوڑ دیتے ہیں۔ آپ بتائیے کیسے آئے؟" ایسا لگا وہ ندیم کی باتوں سے تنگ آ گیا ہے۔

ندیم نے بتایا "میں سرکاری دفتر میں کام کرتا ہوں انتخابات ہونے والے ہیں۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ تم لوگوں کے شناختی کارڈ ہیں۔ اگر ہوں گے تو تم سب بھی ووٹ ڈال سکو گے۔"

"ہمارا پکا گھر ہوتا تو شناختی کارڈ بھی بن جاتا۔"

ندیم نے سوچا بات تو ٹھیک ہے۔ ان کی بھی کیا زندگی ہے۔ پھر پوچھا "یہ بتاؤ' تمھاری گزر بسر کیسے ہوتی ہے؟"

اس نے جانوروں کی طرف اشارہ کیا اور بولا "جی یہ سب میری گزر بسر کا ذریعہ ہیں۔ ہم سب ساتھی جانوروں کا تماشا دکھاتے اور کچھ محنت مزدوری کرتے ہیں۔ عورتیں لوگوں کے گھروں میں کام کرتی ہیں۔ اللہ بڑا بادشاہ ہے۔ روزی کا انتظام تو اوپر والا ہی کرتا ہے۔"

ندیم نے کہا "ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن تمھارے گھر میں بزرگ نہیں ہیں؟ یعنی تمھارے ماں باپ......

اس نے سر جھکا کر کہا "وہ بھی ہیں لیکن ہم انھیں اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتے۔"

ندیم نے حیرت سے کہا "تم جانور رکھ سکتے ہو لیکن

اپنے والدین کو کیوں نہیں؟"

آدمی شرمندہ ہو گیا۔ گردن نیچی کر کے کہنے لگا "جی ہمارا کوئی گھر نہیں۔ ماں باپ بوڑھے اور بیمار ہوں تو ہم انہیں لیے کیسے پھر سکتے ہیں؟"

ندیم نے حیران ہو کر پوچھا "تو وہ کہاں ہیں؟"

"وہ سڑک کنارے بیٹھ جاتے ہیں۔ کوئی پیسے دیتا ہے، کوئی کپڑے! رات کو وہ کسی دربار میں چلے جاتے ہیں۔"

ندیم نے کہا "یوں کہو تم ان سے بھیک منگواتے ہو۔"

وہ ہاتھ ملتے ہوئے بولا "بس جی مجبوری ہے۔"

"تم لوگ کتنے ظالم ہو۔ یہ جانور اور بہت سے بچے تو اپنے ساتھ رکھتے ہو لیکن ماں باپ بوجھ لگتے ہیں۔ اب پتا چلا ملک میں فقیروں کی تعداد کیوں بڑھ رہی ہے۔"

وہ آدمی خاموش رہا۔ ندیم دل پر مزید بوجھ لیے اٹھ کھڑا ہوا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا سڑک پر آ گیا۔ بہرحال اسے اپنے کالم کے لیے خاصا مواد مل چکا تھا۔

جب اس نے صورت حال کا تجزیہ کیا تو اسے احساس ہوا، تینوں طبقوں سے تعلق رکھنے والے بوڑھوں کے مسائل ایک ہی ہیں لیکن نوعیت جدا جدا ہے۔ ڈاکٹر امان اللہ معاشی طور پر مطمئن لیکن ان کی روح تنہائی کا شکار تھی۔ باقی حضرات مالی مشکلات کا شکار محبت کے بھوکے اور ملنے والوں سے بات کرنے کے خواہش مند نکلے۔ اُدھر جاہل خانہ بدوشوں کو اپنے والدین کے جذبات کا احساس ہی نہیں۔ اس نے سوچا "بہرحال مجھے اپنا وعدہ نبھانا ہے۔ میں اپنے ساتھیوں سے بھی درخواست کروں گا اگر ممکن ہو تو ہفتے میں یا کم از کم مہینے میں ایک بار اولڈ ایج ہوم جا کر بزرگوں سے مل لیا کریں تاکہ ان کے دل کا بوجھ ہلکا ہو سکے۔"

◆◆◆

غزل

ہر چیز ہے محوِ خود نمائی
ہر ذرہ شہید کبریائی

بے ذوقِ نمود زندگی، موت
تعمیرِ خودی میں ہے خدائی

رائی زورِ خودی سے پربت
پربت ضعفِ خودی سے رائی

تارے آوارہ و کم آمیز
تقدیرِ وجود ہے جدائی

یہ پچھلے پہر کا زرد رُو چاند
بے راز و نیازِ آشنائی

تیری قندیل ہے ترا دل
تُو آپ ہے اپنی روشنائی

اک تُو ہے کہ حق ہے اس جہاں میں
باقی ہے نمودِ سیمیائی

ہیں عقدہ کشا یہ خارِ صحرا
کم کر گلۂ برہنہ پائی

(علامہ اقبالؒ)

دین کی دنیا

اے مسلمانو! ہوشیار، خبردار

اللہ دیکھ رہا ہے

نامہ اعمال سنوارنے کی تگ و دو میں
مبتلا ایک مسلمان کا چشم کشا سفر خود آگہی

نجم اسعر

مجھے بچپن ہی سے تاریخ میں گہری دلچسپی رہی ہے۔ اسی لیے اسے پڑھتے ہوئے ماضی کے کئی جھروکوں میں جھانکا، تو بڑے بڑے مہذب اور معقول لوگ کبھی کبھی خاصے غیر مہذب اور نامعقول نظر آئے۔ دوسری طرف کئی ڈاکو اور چور کبھی کبھی درویش منش اور صوفی صفت لگے۔ ایک مدت مطالعے کے بعد کچھ عقدے ہم پر کھل ہی گئے۔

پہلا تو یہ کہ ایک جاسوس نما شخص مسلسل ہر خاص و عام اور کس و ناکس پر کڑی نظر رکھے ہوئے ہے۔ وہ ہر رونما ہونے والا ہر چھوٹا بڑا واقعہ نوٹ کرتا ہے۔ دوسرا یہ کہ جب بھی کوئی عزت دار شخص زندگی گزار کر تہ خاک ابدی نیند جا سوئے اور اس کی نیک نامی مستند ہو جائے تو ایک آدھ صدی بعد یہ جاسوس اپنے سفاک رجسٹر کے صفحے پلٹ کر موصوف کی حیات کا کوئی ایسا گوشہ "بریکنگ نیوز" کی طرح فوکس میں لاتا ہے جس سے مرحوم لیٹے لٹائے (قبر میں) جی بھر کے بدنام ہو جاتا ہے۔ تیسرا عقدہ یہ کہ آپ بھلے سے چھپ کر یا بشری تقاضوں کے ہاتھوں مجبور ہو کے کوئی مزے دار سا گناہ کریں، یاد رکھیے، جب بھی وہ زمانے کے آگے آیا بے حد گھناؤنا اور کریہہ ہو جائے گا۔

لیجیے اب اس ساری آگہی کے بعد کون کم بخت ہو گا جو اپنے آج کو

بسر کرتے یہ سوچ کر آنے والے کل کے آئینے میں خود کو بار بار نہ جھانکے گا کہ "کیسا لگ رہا ہوں؟" میر کہتے ہیں کہ آدم اور ابلیس میں اگر کوئی فرق ہے تو وہ اسی گوڑ مارے "امپریشن" (تاثر) کا ہے۔

ہم نے پوچھا "وہ کیسے؟"

بولے "حضور! بھلا حکم عدولی کرتے اور پھر ازلی ڈھیٹ ہوتے وقت ابلیس نے یہ سوچا کہ ہزارہا ملائکہ، کروڑہا جنات، ایک خاکی آدم اور خود رب العالمین کے سامنے اس کا کیا امپریشن بن رہا ہے؟"

ہم شیطان نہیں چناں چہ آئینے میں اپنی صورت خوب ہی دیکھنے کی آرزو ہے۔ اس لیے اوائل جوانی ہی سے ہم حد درجہ محتاط ہو گئے کہ ہر اس بات سے بچنا ہے جسے جاسوس کبھی ہمارے خلاف استعمال کر کے ہمیں اس حالت میں رسوا کر دے جب ہم جواب دینے کے لائق بھی نہ رہیں یعنی سو برس یا دو سو سال بعد! مگر یہ کتنا کٹھن کام تھا اس کا اندازہ درج ذیل واقعات سے لگایا جا سکتا ہے۔

لڑکپن میں ہمارے ہم عمر لونڈے کنچے کھیلتے، پتنگیں اڑاتے اور کبوتر بازی کر کے مزے لیتے اور ادھر ہم انھیں ہنستا کھیلتا دیکھ کر جی ہی جی میں کلستے رہتے۔ کیوں؟ تاکہ بعد میں لوگ یہ نہ کہیں "مولانا ابرار الدین کے خاندانی ہونے پر کوئی شبہ نہیں مگر تاریخ میں ہے کہ ان کے منجھلے صاحبزادے 'اعزاز الدین گھٹیا اور پنچ لوگوں کی معیت میں غیر شریفانہ کھیل تماشوں میں حصہ لیا کرتے تھے۔" (اعزاز الدین ہمارا ہی نام نامی ہے)

جوانی کے دیوانہ ہونے پر کسی کو شبہ نہیں مگر ہم نے اس عالم میں بھی ہوش کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ کیا مجال جو گلی محلے میں کوئی آنکھ مٹکا کیا' اگرچہ بقول میر کے اس کی وجہ آنکھوں کا مرکز مشترکہ نہ ہونا تھا۔ مگر یہ ان کی رائے ہے ہماری نہیں۔ کوئی عشق ہمارے نامۂ اعمال میں درج نہیں جو پھر بقول میر ہمارے کم رو

ہونے پر دلیل ہے' شرافت میں نہیں۔ اس پر ہم برا مان گئے تو انھوں نے الفاظ واپس لے کر آئینہ ہمیں تھما دیا۔ ہم نے غور کیا تو لگا کہ چند بنیادی کمزوریوں اور کمی گوشت کے علاوہ ہمارا چہرہ ٹھیک ٹھاک ہی ہے۔ مگر جب ہم نے اپنے جذبات میر تک پہنچائے تو انھوں نے آہ سرد بھر کر آئینہ ہاتھ سے لے لیا۔

بہرکیف شادی ہوئی۔ بیگم شروع ہی سے بھاری بھرکم ملیں۔ اب ہماری جوڑی 'الف، نون' کے مثل تھی..... نہ ہم اپنی دبلی پتلی حالت سے آگے آئے نہ بیگم پیچھے ہٹیں۔ بلکہ اوپر تلے تین بچوں کی آمد کے بعد تو وہ مستقل ہو گئیں۔ ہر چند انھوں نے ہر حربہ آزمایا کہ ہم ذرا جان پکڑ لیں۔ چھے ماہ بعد بچوں کو جو ٹھوس غذا دیتیں، وہ بصد اصرار ہمیں بھی کھلاتیں کیونکہ اس سے تو بچے بھی موٹے ہو جاتے تھے، ہم کیا چیز ہیں؟ مگر معاملہ بے سود رہا۔

یہ سلسلہ چھوٹی آنے کے تین سال بعد تک جاری رہا۔ ایک روز ہم اپنی پیاری گپلو سی بچی کو اوپر بٹھائے گھوڑا بنے دوڑنے کی کوشش میں ہانپ رہے تھے۔ وہ اپنی معصوم آواز میں گا رہی تھی "لکڑی کی کاٹھی..... کاٹھی پہ گھوڑا..... گھوڑے کی دم پہ جو مارا ہتھوڑا..... گھوڑا دوڑا..... دم دبا کے دوڑا۔" تو بیگم نے غصے سے اسے پکارا "ننھی اتر جا! کیا گھوڑے کو مار کے دم لے گی؟"

تب ننھی ہماری چہیتی اور ہمارے موٹا ہونے کی امید بیگم کے دل سے ہمیشہ کے لیے اتر گئی۔ یوں ہمیں گزشتہ پانچ برس سے بچوں کے پھیکے سیٹھے بے وقت کھانوں سے نجات ملی۔ ہم نے صد شکر کیا۔ میر نے سنا تو تعجب کیا کہ بھلے مانس اگر اچھے نہیں لگتے تھے تو پہلے

روز کھانے سے انکار کیوں نہ کر دیا بھائی کو؟"

ہم نے بتایا "کیسے کرتا؟ ہلکی پھلکی مزاحمت کو انھوں نے تجاہل عارفانہ جانا۔ زیادہ تکرار اس لیے نہیں کی کہ انتہائی صورت نہ بن جاوے..... کم بخت جاسوس کل کو لوگوں کو یہ نہ کہتا پھرے کہ تاریخ میں ہے 'اعزاز الدین بے حد غصیلے اور جھگڑالو تھے۔ بیگم کے ساتھ ان کا سلوک بے رحمانہ تھا۔ قیاس ہے شراب پیتے ہوں گے تبھی بیگم سے مار پیٹ بھی کیا کرتے کیونکہ بھائی ہوش و حواس اتنا دلیرانہ اقدام اٹھانے کی کس میں ہمت ہو سکتی ہے؟"

دفتری معاملات میں اس احتیاط کے نقصانات کچھ زیادہ نکلے۔ مثلاً ہمارا چپراسی رفیق' رفاقت کم اور مفارقت زیادہ دینے کا قائل تھا یعنی ہر دوسرے روز چھٹی۔ بہانہ کبھی بیوی کی بیماری تو کبھی ساس کا انتقال، کبھی بچے کے اسکول کا مسئلہ تو کبھی خاندان کا کوئی قضیہ۔ اس کا طریقۂ واردات کچھ یوں تھا کہ پہلے وہ آپ کو خدا خوفی کا واسطہ دیتا اور پھر اپنی بات کہتا یعنی اگر آپ انکار کرتے تو یہ ثابت ہو جاتا کہ آپ پرلے درجے کے بے رحم اور خدا کے خوف سے بے نیاز شخص ہیں۔

آپ تو سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ یہ بات جاسوس کس انداز میں پیش کرے گا؟ چناں چہ ہم دفتر میں جز وقتی افسر اور کل وقتی چپراسی (اپنے ہی) کے فرائض انجام دیتے۔ ساتھی افسران اور نائبین کا معاملہ بھی کچھ مختلف نہ تھا مگر ہم مستقبل کی بدنامی سے بچنے کے لیے حال کی بدحالی سہتے رہے۔ ورنہ تو خاک یہ سننے کو ملتا "اعزاز الدین کی کچھ خوبیاں بھی رہی ہوں گی مگر حقائق کی چھان پھٹک سے پتا چلا ہے کہ مرحوم بے حد تنک

مزاج، خود غرض اور بدلحاظ مشہور تھے۔ جہاں کام کرتے وہاں سبھی ان سے نالاں تھے۔ کبھی کسی کے کام نہ آتے۔ اپنی عادات و خصائل سے ننگ اسلاف و باعث عار مانے جاتے تھے۔" لیجیے قصہ ختم!

ان دلخراش معاملات کے باعث دل پر گرانی بڑھتی تو اپنے دوست میر سے بوجھ بانٹ لیتے۔ مگر جب واقعات بڑھنے لگے تو میر کی بھی قوت برداشت جواب دینے لگی۔ اب جونہی ہم دکھڑا شروع کرتے' وہ انا للہ پڑھ کر منہ پھیر لیتے۔ ایک روز ہم سے ضبط نہ ہوا تو کہہ اٹھے "میر تم اچھے مسیحا ہو' دوا کیوں نہیں دیتے؟"

وہ بولے "اعزاز الدین! تمھارے ننھے منے "بھیجے" میں یہ بات کیوں بیٹھ گئی ہے کہ تم کوئی عظیم ہستی یا بڑی شخصیت کے نام سے پہچانے جانے والے ہو۔ میرا مطلب ہے بعد از مرگ؟"

ہم نے عینک کے پیچھے آنکھیں پھاڑیں "بامیں بھیا! تاریخ تو عام آدمی کی بھی لکھی ہوئی پڑھی ہے ہم نے۔"

میر نے سر جھٹکا اور قدرے تیزی سے بولے "کس نے کہا؟ کس نے کہا؟ ارے معقول آدمی!..... تاریخ تو خواص کی ہوتی ہے جو بوقت ضرورت فرداً فرداً لکھی جاتی ہے۔ عام آدمی کا تو بس ماضی ہوتا ہے جو کروڑوں افراد کو ایک لفظ 'عوام' میں پرو دیتا ہے۔ یہ کبھی فرداً فرداً نہیں بتائی جاتی..... سمجھے؟"

پھر یہ خیال کر کے کہ شاید ہم نہیں سمجھے مزید تفصیل بیان کرنے لگے "دیکھو نا، اب کسی شاہی شادی کی شان و شوکت بیان کرنے والا تاریخ دان خاندان بھر کے لباس، زیورات، آرائش، سواریوں کی سج دھج راہوں میں بچھے قالین اور لٹائے جانے والی دولت اور جواہر کی

تفصیل لکھے گا۔ مگر لاکھوں ہم تم جیسے لوگ ایک جملے میں سما جائیں گے: ''عوام خوشحال تھی'' یا ''بدحال'' یا ''بے زار تھی، وغیرہ وغیرہ۔''

ہم کچھ کچھ قائل تو ہوئے پھر بھی مدت پرانی سوچ ایک دم تبدیل کب ہو سکتی ہے' لہٰذا ممنا کر بولے ''مم...... مگر...... مم...... میر......''

یہاں میر نے ہمیں مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔ بولے ''ٹھیک ہے...... اس کا حل سوچتے ہیں...... تم...... تم یہ کرو کہ روزانہ ڈائری لکھا کرو۔''

ہم نے نجی بچے کی طرح سوچے بغیر پوچھا ''اس سے کیا ہوگا؟''

میر ذرا جھنجھلائے پھر بولے ''ارے بندۂ خدا! تاریخ پر گہری نظر رکھتے ہو، پھر بھی مجھ سے پوچھ رہے ہو؟ دیکھو اگر تمھارے خدشے کے مطابق تم کچھ بن گئے اور تاریخ دان نے تم پر اپنا ''قلم'' صاف کرنا چاہا تو اسے دو تین سو سال پہلے کی معلومات لینے کے لیے ظاہر ہے تمھارے لواحقین، دفتر والے اور دیگر متعلقہ افراد تو ملیں گے نہیں۔ جو مشہور روایات سینہ بہ سینہ چلی جا رہی ہوں گی، ان کے مقابلے میں دستاویزی ثبوت زیادہ قابلِ اعتماد لگے گا۔ چناں چہ تمھاری لکھی ڈائری ان کے لیے نعمت سے کم نہیں ہوگی۔ بس تم یہ کرنا کہ وصیت کر جانا، تمھاری اولاد ہر صورت یہ ورثہ (ڈائری) اگلی نسل کو منتقل کرتی رہے اور یہ سلسلہ نہ رکنے پائے۔ ٹھیک ہے؟''

انھوں نے بے صبری سے میری تائید چاہی۔ بات دل کو لگتی کہہ دی تھی اس لیے میں نے میر کا ہاتھ چوم لیا۔

بس پھر کیا تھا، ہم نے اگلے ہی روز رفیق کی چھٹی والی درخواست گولا بنا کر ردی کی ٹوکری میں پھینکی اور اسے بلا کر نہایت جابرانہ اور جارحانہ انداز سے حکم صادر کیا ''اگر اب تو نے سرکاری رخصت کے علاوہ ایک بھی چھٹی کی تو تیری ہمیشہ کے لیے چھٹی۔''

اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ ہمیں یقین ہے کہ رفیق نے دفتر میں آگ کی طرح خبر پھیلا دی ہوگی ''صاحب کا دماغ الٹ گیا ہے۔'' لہٰذا اس روز دفتری عملہ ہمارے ساتھ کافی محتاط رہا۔

ہم نے گھر پہنچ کر دیکھا کہ بڑا لڑکا درمیانے سے دھینگا مشتی کر رہا ہے۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ پکڑ کر دونوں کو ایک ایک ہاتھ جڑ دیا۔ ساتھ ہی دھاڑ کر بیگم کو پکارا۔ وہ دہل کر بھاگی آئیں کہ یہ کون غنڈا گھر میں گھس آیا' کیونکہ ہماری اونچی آواز تو در و دیوار بھی نہیں پہچانتے تھے' وہ تو الگ رہیں۔ مگر ہمارے سخت تیور دیکھ کر پہلے تو حیران ہوئیں پھر پریشان۔ جب کہ بچے الگ منہ میں انگلی دبائے کھڑے تھے۔

ہم نے اپنی پست ہمت کو پھر جمع کیا اور چلائے ''یہ گھر ہے یا قمار خانہ! جب دیکھو ہنگامہ' جب آؤ فساد۔ خبردار! اب آواز بھی نہ سنوں۔'' یہ کہہ کر پیر پٹختے کمرے کا رخ کیا اور ڈائری کھول کر دن بھر کی روداد لکھ ڈالی۔ آخر میں لکھا کہ رفیق کی اصلاح اور پیشہ وارانہ اصول پسندی کی وجہ سے اس کے ساتھ سخت رویہ اختیار کیا۔ جب کہ بچوں کی تربیت اور گھر کے سکون کے لیے کبھی کبھی جارحانہ انداز اپنانا ضروری ہے۔

بات یہیں تک رہتی تو ٹھیک تھا مگر ہمارا دن بدن یہ حال ہوا کہ جیسے شیر کے منہ خون لگ گیا۔ ضروری سختی دھیرے دھیرے تنگ مزاجی اور اصول پسندی' خود پسندی میں بدلنے لگی۔ رویے میں لچک نہ رہی اور وہ ظلم کی حد کو چھونے لگا۔ مگر ڈائری میں ہر بات کی نہایت معقول توجیح اور خوبصورت اصطلاحات کی مقدار میں اضافہ ہونے لگا تا رہا۔

یہ سلسلہ شاید ہمیں فرعون ہی بنا دیتا اور ہم درگزر اور تحمل جیسی صفات سے بالکل تہی دست ہو جاتے اگر ایک روز بدترین ٹریفک میں نہ پھنستے۔ شاید کراچی کا وہ بدترین ٹریفک جام ہمیں کچھ جتانے کے لیے ہی برپا ہوا تھا۔ ہم جھنجلا رہے تھے مگر راستہ نہ مل سکا۔ بیزاری اور کوفت میں ادھر دیکھا تو دائیں جانب ایک پلازے کی عین پیشانی پہ لکھا نظر آیا ''کیا آپ جانتے ہیں کہ اللہ آپ کو دیکھ رہا ہے؟''

یہ پڑھ کر ہم ساکت و جامد رہ گئے۔ کچھ ہی دیر میں ٹریفک کھل گئی۔ لوگ گھروں کو چلے گئے مگر ہم گاڑی ایک طرف کھڑی کر کے سینے پر ہاتھ رکھے سوچنے لگے ''یہ کیسی بات تھی جو ہم بھول گئے؟ تاریخ دان کو تو ڈائری، خوبصورت الفاظ و توجیہات سے دھوکا دے لیں گے مگر اس سے...... جو ہمارے دل کے ہر ارادے اور نیتوں کی خبر تک رکھتا ہے، ہر جگہ ہمیں دیکھ رہا ہے، اس کے سامنے کس منہ سے جائیں گے؟ ان اعمال سمیت کیا ''امپریشن'' بنے گا؟'' ہمیں سب بھولے سبق یاد آ گئے۔

اس روز کے بعد ہم نے کچھ کام کیے...... گھر جا کر ڈائری جلائی اور جاسوس کا خوف دل و دماغ سے نکال کر معاملات کو معقولیت سے دیکھا۔ وہ یوں کہ اللہ کی محبت اور ناراضی کی کسوٹی پر زندگی کے فیصلے کرنے لگے۔ اس طرح بقول میر ''اب کی نا تم نے عقل مندوں والی بات!'' بیگم بھی بے حد خوش ہیں کہ بالآخر ان کی محنت رنگ لے ہی آئی۔ اب ہم بڈیوں کے پنجر سے نکل کر خاصے صحت مند ہو چکے۔

◆◆◆

کام کی باتیں

☆ رضا مندی کی آنکھ ہو تو کوئی عیب اسے نظر نہیں آتا اور جب ناراض ہو جائے تو اسے صرف برائیاں نظر آتی ہیں۔

☆ دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا آدمی ہو جو بلند منصب پر فائز ہو کر مست، خواہشات کے پیچھے چل کر درماندہ اور بدکاروں سے مل کر نادم نہ ہوا ہو۔

☆ ضرورتیں کم کرو گے تو راحت پاؤ گے۔

☆ جو تمھارے ایسے اوصاف بیان کرے جو تم میں سے نہ ہوں وہ تمھارے ایسے عیوب بھی بیان کرے گا جو تم میں نہیں۔

☆ اگر تم اپنے نفس کو حق میں مشغول نہ کرو گے تو وہ تم کو باطل میں مشغول کر دے گا۔

☆ سخاوت دنیا اور آخرت کے عیبوں کو ڈھانپ لیتی ہے۔

☆ چونکہ جاہل کو اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ وہ عالم ہے اس لیے وہ کسی کی بات نہیں مانتا۔

☆ جس طرح بصارت کی ایک حد ہوتی ہے اسی طرح عقل کی ایک حد ہوتی ہے جہاں وہ ٹھہر جاتی ہے۔

(امام شافعی)

جنت کے پھلوں میں سے ایک

کھجور

انسان کو سرطان، قبض، عفونت اور سوجن سے محفوظ رکھنے والا مقدس میوہ

دانش یار

بیر، کیلا، انجیر، زیتون، انار اور دیگر میوہ جات کا قرآن کریم میں تذکرہ پڑھتے مومن کا دل مسرور ہوتا لیکن کھجور کا تصور شیرینی اور خوشبو کی عجیب دنیا میں لے جاتا ہے۔ عربی زبان میں اسے "النخل" کہتے ہیں۔ "نخلستان" کھجوروں کا باغ کہلاتا ہے۔ خیال ہے کوہ طور پر جہاں حضرت موسیٰ کو انوارِ الٰہی دکھائی دیے، ان کا ظہور بھی کھجور کے درخت سے ہوا تھا۔

ماضی کے جھروکے سے دیکھیں تو اہل عرب کی روایتی مہمان نوازی کا آغاز کھجور اور عربی قہوے کی چھوٹی پیالی سے ہوا۔ ہلکی آنچ پر نیم پخت لوبیا کے دانوں کی قلیل مقدار بھی اس تواضع میں شامل ہوتی۔ صاحب حیثیت شیوخ کے ہاں کھجور کی مختلف انواع زینت دسترخوان بنتی۔ ہر سیاح اور مہمان بھی کھجور کی طلب اور شوق سے دل کو مسرور پاتا۔

سرزمین مملکت سعودیہ کھجور کی پیداوار میں ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ وہاں بھی مدینہ طیبہ اس پھل کی پیداوار میں سب سے منفرد ہے۔ اسی پاک زمین میں کھجور کی اعلیٰ اور معیاری پیداوار حاصل ہوتی ہے جن میں سب سے ممتاز کھجور "عجوہ" ہے۔

ترمذی میں حدیث مبارک ہے "بے شک "عجوہ" جنت کے پھلوں میں سے ایک پھل ہے۔" صحیح مسلم میں آیا ہے "جو اپنے دن کی ابتدا عجوہ کی سات کھجوریں کھا کر کرے، وہ زہر اور سحر کے اثر سے دن بھر محفوظ رہے گا۔"

صدیوں سے مدینہ منورہ کی اصل سوغات کھجور چلی آ رہی ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ کے عہد میمنت میں مشہور خرمتہ العجوہ، لون اور برنی تصور کی جاتی تھیں۔ آج بھی کھجور عجوہ ہی مدینہ مبارک کا خاص تحفہ ہے۔ دیگر اقسام میں الجدی، حلوہ، شلانی (بغیر گٹھلی کے جو تخل کے نام سے بھی مشہور ہے) مبروم، الجیش، الرابعہ، البرنی، الصفوی، الروثانہ اور العنبر بصد شوق کھائی جاتی ہیں۔

مدینہ طیبہ کی کھجور منڈی میں کم و بیش ڈیڑھ سو اقسام کی کھجوریں ملتی ہیں۔ ان میں العنبر سب سے زیادہ مہنگی ہے۔ ماضی میں کھجور اقتصادِ مدینہ میں ریڑھ کی ہڈی گنی جاتی۔ اہل مدینہ اس کے بیج، تنے اور ڈالیاں تک استعمال میں لاتے۔ پتوں سے کئی گھریلو اشیا مثلاً چٹائیاں، دستی پنکھے، چھوٹے ڈبے، چھابے اور چنگیریں وغیرہ تیار ہوتی۔

کھجور کے تنے اور پتوں سے ایسی اشیا ابتداً غلام بنایا کرتے تھے۔ اب افرادی قوت باہر سے منگوائی جاتی ہے۔ حضرت سلمان فارسیؓ جو پہلے یہود کے غلام رہ چکے تھے، ہاتھ کے پنکھے بنانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ نبی کریم ﷺ اور اہل بیت کے لیے کھجور کے پنکھے بناتے اور اپنے ہاتھوں سے آقائے دو عالم سرور عالم ﷺ کو مسجد نبوی میں پنکھا جھلا کرتے۔

اس پھل کے طبی اوصاف و فوائد قابل ذکر ہیں۔ طبیب مشرق، مولانا حافظ حکیم عبداللہؒ جہانیاں والے اس پھل پر مستقل کتابچے لکھ چکے۔ اس پھل میں رزاقِ حقیقی نے تغذیہ (Nutrition) کی بھرپور خصوصیات رکھی ہیں۔ چناں چہ یہ اعلیٰ درجے کی غذائی خوبیوں کا حامل پھل ہے۔

شجرِ کھجور کی تکریم کا لحاظ کرتے ہوئے سعودی حکمرانوں نے اپنے قومی جھنڈے پر بھی اس نخل حسین کا نقش جمایا۔ اس پھل کے فوائد بیان کرتے دل نہیں بھرتا۔ یہ جزو غذا بن جائے تو انسانی بدن کی حرارت عزیزی کے استحکام سے تمام جسمانی قوتیں نشوونما پاتی ہیں۔ اس طرح ہر عضو اپنے قدرتی افعال کی انجام دہی بخوبی کرتا اور عوارج سے محفوظ رہتا ہے۔

ایک حالیہ تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ عجوہ سرطان (کینسر) میں شافی ہے۔ یہ کھجور کھانے والوں کے جسمانی اعضا میں سوجن پیدا ہونے کا امکان نہیں رہتا۔ کھجور میں پانی برائے نام ہوتا ہے۔ سوکھ جانے پر بھی اس کے وزن اور خصوصیات میں خاص فرق نہیں پڑتا۔ تاہم خشک کھجور میں وٹامن سی کچھ کم ہوتا ہے۔ پانچ

سات کھجوریں کھانے سے بیس حرارے حاصل ہوتے ہیں۔ اس میں نشاستہ، ریشہ دار اجزا، پوٹاشیم، کیلشیم اور فولاد کے ساتھ دیگر معدنی اور حیاتین بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ انسانی جسم کی نشوونما اور قوت مدافعت بڑھانے میں جادو اثر ثابت ہوئے ہیں۔

تازہ کھجور میں پھلوں کی شکر اور گلوکوز ملتے ہیں۔ ان سے بدن کی صرف شدہ توانائی فوری بحال ہوتی ہے۔ اسی باعث وقت افطار کھجور قدیم زمانے سے کھائی جا رہی ہے۔ کھجور قبض کشا ہے۔ شامل خوراک ہو کر آنتوں میں جمع ہو جانے والے فضلات کو زیادہ دیر تک ٹھہرنے نہیں دیتی۔ اگر قبض رفع نہ ہو تو سرطان کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ اس کے نامیاتی اجزا مختلف جسمانی حصوں کو نقصان دہ جراثیموں سے بچاتے ہیں۔ اندر ہی اندر خون رسنے سے روکتے ہیں۔ یہی تکلیف بڑھ کر خونی بواسیر کی شکل بھی اختیار کر سکتی ہے۔

کھجور وٹامن اے کا بھرپور خزانہ ہے۔ یہ بدن میں عمل تکسید کو روکتی ہے۔ جلد کے نیچے واقع حصوں میں چھپے مادے کو موزوں و مناسب رکھنے میں کھجور کا کردار طبیبوں کو مطمئن رکھتا ہے۔ یہ نظر کی کمزوری کو قریب نہیں آنے دیتی۔ منہ، گلے اور پھیپھڑوں کے سرطان سے بھی محفوظ رکھتی ہے۔ بدن میں عفونت اور گلنے سڑنے کا عمل ختم کرنے میں کھجور کسی نعمت سے کم نہیں۔ خون صالح اور سرخ خلیات کی افزائش اس جنتی میوہ کا ایک اور فائدہ ہے۔

اس میں موجود فولاد کمی خون کا ازالہ کرتا ہے۔ اسی سے خون کے ذروں تک آکسیجن کا سفر بہ سہولت ہونے لگتا ہے۔ یہ انتشار خون اور دل کی دھڑکن کو معتدل رکھتی ہے۔ کھجور میں موجود پوٹاشیم خلیات بدن اور مفید رطوبتوں کے لیے قدرت کا عطیہ ہے۔ یہی عنصر بدن میں پیدا ہو کر دورہ دل روکنے کے لیے ڈھال بن جاتا ہے۔ کھجور کھانے سے حیاتین بی اور کے انجماد خون روک دیتے ہیں۔ یہ خاصیت خطہ عرب کی آب و ہوا میں پلنے والی کھجوروں میں سب سے زیادہ پائی جاتی ہیں۔

کھجور نشوونما کے دوران مختلف مراحل سے گزرتی ہے۔ ابتدا میں اس کا رنگ زرد ہوتا ہے۔ اسے "خلل" کہتے ہیں۔ چند دن بعد ہی پھل ہلکا سیاہ رنگ ہو جاتا ہے۔ یہ "مناصف" کہلاتا ہے۔ چند ہفتے بعد کھجور کا دانہ مکمل طور پر پک کر سیاہ ہو جاتا ہے۔ تب یہ "تمر" کہلاتی ہے۔ تمام حالتوں میں کھجور کا ذائقہ مختلف ہوتا ہے۔ ◆◆◆

قرآن پاک کی باتیں

☆ تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے، کیا تمھارے اندر کوئی ایسا ہے جو اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے گا؟ دیکھو تم خود اس سے گھن کھاتے ہو۔ (الحجرات)

☆ آپس میں ایک دوسرے پر طعن نہ کرو اور نہ ایک دوسرے کو بُرے القاب سے یاد کرو۔ (الحجرات)

☆ مومن تو آپس میں بھائی بھائی ہیں، اپنے دو بھائیوں میں صلح کرا دیا کرو اور خدا سے ڈرتے رہا کرو تاکہ تم پر رحمت کی جائے۔ (الحجرات)

☆ اللہ ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتے ہیں اور فخر جتاتے ہیں، جو خود بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بخل پر اکساتے ہیں۔ (الحدید)

(اشرف سکندر، اوکاڑہ)

کھیل کھلاڑی

دنیائے فٹ بال کا مسلمان ہیرو

مسعود اوزل

ترک نژاد جرمن کھلاڑی جس نے اپنے شاندار کھیل ہی نہیں انسان دوستی کی بدولت بھی لاکھوں غیر مسلموں کے دل جیت لیے

ہادی علی

محمد اوزل نے ترکی کے ایک چھوٹے سے گاؤں، ہیروبلو میں جنم لیا۔ اس کا باپ معمولی کسان تھا۔ جب محمد اوزل نوجوان ہوا، تو وہ بھی مقامی جاگیردار کی زمین پر کام کرنے لگا۔ مگر وہ اپنی کسمپرسی اور غربت کی زندگی سے خوش نہ تھا۔

ایک دن تعلیم یافتہ دوست کی زبانی اسے معلوم ہوا کہ جرمن حکومت کو کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی ضرورت ہے۔ محمد اوزل نے بھی بہ توسط دوست جرمن سفارت خانے کو درخواست دے ڈالی۔ یہ ۱۹۶۹ء کی بات ہے۔

اس زمانے میں بعد از دوسری جنگ عظیم جرمنی تعمیر و ترقی کے مراحل طے کر رہا تھا۔ ملک میں افرادی قوت کی کمی تھی، اس لیے جرمن حکومت نے خصوصاً ترکی سے ہزارہا مزدور و کارکن بلوا لیے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ماضی میں ترکی جرمن حکومتوں کا حلیف رہا تھا۔

محمد اوزل کی درخواست ویزا منظور ہوئی اور یوں وہ ۱۹۷۱ء میں جرمنی آ پہنچا۔ اسے دھاتیں بنانے والے

ایک کارخانے میں ملازمت ملی۔ وہ محنتی اور دیانت دار تھا۔ اسلامی تعلیمات سے قربت رکھتا اور باقاعدگی سے نماز پڑھتا تھا۔ مذہب سے شغف ہی نے اسے بے داغ کردار کا مالک بنایا۔

محنت اور جدوجہد رنگ لائی اور محمد اوزل کے حالات بدلنے لگے۔ رقم جمع کر کے اس نے قریبی شہر گلسن کرشن (Gelsenkirchen) میں ایک فلیٹ خرید لیا۔ تب تک وہ جرمن شہری بھی بن چکا تھا۔

جب محمد اوزل جرمنی پہنچا، تو اس کے اکلوتے بیٹے، مصطفیٰ کی عمر صرف دو سال تھی۔ اس نے بیٹے کو تعلیم دلائی اور یوں اسے جرمن معاشرے میں باعزت مقام پانے میں مدد دی۔ مگر ابھی اللہ تعالیٰ نے پاک طینت اور متقی محمد اوزل کو مزید نعمتوں سے نوازنا تھا۔

جب مصطفیٰ اوزل نوجوان ہوا، تو اس نے گھر کے قریب ہی ترکش ریستوران کھول لیا۔ ریستوران چل پڑا اور یوں وہ بہت جلد اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ اسی لیے باپ نے جلد ہی بیٹے کی شادی بھی کرا دی۔ اس کی دلہن گلزار مقامی ترک خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔

۱۵/اکتوبر ۱۹۸۸ء کی شب رب کائنات نے ترک نوجوان جوڑے کو ایک بیٹے سے نوازا جس کا نام مسعود رکھا گیا۔ تب کسی کو خبر نہ تھی کہ یہ بچہ آگے چل کر دنیائے فٹ بال میں ستارہ بن کے چمکے گا۔

مسعود اوزل کی خوش قسمتی یہ تھی کہ دادا اور والد، دونوں فٹ بال کھیل کے عاشق تھے۔ انھوں نے تہیہ کر لیا کہ وہ مسعود کو عمدہ فٹ بالر بنائیں گے۔ چناں چہ وہ صرف سات برس کا تھا کہ باپ اور دادا، دونوں اسے فٹ بال کھیلنا سکھانے لگے۔

بچپن ہی سے مسعود ذہین، چست و چالاک اور اسمارٹ لڑکا تھا۔ چونکہ فٹ بال دو خصوصیات' ذہانت اور چستی مانگتا ہے لہٰذا مسعود اس کھیل سے بہت جلد ہم آہنگ ہو گیا۔ اسے شطرنج کا کھیل بھی پسند تھا، مگر فٹ بال ہی اس کا پہلا عشق ٹھہرا۔

مصطفیٰ کی آمدن زیادہ نہ تھی، مگر وہ چہیتے بیٹے کی ہر خواہش پوری کرتا۔ اسی لیے مسعود کی پرورش نازونعم سے ہوئی۔ تاہم لاڈ پیار نے اس کا دماغ خراب نہیں کیا اور وہ منکسر المزاج نوجوان بن کر پروان چڑھا۔

مسعود نے اپنے خوبصورت کھیل سے جلد ہی مقامی ٹیموں پر اپنی دہشت بٹھا دی۔ وہ دبلا پتلا تھا لیکن ۲۵ میٹر دور تک کک مار کر گیند پہنچا دیتا۔ بھاگنے کی رفتار بھی ہم عمر کھلاڑیوں سے زیادہ تھی۔ چناں چہ جلد ہی شہر کے بہترین کلب، شیفران نے اس کی خدمات حاصل کر لیں۔ یہ مسعود کی ترقی و کامرانی کے سفر کا پہلا زینہ تھا۔

جرمنی اور کئی یورپی ممالک میں فٹ بال کلبوں کو معیاری کھیل کے حساب سے تقسیم کیا جاتا ہے۔ چناں چہ جوں جوں مسعود کا کھیل بہتر ہوا، اس کی صلاحیتیں نکھری سنوریں، وہ ایک سے اگلے معیاری کلب میں منتقل ہوتا رہا۔

مسعود مڈفیلڈر ہے یعنی وہ دوران کھیل وسط میدان میں کھڑا ہوتا ہے۔ یہ کھلاڑی مخالف پر حملے کرنے کے علاوہ دفاع بھی کرتا ہے۔ اسی لیے مڈفیلڈر کے کاندھوں میں خاصی بھاری ذمے داری ہوتی ہے۔ بعض مڈفیلڈر بڑھ چڑھ کر حریف پر دھاوا بولتے ہیں۔ مسعود اوزل بھی ایسا ہی کھلاڑی ہے۔ اور اسی خصوصیت نے اسے ممتاز بھی بنا دیا۔

اوزل ان برازیلی بچوں کے ساتھ جن کا وہ علاج کرا رہا ہے

بہترین کھیل نے مسعود کو جرمنی بھر میں مشہور کر دیا۔ حتیٰ کہ ہر قومی فٹ بال کلب یہ خواہش کرنے لگا کہ مسعود اس کی ٹیم میں شامل ہو جائے۔ یوں ایک معمولی ترک مزدور کا پوتا لاکھوں جرمنوں کا پسندیدہ کھلاڑی بن گیا۔ سچ ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے کہ وہ کسی کو عزت دیں یا ذلت!

جنوری ۲۰۰۸ء میں مسعود ممتاز جرمن فٹ بال کلب، وردر برمن (Werder Bremen) کی ٹیم کا حصہ بن گیا۔ وہاں اس کی سالانہ فیس ۱۵ لاکھ یورو (تیرہ کروڑ روپے سے زائد) مقرر ہوئی۔ یہ اچھی خاصی رقم تھی۔ یوں اسے موقع ملا کہ وہ روزمرہ اخراجات سے بے نیاز ہو کے اپنے کھیل پر توجہ دے سکے۔

مسعود اگست ۲۰۱۰ء تک وردر برمن کا حصہ رہا۔ اسی دوران مسعود اوزل نے کلب کی جانب سے ۱۰۸ میچ کھیلے اور ۱۲ گول کیے۔ فٹ بال سے عدم واقفیت رکھنے والے تعجب کرتے ہوئے کہیں گے: "ارے اتنے کم گول؟"

دراصل ایک فٹ بال میچ میں اس کھلاڑی کی بھی بہت اہمیت ہوتی ہے جس کے پاس پر گول ہو۔ چناں چہ وردر برمن کی طرف سے کھیلتے ہوئے مسعود کے "۵۵ پاسوں" پر گول بنائے گئے۔ یہ حقیقت بتاتی ہے کہ مسعود نے بیشتر میچوں میں عمدہ کھیل پیش کیا اور عام و خاص سے داد پائی۔

فروری ۲۰۰۹ء میں مسعود کے تاج میں ایک اور کلغی لگی جب اسے جرمن قومی ٹیم میں شامل کر لیا گیا۔ اسی سال ماہ ستمبر میں اس نے جنوبی افریقن ٹیم کے خلاف کھیلتے ہوئے اپنا پہلا بین الاقوامی گول کیا۔

جون ۲۰۱۰ء میں جب فٹ بال عالمی کپ کا سے

آیا، تو بہترین کارکردگی کی بنا پر مسعود اوزل کو جرمن قومی ٹیم میں شامل کر لیا گیا۔ یہ عالمی کپ جنوبی افریقا میں منعقد ہوا۔ ارجنٹائن کے خلاف پہلے میچ میں اس کے ایک خوبصورت پاس پر گول بنا۔ دیگر میچوں میں اس نے عمدہ کھیل دکھایا۔ چناں چہ عالمی کپ ختم ہوا تو مسعود ان دس بہترین کھلاڑیوں میں شامل تھا جنھیں "سنہرے بال" (Golden Ball) کے اعزاز سے نوازا گیا۔

اب تو چوٹی کے فٹ بال کلب...... ریئل میڈرڈ، بارسلونا اور آرسنیل سعی کرنے لگے کہ یہ ابھرتا ترک نژاد جرمن فٹ بالر ان کی چھتری تلے آ جائے۔ آخر کار مسعود نے ریئل میڈرڈ میں جانے کا فیصلہ کیا جو دنیا کا بہترین فٹ بال کلب سمجھا جاتا ہے۔ یہ اگست ۲۰۱۰ء کی بات ہے۔

ریئل میڈرڈ میں بھی مسعود کی کامیابیوں کا سفر جاری رہا۔ اس کے عمدہ کھیل کا راز "ڈربنگ" میں پوشیدہ ہے۔ مسعود اتنے خوبصورت انداز میں کھلاڑیوں کو جھکائی دیتا ہے کہ وہ اس سے گیند چھین نہیں پاتے۔ دوسرے مسعود اگلے کھلاڑیوں کو نہایت عمدہ پاس دیتا ہے۔ یوں گول کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ دنیا بھر کے مشہور کھلاڑی مثلاً وائن رونی، میسی، رونالڈو وغیرہ انہی خوبیوں کی بنا پر اس کے رطب اللسان رہتے ہیں۔

ستمبر ۲۰۱۳ء میں مسعود مشہور برطانوی فٹ بال کلب، آرسنیل سے وابستہ ہو گیا۔ اب وہ ستمبر ۲۰۱۸ء تک اسی کلب میں کھیلے گا۔ پانچ سال کے دوران اسے ۴۲.۲ کروڑ پونڈ (تقریباً سات ارب روپے) بطور معاوضہ ملیں گے۔

۲۰۱۴ء کا سال مسعود کے لیے دو بڑی خوشیاں لایا۔ اول آرسنیل دنیا کا قدیم ترین فٹ بال ٹورنامنٹ، ایف اے کپ جیتنے میں کامیاب رہا۔ دوم وہ اس جرمن قومی ٹیم میں شامل تھا جس نے عالمی کپ جیتا۔ مسعود نے اپنے عمدہ کھیل کا تسلسل برقرار رکھا اور اپنی ٹیموں کو عروج تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا۔

کھلاڑی کی ذاتی خصوصیات

دین دار ترک گھرانے سے تعلق رکھنے کے باعث مسعود اسلامی تعلیمات سے آگاہ ہے۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر میچ سے قبل نماز ادا کرتا اور قرآنی دعا پڑھتا ہے۔ وہ اپنی کامیابیوں کو اللہ تعالیٰ ہی کا کرم قرار دیتا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کی مدد فرمائیں کامیابی و کامرانی اسی کے قدم چومتی ہے۔

ایک اچھے مسلمان کی طرح وہ رحم دل، سخی اور درد مند انسان ہے۔ ان خوبیوں کا مظاہرہ حال ہی میں عالمی کپ کے دوران دیکھنے کو ملا۔ ورلڈ کپ سے قبل مسعود اوزل نے اعلان کیا تھا کہ وہ برازیل میں سرطان (کینسر) کے مریض گیارہ غریب بچوں کا علاج کرائے گا۔ بعدازاں جب جرمنی فاتح بنا، تو اس نے یہ تعداد دگنی کر دی۔

گویا اب موت کی سرحد پر کھڑے ۲۲ غریب برازیلی بچوں کو نئی زندگی مل جائے گی۔ مسعود اوزل ویسے بھی جسمانی بھلائی کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا اور انسانیت کی تعمیر و ترقی میں اپنا حصہ ڈالتا ہے۔ مشہور امریکی مدبر، ابراہام لنکن نے ایک بار کہا تھا:

"آپ جو بھی ہیں، نیک اور اچھا بننے کی کوشش کیجیے۔"

◆◆◆

سندھی کہانی

جو لبوں تک نہ آ سکی

دل کی بات

ایک جنازے میں جمع انسانوں کا فسانہ، ان کے لبوں کی باتیں اندرونی سوچوں سے بالکل مختلف تھیں

غلام مصطفیٰ سولنگی

لوگوں کے سر جھکے ہوئے اور چہروں پر مصنوعی دکھ کے ماسک چڑھے تھے۔ یہ سب ایک جنازے کے پیچھے قبرستان جا رہے تھے۔ ایک نے کہا "مرحوم بہت ہی اچھا آدمی تھا، ہنس مکھ اور لوگوں سے پیار کرنے والا......"

دوسرا بولا "بھائی! زندگی پر تو کوئی اعتبار ہی نہیں...... ابھی عمر ہی کیا تھی اس بیچارے کی...؟"

تیسرے نے منہ کھولا "بس! موت بتا کر نہیں آتی...... اس کے جانے کا وقت ابھی نہیں آیا تھا۔"

چوتھے نے کہا "عزرائیل کے آنے کا کوئی وقت مقرر نہیں بھائی! ابھی کل کی بات ہے۔ وہ میری دکان پر سودا سلف لینے آیا تھا اور آج بیچارہ چل بسا۔"

پانچواں بولنے لگا "موت تو برحق ہے۔ مگر یہ ہمیں یاد ہی نہیں رہتی...... اگر یاد ہو تو پھر یہ نفرتیں جنم نہ لے سکیں۔"

چھیمے نے چشمہ صاف کرتے ہوئے بات کی "زندگی کا کیا اعتبار بھائی! ایک دن ہمیں بھی جانا ہے۔ کون یہاں ہمیشہ رہے گا؟"

مرحوم کے بارے میں سب لوگوں کی اجتماعی رائے تھی "بہت اچھا اور نیک آدمی تھا۔"

لیکن اسی وقت مسٹر "م" سوچ رہا تھا "آج تو میری چھٹی ہی ضائع ہوگئی۔۔۔۔۔ نہ ہی لیتا تو اچھا تھا، غلطی ہوگئی، آج اگر یہ نہ مرتا تو میں دس گیارہ بجے اٹھتا۔۔۔۔۔ ٹھیکیدار کے ہاں بھی جانا تھا۔ ان سے اپنا حصہ وصول کرنا تھا۔ بیڑا غرق کر دیا اس بدبخت نے۔۔۔۔۔ نالائق کہیں کا!"

مسٹر "ک" نے سوچا "ایک ہفتے بعد عید ہونے والی ہے۔ آج اس لیے دفتر سے چھٹی لی تھی کہ بچوں کو عید کی خریداری کراؤں گا۔ لیکن صبح صبح اس کی موت کی منحوس خبر سن کر سارا موڈ تباہ ہوگیا۔۔۔۔۔ اس مردود کو آج ہی مرنا تھا۔ بیوی کا رشتہ دار تھا، اس لیے آنا لازمی ٹھہرا۔ ورنہ میں تو اسے کفن بھی نہ ڈالتا۔"

مسٹر "ش" سوچ رہا تھا "آج شناختی کارڈ جمع کرانا تھا۔ سارا دن تو یہیں ضائع ہو جائے گا۔ دفتر بند ہونے سے پہلے شاید فارغ نہ ہو سکوں۔ مشکل سے جا کر معاملہ طے ہوا تھا پیسوں پر۔ جائز کام کے لیے بھی رشوت دینا پڑتی ہے۔ بس کوئی پوچھنے والا جو نہیں۔ میں نہ ڈاکو ہوں اور نہ ہی کوئی بدمعاش۔۔۔۔۔ سارا کھیل پیسوں کا ہے۔ آج تو بس کام ہونے ہی والا تھا لیکن یہ کمینہ چل بسا۔ سارا کام چوپٹ ہوگیا۔"

مسٹر "ن" نے سوچا "آج "ط" کو میرے پاس آنا تھا۔ دوستوں سے کہلوا کر اسے تیس ہزار پر راضی کیا تھا۔ کیا کریں، اگر یہاں نہ آتے تو لوگ شرمندہ کرتے۔"

مسٹر "ج" بھی اپنی سوچوں میں گم تھا "آج تو ٹی وی بھی ہونا تھا۔ لیکن اب ممکن ہی نہیں۔ میرے پسندیدہ ڈرامے کی آج آخری قسط چلنی تھی۔ ایک زبردست فلم بھی آنا تھی۔ سارا مزہ غارت ہوگیا۔ اب تو سارا دن قبرستان میں ضائع ہوگا۔"

مسٹر "ق" سوچنے لگا "کل بھی دکان بند تھی اور آج تو بند ہی رہے گی۔ دو تین ہزار روپے کا تو نقصان ہو ہی جائے گا۔ اس بدبخت کے لیے عزرائیل کو بھی آج ہی آنا تھا۔"

مسٹر "غ" سوچتا ہے "آج کلب میں سول جج کے اعزاز میں منعقدہ الوداعی پارٹی میں جانا تھا۔ سارا پروگرام تباہ ہوگیا۔ کل مرتا تو کون سا آسمان پھٹ جاتا۔ اب تو تین دن برباد ہوگئے۔"

مسٹر "خ" نے سوچا "اب تو بیٹے کی شادی کی تاریخ بھی بدلنی پڑے گی اور تو کوئی چارہ ہی نہیں۔۔۔۔۔ اب تو دو ڈھائی ماہ تک اس معاملے پر سوچنا ہی فضول ہے۔۔۔۔۔ بیٹے کی شادی کے بعد مرتا تو کیا ہی اچھا ہوتا۔۔۔۔۔ سارے انتظامات دھرے کے دھرے رہ گئے۔"

سب لوگوں کے سر جھکے ہوئے تھے۔ سوچوں میں ڈاکٹر لوگوں کی اجتماعی رائے یہ تھی: "مرحوم بڑا ذلیل اور نابنجار شخص تھا۔"

ملکہ اور جنیوا

اس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام
پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدتِ آدم
تفریق، ملل حکمتِ افرنگ کا مقصود
اسلام کا مقصود فقط ملتِ آدم
مکے نے دیا خاک جنیوا کو یہ پیغام
جمعیت اقوام کہ جمعیت آدم!
(علامہ محمد اقبال)

♦♦♦

ضمیر کی کسک کا مارا بول اٹھا

میں بزدل نہیں ہوں

خود فراموشی کی ردا اتار کر ہوش میں آنے والے ایک باشعور کی سبق آموز کہانی

احسان بن مجید

زندگی سائیکل کی رفتار سے کہیں زیادہ تیز ہے۔۔۔۔۔ اس نے یہ سوچ کر گاڑی کے بریک پیڈل سے پاؤں ہٹایا اور کار کی رفتار بڑھا دی۔ آئینے میں اسے سائیکل سوار گاڑی کی ٹھوکر سے قلابازیاں کھاتا نظر آیا، اس کی پیشانی سے بہتا خون اور تباہ شدہ سائیکل بھی۔

ہر چند وہ رک کر زخمی کو اٹھانا چاہتا تھا۔ اسے اسپتال پہنچانے کی ذمے داری اپنے سر لیتا، اسے نیا سائیکل بھی لے کر دے دیتا لیکن اس نے سوچا، گاڑی سے باہر آتے ہی وہ مشتعل ہجوم کے حصار میں ہوگا۔ وہ لوگ یہ نہیں دیکھیں گے گاڑی کا کتنا نقصان ہوا ہے بلکہ مغلظات بکتے ہوئے اس پر مکوں، گھونسوں اور لاتوں کی بارش کر دیں گے۔ اس تواضع کے بعد پھر گاڑی کی خبر لیں گے۔ زخمی وہیں پڑا رہے گا اور وہ سب ایک ایک کر کے کھسک جائیں گے۔

وہ ایک کاروباری تھا اور کاروبار میں مندے کا قائل لیکن غفلت اس کے نزدیک گھٹیا عمل تھا جس کا وہ خود بھی مرتکب ہوا نہ مندے کو ہونے دیا۔ پچھلے چند ماہ سے مانی گارمنٹس کی مصنوعات مندے کا شکار تھیں جس کی شکایت اس کا

مارکیٹنگ منیجر کر چکا تھا۔ اچانک مصروفیات کے باعث وہ اس طرف متوجہ نہ ہو سکا لیکن بھولا بھی نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آج سہ پہر تین بجے اس نے اپنے مارکیٹنگ منیجر اور ڈیزائنر کو میٹنگ پر بلا لیا۔ بحث مندے کی وجوہ پر ہونی تھی۔ لیکن آدھ گھنٹے کی مسافت طے کرنے کے بعد یہ حادثہ پیش آ گیا جس نے اس کی سوچیں منتشر کر ڈالیں۔ ایک بار گھر واپس لوٹ جانے کا خیال آیا لیکن وہ یہ سوچ کر گاڑی چلاتا رہا کہ ان دو آدمیوں کا کیا قصور ہے جنھیں دفتر بلا رکھا ہے۔

تیار شدہ ملبوسات کا یہ دھندہ اس نے برسوں پہلے شروع کیا تھا۔ اس عرصے میں ہر قسم کے رنگ دیکھے...... کئی بار وہ منہ کے بل گرنے کو آیا لیکن ہر بار لگا جیسے ایک کندھا اسے سہارا دے کھڑا کر دیتا۔ کون اس کا مہربان تھا، یہ تو اسے بہت بعد میں معلوم ہوا لیکن جب بھید کھلا تو اس کی چھاتی خوشی سے پھٹنے کو آ گئی۔

سچ تو یہ ہے کہ اس نے کچھ کہے سنے بغیر اپنے محسن کا ماتھا چوم لیا اور کہا تھا تو وہ تم ہو...... یہ سن کر کانچ کھنک گئے۔ ایک چہرہ سرشار ہوا جب کہ دوسرے پر حیرتیں اتر آئیں۔ پتا نہیں کون سے جذبے کا زور تھا کہ جھکی نظروں سے زمین بھی گیلی ہو گئی۔ اس پر ممنونیت طاری ہوئی تو مقابل چہرے کی پلکوں پر آئے موتیوں کو دونوں انگوٹھوں میں جذب کر ڈالا۔

گاڑی کھڑی کرنے کے بعد اس نے بایاں مڈگارڈ دیکھا' جو ٹیڑھا ہو چکا تھا۔ بونٹ پر بھی واضح خراشیں تھیں۔ آنے والے لمحوں کی تیاری کے لیے تانے بانے بنتا ذہن مصروف ہوا تو وہ چند منٹ کے واسطے کہیں نہیں تھا۔ جب حواس میں لوٹا تو مارکیٹنگ منیجر اور ڈیزائنر اس کے پاس کھڑے تھے۔

''کیا ہوا سر، خیریت تو ہے؟'' دونوں کے چہروں پہ استعجاب تھا۔

''کچھ نہیں، گاڑی کیموفلاج کرا دو اور آدھے گھنٹے بعد آؤ۔'' یہ کہہ کر وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اپنے دفتر میں جا بیٹھا۔ تھوڑے سے وقت میں جہاں اس نے اور بہت کچھ سوچا، یہ خیال بھی آیا، کیوں نہ جواد اور عزیز سے مشورہ کر لیا جائے۔ اس کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے لیکن اندر بیٹھا انسان پھر بھی مطمئن نہیں تھا۔ اس کی انگلی تھامے جانے کہاں کہاں لیے بھٹکتا پھرا۔ آدھا گھنٹا آخر تیس منٹ ہی کا تو ہوتا ہے، بیت گیا اور پردے کے عقب سے جواد نمودار ہوا۔

''آؤ جواد بیٹھو!'' اس نے سامنے پڑی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

''عزیز نہیں آیا؟'' اس نے چھوٹتے ہی جواد سے پوچھ لیا؟

''تم نے میرے منہ کی بات چھین لی یا مجھے کہتے ہوئے دیر ہوئی۔ دراصل چند منٹ پہلے عزیز کے گھر سے فون آیا تھا۔ اس کا بھائی ایک حادثے میں شدید زخمی ہو گیا ہے۔ کوئی کار والا تھا جو اسے ٹکر مار کر بھاگ نکلا...... گھٹیا کہیں کا، کمینہ، بزدل انسان، مرد ہوتا تو رکتا، چور ہو گا کوئی، گاڑی چوری کر کے بھاگا ہوا، چور کہاں رکتا ہے' کوئی زخمی ہو یا مر جائے۔''

''تم اس کار والے کی جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟''

دونوں میں آپ جناب کا تکلف اس لیے نہیں تھا کہ بچپن میں ٹاٹ پر ساتھ بیٹھ کر پڑھے تھے۔ کئی بار لڑے بھی تھے لیکن دوستی پر آنچ نہیں آئی۔ جب کبھی دونوں میں بچپنا لوٹ آتا تو سنجیدگی دور کھڑی مسکرانے لگتی۔

اس نے اچانک سوال کیا تو جواد کی بات درمیان میں یا کہیں آس پاس رک گئی، بولا ''میں کیا کرتا، فوراً گاڑی روکتا، دوڑ کر زخمی کے پاس پہنچتا، اسے اٹھا، کپڑے جھاڑتا، معذرت کرتا اور اپنی گاڑی میں اسپتال مرہم پٹی کرانے لے جاتا۔ حسب توفیق اس کی مالی اعانت بھی کرتا اور جب تک وہ مکمل صحت یاب نہ ہوتا' بلاناغہ عیادت کرنے جاتا......''

''میں تمھیں عرصے سے جانتا ہوں جواد کہ تم کتنے بہادر اور سخی ہو۔ تقریر تو تم اس وقت بھی خوب کرتے تھے جب ضرورت نہ ہوتی!'' اس نے رستے سے جواد کی بات اُچک لی۔

''اور اگر تم میری جگہ ہوتے تو یقیناً گاڑی بھگا لے جاتے، زخمی کو لہولہان تڑپتے ہوئے چھوڑ کر، کیونکہ تم آج بھی اتنے ہی بزدل ہو جتنے نوجوانی میں تھے۔ تم مشتعل ہجوم سے ڈرتے ہو۔'' یہ کہہ کر جواد کو جیسے سانپ سونگھ گیا یا شاید کسی ایسے خیال نے اسے خاموش کر دیا جو ایک لمحہ پہلے اس کے ذہن میں اترا تھا۔ اس کی نظریں یکدم منیجنگ ڈائریکٹر کی کرسی پر بیٹھے شخص کے چہرے سے ہٹ کر اپنی جھولی میں گر گئیں۔

''بولو جواد، میں تمھاری بات سن رہا ہوں!'' اس نے قدرے جھکا سر اٹھا کر جواد کی آنکھوں میں جھانکا۔

''نہیں سر، میں پتا نہیں کیوں بڑبولا سا ہو گیا۔ مجھے افسوس ہے، میں نے وہ بھی کہہ دیا جو نہیں کہنا چاہیے تھا۔'' اس کے چہرے پر تاسف کی پرچھائیاں واضح تھیں۔

دفتر میں یوں خاموشی چھا گئی جیسے وہاں کوئی ذی روح نہ ہو۔ دونوں اپنی اپنی سوچ میں گم بیٹھے تھے۔ جواد پچھتاوے کی دلدل سے خود کو نکالنے کی سعی میں تھا۔ اس کے احسانات یکے بعد دیگرے جواد کے ذہن کی راہداری سے گزر رہے تھے۔ اس نے اپنے کل کو آج کے سامنے کھڑا کیا تو اسے خود سے گھن سی آنے لگی۔ وہ منظر اس کی آنکھوں میں گھوم گیا جب دونوں اچانک ملے تھے۔ اس نے پوچھ لیا ''آج کل کیا کر رہے ہو؟''

''فارغ ہوں اور سڑکیں ناپتا ہوں۔'' اس نے یہی جواب دیا تھا۔

''میرے پاس کیوں نہیں آئے؟'' اس کے لہجے میں دوستی والا رعب تھا۔

''تمھارے پاس؟ بس یونہی یار!'' اس سے کوئی بات نہ بن پائی۔

''صبح میرے پاس آؤ اور دیکھو ڈھنگ کا لباس پہن کر آنا۔'' دونوں نے اپنی راہ لی لیکن اس نے دیکھا کہ جواد کے چہرے پر اطمینان کی تازگی آ گئی۔ پھر آج تک اس کا ہاتھ جواد کے کندھوں پہ تھا۔

''گھٹیا کہیں کا، کمینہ، بزدل انسان، مرد ہوتا تو رکتا، چور ہو گا کوئی، گاڑی چوری کر کے بھاگا ہوا، چور کہاں رکتا ہے' کوئی زخمی ہو یا مر جائے۔'' اس کے دماغ میں جواد کی باتوں کی بازگشت گونج رہی تھی۔

''نہیں، میں ایسا ہرگز نہیں!'' وہ زیرلب بڑبڑایا۔ اس کے چہرے پر پچھتاوے کی لہر آ کر گزر گئی۔ وہ اپنے اندر شگاف پڑتا دکھائی دیا۔

''جواد!''

''جی سر!''

''چلو عزیز کے بھائی کو دیکھ آئیں!''

''سر کل چلیں گے؟''

''نہیں ابھی! دیکھو جواد میں گھٹیا نہیں ہوں، بزدل بھی نہیں اور نہ چور!''

''سر! آپ کیوں کہہ رہے ہیں؟''

''اس لیے کہ مجھے یقین ہے، عزیز کا بھائی میری ہی گاڑی سے ٹکرایا تھا۔''

◆◆◆

شرم وحیا کی بے نظیر نشانی

زندہ باد استانی جی!

شرافت کی پتلی کو یہ بھی گوارا نہ تھا کہ کوئی غیر مرد اس کی آواز سن لے

بشیر احمد بھٹی

خاکہ

ہمارے ایک استاد تھے، ماسٹر شریف! صوم صلوٰۃ کے پابند تھے۔ سر پہ ہمیشہ جناح ٹوپی پہنے رکھتے۔ چہرے پہ چیچک کے ہلکے ہلکے داغ تھے۔ بارِیش تھے۔ مذہبی امور پر کافی دسترس رکھتے۔ میں اس وقت پرائمری اسکول میں چوتھی جماعت کا طالب علم تھا۔ اردو میرا پسندیدہ مضمون تھا۔ حساب بھی پسند کرتا۔ بیس تک پہاڑے ازبر تھے۔ جماعت میں میں قابل طالب علم سمجھا جاتا' اس لیے مانیٹر بنا دیا گیا۔

ماسٹر شریف شادی شدہ تھے مگر ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ کرائے کے مکان میں رہتے۔ کچھ عرصے بعد انھوں نے پہلے والا مکان چھوڑا اور مسجد کے قریب ایک گلی میں تھوڑے کرائے پہ نیا گھر لے لیا۔ سفید پوش آدمی اور مذہبی امور کی پابندی کے قائل تھے۔ ان کی شرافت اور رواداری کی سبھی محلے دار تعریف کرتے۔ گلی میں چلتے ہوئے انھوں نے کبھی خواتین پر نگاہ نہیں ڈالی تھی۔ چہرہ ایک طرف کیا اور گزر گئے۔

تاہم ان کی گزر بسر بڑی مشکل سے ہو رہی تھی۔ میرے ماموں جو پرائمری اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے، انھوں نے ماسٹر شریف سے کہا کہ وہ کوئی کاروبار کر لیں، کپڑے یا سبزی کا۔ یا پھر پرچون کی دکان کھول لیں۔ ماسٹر شریف نے جواب دیا "میں ساری زندگی اس قسم کا کاروبار نہیں کروں گا۔"

ماموں نے وجہ پوچھی تو ماسٹر بولے "دکان داری کے وقت خواتین سودا لینے چلی آتی ہیں۔ سودا دیتے اور رقم لیتے ہوئے ان پر نگاہ پڑتی ہے جسے میں جائز نہیں سمجھتا۔" ماسٹر شریف کی بات سن کر میرے ماموں مسکرا کر رہ گئے۔

چھوٹے بچوں سے لے کر پانچویں جماعت کے طالب علموں تک کسی کو یہ اجازت نہ تھی کہ وہ ماسٹر جی کے مکان میں داخل ہوں۔ ماسٹر جی اگر کوئی چیز گھر بھیجتے تو بچے سے کہہ دیتے "دروازہ کھٹکھٹانا۔ استانی جی دروازے پر آئیں گی۔ یہ سامان انھیں دے دینا۔" استانی جی سامان لینے کا طریقہ جانتی تھیں۔ بچے جاتے اور باہر ہی سے سامان دے کر لوٹ آتے۔ مجھے تجسس سا تھا کہ سامان لینے کے طریقے سے کیا مراد ہے؟ عام سا طریقہ تو میں بھی جانتا تھا کہ دروازے پر گئے۔ کنڈی کھڑکائی، استانی جی باہر آئیں' دروازہ کھولا' سامان لیا اور پھر دروازہ بند۔"

میں دل میں سوچتا کہ یہی طریقہ ہو گا، کوئی نئی بات تو ہونے سے رہی۔ دل میں تمنا ضرور تھی کہ کبھی مجھے ماسٹر جی سامان دے کر گھر بھیجیں۔ میں بھی تو دیکھوں، بچوں کے ہاتھ سے سامان لینے کا استانی جی نے کیا طریقہ اپنا رکھا ہے۔

ایک روز میری مراد بر آئی۔ جماعت میں بیٹھے بچوں پر ماسٹر جی نے طائرانہ سی نظر ڈالی۔ پھر مجھے اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ میں اٹھا اور ماسٹر جی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ قریب ہی ایک رومال میں کچھ سامان بندھا پڑا تھا۔ ماسٹر شریف نے سامان مجھے دیا اور کہا کہ یہ گھر دے آؤ۔ سامان دینے کا طریقہ کار کیا تھا؟ وہ انھوں نے مجھے نہیں بتایا۔ حالانکہ وہ نئے بچے کو پہلی بار گھر بھیجتے تو اسے ساری بات سمجھا دیتے تھے۔

میں نے سامان لیا اور خوشی خوشی نکل پڑا۔ جماعت میں تمام دن رہتے اور مولا بخش (ڈنڈے) کے خوف سے عموماً فضا گھٹن آلود ہو جاتی تھی۔ اس لیے ہر لڑکے کی دلی خواہش ہوتی کہ وہ کسی کام کے بہانے نکل کر کچھ وقت باہر لگا آئے تاکہ طبیعت کا بوجھل پن اور مولا بخش کا خوف دور ہو سکے۔ ماسٹر جی کا گھر اسکول سے کافی دور تھا۔ میں بھی اس خیال سے مسرور تھا کہ چلو کچھ وقت تو ملا تازہ ہوا کھانے کو!

جب جماعت سے نکل آیا تو ماسٹر جی کو خیال آیا "سامان استانی جی کو دینے کا طریقہ تو میں لڑکے کو بتایا نہیں' یہ نہ ہو وہ پریشان ہو جائے۔" چناںچہ چند منٹ بعد انھوں نے ایک اور لڑکے کو میرے پیچھے روانہ کر دیا کہ جاؤ اور سامان جس طریقے سے دیتے ہو، اسی طریقے سے دے آؤ۔ وہ نیا ہے، پریشان ہو گا۔ لڑکا بھی جماعت سے نکلا اور میرے تعاقب میں روانہ ہو لیا۔

مجھے نکلے چند منٹ ہو چکے تھے، اس لیے لڑکا مجھے راستے میں نہ پکڑ سکا۔ میں مسجد والی گلی میں پہنچ گیا جہاں ماسٹر جی کا مکان تھا۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ چند لمحوں تک خاموشی رہی۔ میں نے دوبارہ کھٹکھٹایا۔ چند ثانیے بعد قدموں کی چاپ سنائی دی۔ کوئی دروازے کی جانب آ رہا تھا۔ آنے والا یا والی دروازے کے قریب رک گئی۔ قدموں کی چاپ ختم ہوئی۔

دروازے کے قریب ہی سیمنٹ کا تھڑا بنا ہوا تھا۔ وہاں پانی کا نل لگا تھا۔ کسی نے پانی کا نلکا ڈنڈے سے تین بار بجایا۔ ذرا دیر خاموشی رہی۔ ایک بار پھر نلکے پر ڈنڈے برسائے گئے۔ پھر وہی خاموشی۔ آنے والی بھی خاموش تھی، کوئی نسوانی آواز نہیں آئی۔

آخر میں نے آواز دی "استانی جی! ماسٹر جی نے سامان بھیجا ہے لے لیں۔"

اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔ ایک بار پھر ڈنڈے سے نلکے پر تین بار چوٹ ماری گئی۔ میری سمجھ مسئلہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ میں خاصا پریشان ہو گیا۔ ابھی کسی نتیجے پر نہیں

پہنچا تھا کہ کیا کروں۔ عین اسی لمحے وہ لڑکا گلی کے سرے پر نمودار ہوا جسے ماسٹر جی نے بھیجا تھا۔ اس کا نام رشید تھا۔

وہ تیزی سے قریب آیا اور سامان کا رومال میرے ہاتھ سے جھپٹ کر بولا ”بیوقوف آدمی، استانی جی دروازے پر آ چکیں۔ یہ سامان انھوں نے ہمارے ہاتھ سے نہیں لینا نہ ہی وہ کچھ بولیں گی۔ نہ دروازہ کھولیں گی۔ وہ پردے کی پابند ہیں۔ ان کی آواز کسی غیر محرم کے کان میں پڑے، یہ انھیں پسند نہیں۔“

اس کی آواز بالکل دبی دبی سی تھی۔ رشید نے پھر جلدی سے سامان دروازے کے قریب رکھا اور میرا بازو پکڑ کر بولا ”چل، یہاں سے اپنی شکل گم کر۔ ہم یہاں سے جب ہٹ جائیں گے تو استانی جی دروازے کی جھری سے گلی میں جھانکیں گی۔ جب وہ دیکھ لیں گی کہ گلی میں کوئی نہیں تو وہ تھوڑا سا دروازہ کھول سامان والا رومال اٹھا لیں گی۔ وہ گلی سے سامان لیتے وقت برقع میں ہوتی ہیں کہ شاید کوئی گزرتے ہوئے انھیں نہ دیکھ لے اور بے پردگی ہو جائے۔“

وہ پھر مجھے گھسیٹتے ہوئے دوسری گلی میں لے گیا۔ وہاں پہنچ کے میں نے رشید سے اپنا بازو چھڑایا اور اپنی جگہ ٹھہر گیا۔ رشید بولا ”رک نہ، چلتا رہ۔“

میں نے اسے کہا ”عقل کے اندھے، کچھ دیر رک کر یہ تو دیکھ لیں کہ آیا استانی جی نے سامان اٹھایا ہے یا نہیں۔ یہ نہ ہو کہ سامان کوئی اور اٹھا لے اور سامان کی گمشدگی پر ماسٹر جی کے ہاتھوں ہماری پٹائی ہو جائے۔“

رشید بولا ”ایسا کبھی نہیں ہوا۔ استانی جی دروازے پر آ چکی ہیں۔ اب وہ دروازے کی جھری سے گلی میں دیکھیں گی۔ ہم دونوں کو نہ پا کر سامان اٹھا لیں گی۔ تو نے تسلی کرنی ہے تو چند لمحے ہم ٹھہر جاتے ہیں۔“ ہم کچھ دیر وہاں کھڑے رہے۔ پھر میں نے گلی کی نکڑ پہ جا کے دروازے کی سمت دیکھا۔ سامان غائب تھا۔ میں استانی جی کی پردہ داری اور پرہیزگاری سے بہت متاثر ہوا۔ سبحان اللہ، کیا خاتون تھیں۔ وہ اپنی آواز کسی غیر مرد کی سماعت تک پہنچانے کی بھی روادار نہ تھیں۔

بعدازاں ماسٹر جی کی زبانی معلوم ہوا کہ جو خواتین اپنی آواز اور چہرہ چھپا کے رکھتی ہیں، بہشت میں داخل ہوں گی۔ میں سوچنے لگا ”جو عورتیں گانے بجانے کا کام کرتیں اور اپنی سریلی آواز سے لوگوں کا جی لبھاتی ہیں، مرنے کے بعد ان کا کیا حشر ہوگا؟“

کچھ عرصے بعد ماسٹر جی چھٹیاں گزارنے گاؤں جانے لگے۔ استانی جی ان کے ہمراہ تھیں۔ انھوں نے سادہ سا برقع اوڑھ رکھا تھا۔ ہاتھ اور پاؤں بھی نظر نہ آئے۔ ”کیا بات ہے، استانی جی کی!“ یہ دیکھ کر بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔

◆◆◆

اِمامت

تُو نے پُوچھی ہے امامت کی حقیقت مجھ سے
حق تجھے میری طرح صاحبِ اسرار کرے
ہے وہی تیرے زمانے کا امامِ برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے
موت کے آئینے میں تجھ کو دکھا کر رُخِ دوست
زندگی تیرے لیے اور بھی دشوار کرے
دے کے احساسِ زیاں تیرا لہو گرما دے
فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے
فتنۂ مِلّتِ بیضا ہے امامت اُس کی
جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے!

(علامہ محمد اقبال)

سدابہار

اللہ کے عطا کردہ انمول تحفے

اولاد کی خاطر جان بھی قربان کر دینے والی ہستی کے حضور جذبات بھرا نذرانۂ عقیدت

محمد قاسم رضا

اللہ تعالیٰ نے دنیا کا نظام چلانے کے لیے جو سب سے خاص اور حیران کن چیز بنائی، وہ ماں کا پیار ہے۔ یہ نہ ہوتا تو شاید دنیا آگے ہی نہیں بڑھتی اور ہمارا وجود لاکھوں سال پہلے ختم ہو جاتا۔ ذرا سوچیے، ماں کے دل میں اولاد کے لیے پیار نہ ہوتا تو وہ کیوں بچوں کی پرورش کرتی؟ ماں ہی ہے جو سردی، گرمی، پت جھڑ، دھوپ، چھاؤں میں اولاد کو سینے سے لگائے رکھتی ہے۔ ماں جتنا پیار دنیا

میں کوئی کسی کو نہیں دے سکتا۔

جب بچہ جنم لے، تو ماں اپنے سارے دکھ درد بھول جاتی ہے۔ اپنی ساری تکلیفیں بھلا کر مسکراتی ہے۔ پھر ایک بچے کو بڑا کرنا بھی ماں ہی کا دل گردہ ہے۔ بچے کچھ بھی کرلیں، وہ ناگواری محسوس نہیں کرتی۔ بچہ کتنا دودھ ٹپکا دے تو ماں کے علاوہ سب ناک بسوریں گے لیکن وہ اس کی بلائیں لیتی منہ صاف کرے گی۔ بچہ بیٹھنا شروع کرے تو ماں محلے میں مٹھائی تقسیم کرتی ہے۔ اٹھنے لگے تو مٹھائی بانٹتی ہے۔ کھڑا ہوا تو شرینی کھلائی جاتی ہے۔ چل پڑے تو ماں کی خوشی کا ٹھکانہ ہی نہیں۔

دراصل ایک ماں کی دنیا بچوں کے گرد ہی گھومتی ہے۔ دنیا میں چاہے کوئی کتنی ہی ترقی کرے، جتنا بھی بڑا افسر بن بیٹھے، ملک کا سربراہ بن جائے، ماں کے لیے وہ بچہ ہی ہے، اس کا چاند اور لعل!

ایک لمحے کے لیے سوچیے، اگر ماں بچوں کو سردی سے نہ بچاتی، خود گرمی میں رہ کر ہماری حفاظت نہ کرتی، بھوکا رہ کے ہمیں نہ کھلاتی، راتوں کو جاگ کر ہمیں نہ سلاتی، تو نسل انسانی شاید آگے نہیں بڑھ پاتی۔ ماں ہی ہے جس کی بدولت ہم چلنے، پھرنے، باتیں کرنے اور کچھ سننے کے قابل ہوتے ہیں۔ جب بچہ دنیا میں آ جائے تو ماں اپنے لیے کچھ نہیں مانگتی، وہ تو بس اولاد کی بھلائی کے واسطے دعا مانگتی ہے۔

اسے اپنی فکر نہیں ہوتی، بچے ہی اس کا مستقبل ہوتے ہیں۔ کچھ کھانا ہو تو اولاد کی فکر، کچھ خریدنا ہو تو اولاد کی چنتا، کہیں جانا ہے تو یہی سوچتی ہے، بچے کہاں جائیں گے، کیسے رہیں گے؟ کئی بار ایسا ہوا کہ گھر میں کوئی پھل آیا تو میری ماں نے اپنا حصہ بھی مجھے کھلا دیا۔ اپنا جوڑا لینے گئیں اور میرے لیے کپڑے لے آئیں۔ ماں بچوں سے اتنا پیار کرتی ہے کہ اسے احاطہ تحریر میں نہیں لایا جا سکتا۔

کہیں جا رہے ہوں تو ماں نے بس یہی کہنا ہے "اللہ کی سپرد بیٹا۔" دیر ہو گئی تو دروازہ کھٹکھٹانے سے پہلے ہی کھل جائے گا اور ماں کے پریشان چہرے پہ اچانک خوشی کی لہر دوڑ جائے گی۔ جب میں اپنی بھابی کو بچوں کے ناز نخرے اٹھاتے دیکھوں تو یہی سوچتا ہوں، میری ماں نے بھی کئی پریشانیاں جھیل کر میری پرورش کی ہے۔ جب میری آپی کی بیٹی ہوئی، تو وہ بہت خوش تھیں۔ میں اسے دیکھنے گیا تو سوچ میں پڑ گیا۔ کہنے لگیں "کیا سوچ رہے ہو؟"

میں نے کہا" آپ بڑی مشکلوں سے اس ننھی گڑیا کو مکمل انسان بنائیں گی۔ کتنی ہی دیر آپ اسے اٹھائے اٹھائے پھریں گی۔"

"کیوں نہیں بھئی، یہ میرا حصہ، میرے جگر کا ٹکڑا ہے۔ اب ساری زندگی اس کی خوشی ہی میں میری خوشی ہو گی۔" وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔

ہمارے ہاں ایک کام کرنے والی آتی ہے۔ اسے کوئی بھی چیز دیتے تو وہ نہ کھاتی، بس جاتے ہوئے گھر لے جاتی۔ مجھے یہ عادت بہت بری لگی۔ کئی دن میں یہ عمل دیکھتا رہا۔ آخر نہ رہ سکا اور وجہ پوچھ ہی لی۔ کہنے لگی "میں بھلا کیسے وہ چیز کھاؤں جو میرے بچوں نے ابھی تک نہ کھائی؟"

میں نے کہا "جب بھوک لگی ہو تب تو کچھ کھا لیا کرو۔"

کہنے لگی "جب بچے بھوکے ہوں تو اپنی بھوک یاد ہی نہیں رہتی۔"

یہ بے نظیر سچ ہے کہ بچے کو یاد نہ ہو، ماں اس کا خیال ضرور یاد رکھتی ہے۔ ماں تو پیار کا سمندر ہے، ایک بے غرض اور لازوال محبت کرنے والی ہستی!

ایک دن میں نے بیوی سے پوچھا "کیا تم ماں سے زیادہ مجھے محبت کر سکتی ہو؟"

وہ ناراض ہو گئی۔ کہنے لگی" آپ کو مجھ سے زیادہ محبت کوئی دے ہی نہیں سکتا۔"

میں نے کہا"شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔ لیکن ایک بات ہے، ماں آج تک مجھ سے ناراض نہیں ہوئی۔ چاہے میں بڑی سے بڑی غلطی کر دوں۔ ماں کہتی ہے، بیٹا میری طبیعت ٹھیک ہو جائے گی، تم رات کو میری دوائی لینے بازار نہ جاؤ، میرے پاس ہی رہو۔ اور تم کہتی ہو، مجھے نہیں پتا، چاہے رات کے بارہ بجے ہوں، مجھے پیزا کھانا ہے۔ جہاں سے مرضی لے کر آئیں۔ ماں کہتی ہے، اپنا جوڑا لے آتے، میرا کیوں لائے؟ بیوی کہتی ہے، مجھے نہیں پتا، میں نے دو جوڑے لینے ہیں، جیسے مرضی لاؤ۔"

کئی مائیں سورج نکلنے سے پہلے اٹھ جاتی ہیں تاکہ بچے وقت پہ اسکول پہنچ سکیں۔ اسکول جاتے ہوئے بچے ہزار نخرے کرتے ہیں مگر ماں سب کچھ برداشت کرتی ہے۔ یہ دیکھیے کہ فائدہ کس کا ہے اور پریشان کون ہوتا ہے؟ بعض دفعہ ننھے بچے چھوٹی سی بات پر ناراض ہو کے ماں کی محبت کا ناجائز فائدہ اٹھاتے خالی پیٹ اسکول چلے جاتے ہیں۔ تب ماں کھانا اٹھائے پیچھے پیچھے جاتی ہے کہ بچہ بھوکا نہ رہے۔ بچوں کے کھانے کی فکر کرنے والی ماں نے خود، پتا نہیں کھانا کھایا ہوتا ہے یا نہیں۔

ابا جی بتاتے ہیں، ایک دفعہ وہ اپنی ماں جی سے ناراض ہو کر کھانا کھائے بغیر اسکول چلے گئے۔ اسکول تقریباً تین میل دور تھا اور وہ پیدل ہی جاتے۔ سورج سر پہ تھا کہ ماں جی کھانا اٹھائے اسکول پہنچ گئیں۔ کہنے لگیں "پتر گرمیوں کے دن لمبے ہوتے ہیں۔ میرے لعل، تم سارا دن کیسے گزارو گے؟ چل کھا لے کھانا۔"

یہ واقعہ سن کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ذرا تصور کیجیے، گرمی عروج پہ ہے اور ایک ماں کڑی دوپہر میں ناراض بیٹے کے لیے تین میل کا سفر پیدل کھانا لیے جا رہی ہے۔ یہ ماں ہی ہے جو اولاد کی فکر میں سب کچھ بھول جاتی ہے۔ اس کی محبت کے آگے گرمی سردی کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ انسان تو انسان، دنیا کی ہر مخلوق میں مادرانہ پیار کا یہ انمول جذبہ پایا جاتا ہے۔ خدا کے دیے ہوئے اسی بیش قیمت جذبے سے شاید دنیا آگے بڑھ رہی ہے۔

میں چھوٹا سا تھا جب ہمارے گھر میں لگے درخت پہ ایک بلبل نے بسیرا بنا لیا۔ یہ بڑا خوبصورت پرندہ ہے۔ اس کے انڈے سے ایک چھوٹا سا بچہ نکلا۔ جب وہ کھانا ڈھونڈنے جاتی تو موقع پا کر میں بچے سے کھیلنے لگتا۔ آہستہ آہستہ وہ بڑا ہو گیا اور پھر میرے ہاتھ نہ آتا۔ ایک دن میں دوڑتے ہوئے اسے پکڑ رہا تھا کہ ہاتھ زور سے لگا اور وہ لنگڑا ہو گیا۔ پھر کچھ دن بعد مر گیا۔ اب اس کی ماں کی بے چینی دیکھی نہ جاتی۔ وہ ادھر ادھر اداس گھومتی رہتی۔ ایسے لگتا جیسے بہت پریشان ہے۔ اس کی پریشانی مجھے بھی اداس کر دیتی کیونکہ میں ہی اس کا قصوروار تھا۔ پھر کچھ دن بعد بلبل بھی نظر نہ آئی۔ شاید وہ اپنے بچے کا دکھ برداشت نہ کر سکی اور جہان فانی سے رخصت ہو گئی۔

انہی دنوں آپی نے ایک بلی پال رکھی تھی۔ اس کے بچے ہوئے، تو وہ ہر وقت بڑی خوشی سے انھیں ساتھ لیے پھرتی۔ بلی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے بچوں کو دشمن سے بچانے کے لیے سات گھر بدلتی ہے۔ اور حیرت انگیز امر یہ ہے کہ ان بچوں کا دشمن ان کا باپ ہی ہوتا ہے۔ بلی اگر چھے یا چار بچوں کو جنم دے اور بلے کو ان کی جائے پیدائش کا علم ہو جائے، تو وہ بچوں میں سے نر چن چن کر کھا جاتا ہے۔ اسی لیے بلی انھیں بچانے کے لیے جگہیں بدلتی رہتی ہے۔

ایک شام بلی کا بچہ گم ہو گیا۔ ہم سب نے اسے بہت ڈھونڈا لیکن نہ ملا۔ بلی ساری رات روتی کرلاتی رہی۔ وہ

اتنی دردناک آواز سے بولتی کہ ہم بھی ساری رات نہ سو سکے۔ بلی کی پریشانی نے آپی کو بھی متوحش کر دیا۔ صبح ہوئی تو بلی کا بچہ بڑے مزے سے چولھے کے نیچے سے انگڑائی لیتا برآمد ہوا۔ بلی سب کچھ بھول بھال بچے سے لپٹ گئی۔ وہ اسے زبان سے چاٹتی، اس کے گرد گھومتی، شاید پوچھتی ہو "کیوں تم نے اپنی ماں کو پریشان کیا؟"

کچھ دن پہلے میں صبح صبح گھر سے نکلنے لگا تو کتے کا ایک چھوٹا سا بچہ دروازے سے لگا ٹھٹھر رہا تھا۔ شاید وہ کہیں پانی میں گر گیا اس لیے بھیگا ہوا بھی تھا۔ میں نے اسے سینکنے کے لیے جاتی آگ کے قریب بیٹھا دیا۔ دھوپ نکلنے تک وہ اچھا بھلا ہو گیا۔ اب اس نے شاید یہیں رہنے کا ارادہ کر لیا اور میرے آگے پیچھے پھرنے لگا۔ بچے اس نئے مہمان کی آمد سے بہت خوش ہوئے۔ لیکن کچھ دیر بعد میں نے دیکھا کہ گلی میں بے تاب ماں اسے ڈھونڈ رہی ہے۔

گلی میں آٹھ دس چکر لگا وہ ہمارے دروازے پہ کھڑی ہو گئی جیسے اسے پتا ہو اس کا گم شدہ بچہ یہیں ہے۔ بچے کو بھی ماں کی آمد کا پتا چل گیا، وہ دوڑتا ہوا دروازے پر آ پہنچا۔ ماں نے دیکھا تو یقین کیجیے، اتنی شدت سے اسے پیار کرنے لگی کہ یہ منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔

ککڑو کی مثال سب سے بڑھ کر ہے۔ جب تک اس کا بچہ جوان نہیں ہوتا وہ اسے گود میں بٹھائے پھرتی ہے۔ مرغی بڑا شریف پرندہ ہے۔ لیکن اگر کوئی بچوں کے پاس جانے کی کوشش کرے تو وہ اس کی آنکھیں نوچ لیتی ہے۔ جیسے مرغی اپنے بچوں کو پروں میں سمیٹ کر بیٹھتی ہے، اس طرح دنیا کی ہر ماں اپنے بچوں پہ پیار نچھاور کیے بیٹھی ہے۔

◆◆◆

اُمید

مقابلہ تو زمانے کا خُوب کرتا ہوں
اگرچہ میں نہ سپاہی ہوں نے امیرِ جُنود
مجھے خبر نہیں یہ شاعری ہے یا کچھ اور
عطا ہوا ہے مجھے ذکر و فکر و جذب و سرود
جبینِ بندۂ حق میں نمود ہے جس کی
اُسی جلال سے لبریز ہے ضمیرِ وجود
یہ کافری تو نہیں، کافری سے کم بھی نہیں
کہ مردِ حق ہو گرفتارِ حاضر و موجود
غمیں نہ ہو کہ بہت دور ہیں ابھی باقی
نئے ستاروں سے خالی نہیں سپہرِ کبود

غزل

دریا میں موتی، اے موجِ بے باک
ساحل کی سوغات! خار و خس و خاک
میرے شرر میں بجلی کے جوہر
لیکن نیستاں تیرا ہے نم ناک
تیرا زمانہ، تاثیر تیری
ناداں! نہیں یہ تاثیرِ افلاک
ایسا جنوں بھی دیکھا ہے میں نے
جس نے سیے ہیں تقدیر کے چاک
کامل وہی ہے رندی کے فن میں
مستی ہے جس کی بے منتِ تاک
رکھتا ہے اب تک مے خانۂ شرق
وہ مے کہ جس سے روشن ہو ادراک
اہلِ نظر ہیں یورپ سے نومید
ان اُمتوں کے باطن نہیں پاک

(علامہ اقبال)

جنگ کی تباہ کاریوں سے آشنا

ولندیزی خاتون طالبان کی تلاش میں

ہالینڈ کی ایک ٹیچر غریب بچوں کو پڑھانے پاکستان آئی مگر اُسے جن شدت پسندوں کا انتظار تھا وہ کہیں نہ مل سکے

رزاق سربازی

کرسٹین البرٹز کا بچپن ۱۹۵۰ء کی دہائی میں جنگ عظیم دوم کی تباہ کاریاں دیکھتے گزرا۔ وہ لاطینی و یونانی زبان کے ولندیزی پروفیسر ہانس البرٹز اور ان کی جرمن اہلیہ کی بیٹی ہیں۔ جب کمسن تھیں اور باہر بچوں کے ساتھ کھیلنے جاتیں، تو والدین انھیں سختی سے منع کرتے۔ اس زمانے میں دراصل یورپی باشندوں پر ہٹلر کے نازی ازم بھوت کا خوف سوار تھا۔ خاص طور پر وہ جرمن باشندوں سے دور بھاگتے تھے۔

جنگ کی تباہ کاریوں سے آشنائی کے باعث کرسٹین کے روزمرہ کاموں میں باقاعدگی سے خبرنامہ دیکھنا شامل ہے۔ کئی سال سے وہ بدلتے عالمی حالات و

واقعات خبرنامے میں دیکھتی آرہی ہیں۔ حادثہ نائن الیون کے بعد خبروں میں دو نام بکثرت آنے والے ان کے ذہن میں بیٹھ گئے: طالبان اور پاکستان۔ یہ نام ان کے ذہن میں بچپن کی یادیں تازہ کر دیتے جو جنگ عظیم کی تباہ کاریوں سے جڑی ہیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ کاش ہٹلر کو دیکھ لیتیں جس نے دنیا کو تہس نہس کر ڈالا تھا۔ اب ان کے پاس موقع تھا، وہ اس ملک (پاکستان) کی سیر کر سکتی تھیں جہاں طالبان بھی بستے ہیں۔

چناں چہ انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ پاکستان جا کر کچھ عرصہ غریب بچوں کو پڑھائیں گی، اس طرح ایک پنتھ دو کاج والا معاملہ ہو جاتا۔ توقع کے مطابق ولندیزی (ڈچ) دفتر خارجہ نے ان کے فیصلے کو پسند نہیں کیا۔ جب کہ اہل خانہ، دوست واحباب انھیں پاگل تصور کرنے لگے۔

ایک عمر رسیدہ رشتہ دار نے کہا "تم وہاں جا رہی ہو جہاں سانپ، مگرمچھ اور طالبان پائے جاتے ہیں۔ ہم تمہارے حق میں دعا کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔"

ہالینڈ کے شہر ہیگ میں واقع پاکستانی سفارت خانے کا ویزا آفیسر ان کی شخصیت سے متاثر ہوا۔ تاہم وہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ کیوں پاکستان جا رہی ہے؟

"غریب طلبہ کو انگریزی پڑھانے۔" کرسٹین البرٹز نے جواب دیا۔

سفارتی اہلکار نے ضروری دستاویزات اور نصابی کتابیں چیک کر کے کچھ رسمی سوال کیے۔ پھر انھیں فوری ویزا جاری کر دیا گیا۔

انھیں پاکستانی ویزا افسر کا مہذب وشائستہ رویہ بہت پسند آیا۔ مگر اس امر نے کرسٹین کو پریشان کر دیا کہ سیاسی لحاظ سے اتنے اہم ملک میں جانے کے لیے ویزا لینے والی وہ واحد ولندیزی درخواست گزار تھیں۔

پاکستان کا ناک نقشہ ان کے ذہن میں انڈونیشیا جیسا تھا جو ہالینڈ کی سابق نوآبادی رہا ہے۔ ولندیزیوں کے ساتھ نوآبادیاتی رشتے کی عمدہ کہانی مشہور انڈونیشیائی ادیب، پرمودیہ آنند طور نے اپنے مقبول ناولوں میں بیان کی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ پاکستان نے ہالینڈ نہیں برطانوی نوآبادیاتی دنیا کی راکھ سے جنم لیا۔

کرسٹین پاکستانی دوستوں کے ساتھ

☆☆

کرسٹین البرٹز ۱۷ جولائی ۲۰۱۳ء کو علی الصباح سحری کے وقت کراچی پہنچیں۔ بتاتی ہیں "میں جیسے ہی سوٹ کیس سنبھالے، ہوائی اڈے کے کار پارکنگ کی طرف نکلی، ایک آواز میرے کانوں میں پڑی: اللہ اکبر...... مجھے پاکستانی میزبان نے بتایا کہ یہ فجر کی اذان ہے۔ جلد ہی میکڈونلڈ ریستوران کی عمارت دیکھ کر مجھے مشرق میں مغرب کی نشانیاں نظر آنے لگیں۔"

انہوں نے اپنے پروفیسر والد کو پاکستان سے پہلی ای میل میں لکھا:

"یہ ایک ٹوٹی پھوٹی دنیا ہے۔ بہت کم اشیا ٹھیک اور تسلی بخش حالت میں ملتی ہیں۔ ٹریفک بے ہنگم ہے۔ ہر ایک عجلت میں اور غصے سے بھرا ہوا گاڑی چلاتا ہے۔ شدید گرمی ہے اور شہر میں بجلی نہ ہونے کی شکایت عام۔ مقامی ٹرانسپورٹ کی گاڑیاں خستہ حال لیکن سواریوں سے کھچا کھچ بھری ہوتی ہیں۔

"ڈبل کیبن گاڑیاں رعب داب قسم کی شخصیت کا تاثر پیدا کرنے کے لیے پسند کی جاتی ہیں۔ ان کے پچھلے حصے میں مسلح افراد بندوقیں لیے بیٹھتے ہیں۔ ان گاڑیوں کا رنگ بھی بیشتر اوقات میں نے سیاہ پایا۔ شیشے بھی کالے تاکہ اندر بیٹھے لوگوں کا راہ گیروں پر رعب پڑ سکے۔ شہر کا اولڈ ٹاؤن (پرانا علاقہ) مجھے بیلجیم جیسا لگا جہاں برطانوی دور کی عمارات کسی بھی علاقے سے زیادہ ہیں۔ مگر عدم توجہ ان تاریخی عمارات کو قابل رحم بنا چکی۔"

کرسٹین البرٹز موسم گرما کی چھٹیاں پاکستان کے غریب طلباء کو انگریزی پڑھا کر گزارنا چاہتی تھیں۔ ان کے دورہ پاکستان کا یہی بنیادی مقصد تھا۔ میرپور خاص ان کا دوسرا پڑاؤ بنا جہاں انھیں غریب بچوں کو تعلیم دینی تھی۔

"میرپور خاص چھوٹا سا کاروباری مرکز ہے۔ بظاہر شہر ہے لیکن جابجا دیہاتی مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ گندگی کے ڈھیر عام ہیں۔ گدھا گاڑیاں بار سے لدی ہیں۔ ساتھ میں اسٹیکروں سے بھری نئی ماڈل کی کار بھی چل رہی ہوتی۔ شہر ایسا ہے جیسے کوئی قصبہ، جہاں عام لوگ، رکشے والے، دکاندار کم از کم چہرے سے ایک دوسرے کو ضرور پہچانتے ہیں۔ شہر کے اطراف رہنے والے بیشتر لوگ شدید غربت کا شکار ہیں۔" کرسٹین نے اپنے مشاہدات میں لکھا۔

"لیکن طالبان کہاں ہیں؟ ..... پاکستان آتے ہوئے طالبان کا جو عکس میرے ذہن میں تھا، وہ ان علاقوں میں کہیں نظر نہیں آیا۔ میں گھومتی پھرتی رہی اور دوست راہنمائی کے لیے ساتھ ہوتے۔ طالبان اگر ہیں بھی تو وہ عام لوگ نہیں! گو عام پاکستانیوں کے روز مرہ کاموں میں مذہب کا عمل دخل بہت ہے۔ اس نے ان کی زندگی کو بھی متاثر کیا ہے۔"

کرسٹین کہتی ہیں "اٹھارہویں، انیسویں صدی میں جب مغربی ممالک سے عیسائی مبلغ ایشیا و افریقا جاتے تو کم خوراکی کا شکار مقامی لوگوں کو خوراک دیتے۔ بدلے میں مقامیوں کو دینی تبلیغوں میں لکھی باتیں سننا پڑتیں۔ پاکستانی دیہی علاقوں میں بھی یہ مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اخلاقیات کی ذمے داریاں پاکستان میں مذہب انجام دے رہا ہے جو معاشرے کا ستون بن چکا۔"

پاکستان میں کلچر کی تعریف البتہ کرسٹین کے لیے معمہ بنی رہی۔ وہ اکثر ساتھیوں سے گفتگو کرتے ہوئے کچھ سوچتی اور انگلی سے کنپٹی پر چابی کی علامت بنا کر اس سے تالا کھولنے کا مظاہرہ کرتیں۔ وہ کہتی ہیں "پاکستانیوں کو اپنا ذہن کھولنا ہوگا۔ مجھے ہر جگہ پاکستانی کلچر کے احترام کا درس دیا گیا۔ لیکن کیا یہ کسی کی پرائیویسی ختم کرنے اور اپنی محفوظ رکھنے کا بہانہ نہیں؟ مجھے پاکستان آ کر یہاں کے کلچر کا احترام کرنا پڑا۔ جو لوگ مراکش و دیگر ملکوں سے ہالینڈ آتے ہیں، وہاں بھی ان کے کلچر کا احترام ہمیں ہی کرنا پڑتا ہے۔ لیکن میرے کلچر کا احترام کون کرے گا؟ کیا احترام کا حق صرف ایک گروہ کو حاصل ہے؟"

◆◆◆

سچا واقعہ

زندگی تہ و بالا کردینے والا

تیسرا لمحہ

پاک وطن سے سچی محبت کرنے والے ایک پاکستانی کا ماجرائے غم، وہ دیارِ غیر میں بھی چین سے نہ رہ سکا

انوار ایوب راجہ

مجھے برطانیہ میں رہتے ہوئے چالیس سال بیت چکے۔ اس دوران میری زندگی میں دو لمحے بڑے المناک رہے۔ پہلا لمحہ وہ تھا جب دس سال بعد پہلی بار پاکستان گیا۔ پی آئی اے سے سفر کیا۔ اس وقت برٹش ایئرویز اور دیگر مغربی کمپنیوں کے طیارے پاکستان جاتے تھے، مگر مجھے اپنے اپنے پر ناز تھا۔ قومی جھنڈا اور پاکستانی ہوائی کمپنی میرا فخر ہوا کرتا۔ مجھے یاد ہے، جب پہلی بار اسلام آباد ہوائی اڈے پر اترا تو میری آنکھوں میں آنسو تھے، جیسے رہائی کے بعد قیدی کی آنکھوں میں آجاتے ہیں۔

پاک سرزمین دیکھ کر میری پیاس میں شدت بڑھ گئی۔ پیاسے کو پانی ملے تو وہ اسی کی طرف بے صبری سے لپکتا ہے۔ میں بھی اپنی محبت کی پیاس بجھانے پاکستان کی مٹی چومنا چاہتا تھا۔ یہ انتہائی روحانی تجربہ تھا، میری زندگی کا وہ لمحہ جسے میں کبھی بھولنا نہیں چاہتا۔

مگر جیسے ہی میں کسٹم اور امیگریشن سے گزرا، سب کچھ بدل گیا۔ میرا تعلق ٹوٹا اور طواف ادھورا رہ گیا۔ پیاس ختم ہوگئی اور آنسو سوکھ گئے۔ تب مجھ سے پہلی بار مٹھائی (رشوت) کی مانگ ہوئی۔ کہا گیا کہ میں برطانیہ سے آیا ہوں اور کسٹم والوں کے لیے کچھ نذرانہ پیش کروں ورنہ میرے ساتھ سختی برتی جائے گی۔ میں اپنے حرم میں آیا تھا، اپنے گھر داخل ہو رہا تھا، رشوت دینے جیسے حرام فعل کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میرے انکار پر عظیم ہم وطنوں نے مجھے اس قدر رسوا کردیا کہ وہ دن نہیں بھولتا۔

میرا حب الوطنی کا سارا بخار اتر گیا۔ مجھے چاہتوں کے اپنے وطن، محبت کی سرزمین میں یوں زدوکوب کیا گیا کہ ہر لمحہ خود سے نفرت محسوس ہوئی۔ عملہ کسٹم نے میری بیوی کے کپڑے باہر نکال کر ان کی پڑتال کی۔ ہمارے ساتھ ایسا برتاؤ کیا جو کسی جیل میں داخلے پہ قیدی کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ میری زندگی میں وہ پہلا لمحہ تھا جب مجھے اپنی قومیت پر شرمندگی محسوس ہوئی۔

بہرحال وہ دن گزر گیا۔ اس کے بعد میں واپس پاکستان نہیں گیا۔ اپنی محبتوں کا وطن چھوڑا اور اپنی ضرورتوں کا نیا جہان بسا لیا۔ میں نے برطانوی شہریت اپنالی۔ بچے بھی وہیں پیدا ہوئے۔ انھیں تعلیم دلوائی۔ ایک بیٹا ڈاکٹر بنا، دوسرا وزارت داخلہ میں ملازم ہوگیا۔ تیسرے بیٹے نے کاروبار شروع کردیا۔ یوں اللہ تعالیٰ نے مجھے مالا مال کر ڈالا۔ تینوں بیٹے میری دولت اور میرا کل سرمایہ بن گئے۔

مجھے پاکستان پکارا کرتا تھا مگر آہستہ آہستہ اس کی آواز میرے کانوں سے بہت دور ہوگئی۔ وہ آواز جس سے میرے دل کی دھڑکنیں جڑی تھیں، اس سے میرا رابطہ ٹوٹ گیا۔ پچھلے تیس سال میں کئی حادثات رونما ہوئے۔ مگر میں پاکستان واپس نہ گیا۔ اس دوران میرے رشتے داروں نے میری زمینوں پر قبضے کر لیے اور رہی سہی محبت کا جنازہ نکال دیا۔ میری والدہ جب فوت ہوئیں تو بیوی پاکستان گئی۔ میں اس وقت بھی نہ جا سکا کہ شدید بیماری کی وجہ سے اسپتال داخل تھا۔ یوں میری ماں اسی مٹی کی چھاتی میں اتر گئی جسے میں اپنا کعبہ کہتا تھا۔

ماں کی وفات کے بعد پاکستان سے سب کچھ اٹھ گیا۔ میرے والد تو اسی وقت فوت ہو گئے تھے جب میں آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا۔ بیوی جب لوٹی تو بتایا "مرحومہ والدہ کی آخری خواہش تھی کہ میرے ایک پوتے کی شادی پاکستان میں کسی عزیز کے گھر ہو جائے۔"

میں نے تینوں بیٹوں کو سامنے بٹھایا اور مرحومہ والدہ کی خواہش ان کے سامنے رکھ دی۔ بڑے بیٹے

نے مرحومہ دادی کی خواہش کا احترام کیا مجھے بے انتہا خوشی ہوئی ہم سب تیار ہوئے۔ میں نے سامان باندھا۔ یوں میرے اندر پھر پاکستان بیدار ہو گیا۔ میں برمنگھم بین الاقوامی ہوائی اڈے سے جب جہاز پہ سوار ہوا تو مجھے ماضی کے سارے دکھ، غم، دشمنیاں اور ہم وطنوں کا ناروا برتاؤ بھول گیا۔ مجھے اندر سے کسی نے کہا کہ باوضو ہو جاؤ۔ میرے کانوں میں پھر پاکستان کی آواز گونجنے لگی۔ میری محبتوں کے جہان سے بلند نغمے پورے وجود میں گونجنے لگے۔

ہم اسلام آباد پہنچے اب میں پہلے جیسا جوان نہیں رہا تھا۔ سو میرا ردعمل بھی ویسا جوشیلا نہیں رہا جیسا تیس سال پہلے تھا۔ مجھ میں بہت سی تبدیلیاں آ چکی تھیں مگر پاکستان کے نظام میں کچھ نہ بدلا، سب کچھ ویسا ہی پایا، بلکہ پہلے سے بھی زیادہ بگڑ ہوا۔ آبادی میں اضافہ ہوا اور عمارتیں اونچی ہو گئیں مگر میرے عظیم ہم وطنوں کے مزاج پہلے سے بھی زیادہ پست ہو چکے تھے۔ وہی گھٹیا ذہنیت تھی اور ذلالت جس کا مجھے تیس سال پہلے سامنا کرنا پڑا۔

میں اپنے گاؤں پہنچا۔ ماں کی قبر کو چوما۔ باپ کی قبر پہ حاضری دی۔ ہم پندرہ دن رہے۔ میرے بیٹے نے ایک رشتے دار کی بیٹی سے شادی کر لی۔ ہم پھر واپس آ گئے۔ کئی صدمے اٹھانے کے باوجود تیس سال بعد گاؤں پہنچا، تو وہاں مٹی کی خوشبو بہت بھائی۔ وہ میرے خمیر کا حصہ تھی، اس لیے میرے اندر مہکتی رہی اور پھر بیدار ہو گئی۔

برطانیہ آنے کے آٹھ ماہ بعد ہماری بہو بھی آ گئی۔ مجھے لگا، میرا ٹوٹا رشتہ بحال ہو رہا ہے۔ سوچا کہ شاید تقدیر میں پھر سے نسبت بدلنی لکھی ہے۔ ہم سب بہت خوش تھے، ہم نے بہو کو بیٹیوں کی طرح گھر میں عزت اور پیار دیا۔ کچھ دن بعد بیٹے نے بتایا کہ بلقیس موبائل فون خریدنے کا تقاضا کر رہی ہے۔ میں نے بیٹے کو بتایا، وقت بدل چکا، اب پاکستان بھی ماڈرن ہو گیا ہے۔ ہو سکتا ہے، اسے سہیلیوں سے بات کرنے کے لیے فون کی ضرورت ہو۔ چناں چہ اسے موبائل فون دے دیا گیا۔

اس کے بعد اکثر ایسے ہوتا کہ بہو کا فون بجتا تو وہ یہ کہہ کر اپنے کمرے میں چلی جاتی، "میری سہیلی کا فون ہے۔" ہم نے کبھی اعتراض نہیں کیا، یہ ایسی بات بھی نہیں تھی۔ میرا بڑا بیٹا ہفتے کے پانچ دن شہر سے باہر جاتا اور جمعہ کی شام کو گھر لوٹ آتا۔ ڈیڑھ سال بعد اللہ نے بیٹے کو ننھے فرشتے کا تحفہ دیا۔ یوں خدا نے مجھے مالا مال کیا اور میں دادا بن گیا۔ ہم نے گھر میں جشن منایا۔ ہمیں سکون تھا کہ بہو اب ہمارے گھر کا نظام چلا سکتی ہے۔

ایک روز اس نے مجھے کہا "ابو! میں کام کرنا چاہتی ہوں۔ گھر میں بور ہو جاتی ہوں۔" مجھے یہ مانگ بھی جائز لگی۔ میری اپنی بیٹی ہوتی تو شاید یہی کہتی۔ لہٰذا جب پوتا آٹھ ماہ کا ہوا تو میری بہو نے انگریزی کا امتحان پاس کیا اور گھر کے قریب کپڑوں کے ایک اسٹور پہ کام کرنے لگی۔ ہمیں اس کے جدید کپڑوں پہ اعتراض تھا اور نہ ہی اس کے کام کرنے پہ بلکہ خوشی تھی کہ وہ برطانوی نظام کو سمجھ کر اس کے سماجی تانے بانے کا حصہ بن رہی ہے۔

ایک روز بیٹے نے شکایت لگائی کہ دن میں جب بھی بیوی کو فون کرے، تو وہ مصروف ہوتا ہے۔ میں نے بیٹے کو سمجھایا کہ یہ ضروری نہیں کہ جب ایک شخص فارغ ہے تو دوسرا بھی اسی طرح بیٹھا ملے۔ بہرحال مجھے تھوڑی تشویش ہوئی۔ بیگم سے کہا کہ وہ بہو سے بات کرے۔ بیگم نے تجویز دی کہ یہ بات زیادہ اچھالنی نہیں چاہیے۔ ہو سکتا ہے، بہو برا جانے اور اس کے دل میں ہمارے لیے منفی رجحان جنم لے۔

میں نے بیگم کی بات پر صاد کیا اور خاموش رہا۔ پوتا ایک سال کا ہوا تو میں نے محسوس کیا کہ اب بہو کو بچے کے ساتھ اپنے والدین سے ملنے جانا چاہیے۔ چناں چہ بیٹے سے چھٹیاں لینے کو کہا۔ انھوں نے پھر ٹکٹ بک کروا لیے۔ اسی دوران بہو کی برطانیہ میں غیر معینہ مدت تک قیام کی درخواست بھی قبول ہو گئی۔

لیکن پاکستان جانے سے ایک ہفتہ پہلے ایسا حادثہ پیش آیا کہ کایا ہی پلٹ گئی۔ وہ فون کالیں جنھیں ہم بہنوں، سہیلیوں اور رشتہ داروں کی سمجھتے تھے، ایک مرد کی نکلیں۔ اس کا شادی سے پہلے بہو سے رابطہ تھا۔ موبائل فون سے کچھ ایسی تصویریں اور پیغامات بھی ملے جنھیں پڑھنے کے بعد میرا سر شرم سے جھک گیا۔

ہماری بہو کو جب علم ہوا کہ اس کا گھر رہ جانے والا موبائل فون پکڑا گیا ہے تو سیدھے پولیس اسٹیشن چلی گئی۔ پولیس کو بیان دیا کہ اسے خاوند سے خطرہ ہے۔ پولیس بچے اور بہو کا سامان لینے گھر آئی تو ہم نے با خوشی دے دیا۔ کچھ ہفتوں بعد بہو نے طلاق کی درخواست دے دی۔ معاملہ عدالت میں گیا۔ عدالت نے بچے کے بہترین مفاد میں اسے ہم سے ملنے کی اجازت دے ڈالی۔

یوں میں ایک دم غریب ہو گیا جو دولت مجھے اللہ نے عطا کی تھی، اسے میری بہو لوٹ کر لے گئی۔ ہم عدالتوں کے چکر کاٹنے لگے۔ میرا بیٹا اور دیگر اہل خانہ اس ساری صورت حال میں کبھی دلبرداشتہ ہوتے تو میری والدہ کو کوستے کہ یہ انھی کی خواہش کا شاخسانہ تھا۔ ادھر میں ترستا کہ مجھے پوتے سے ملنے دیا جائے مگر مہینے میں صرف ایک بار اس سے ملاقات ہو پاتی۔

تربیت

زندگی کچھ اور شے ہے، علم ہے کچھ اور شے
زندگی سوزِ جگر ہے، علم ہے سوزِ دماغ
علم میں دولت بھی ہے، قدرت بھی ہے، لذت بھی ہے
ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سراغ
اہلِ دانش عام ہیں، کم یاب ہیں اہلِ نظر
کیا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا تیرا ایاغ!
شیخِ مکتب کے طریقوں سے گشادِ دل کہاں
کس طرح کبریت سے روشن ہو بجلی کا چراغ

(علامہ محمد اقبال)

ایک روز مجھے شاپنگ مال میں پوتا نظر آیا۔ ماں ایک دکان میں خریداری کر رہی تھی۔ میں نے پوتے کو پرام سے اٹھایا، گلے لگایا اور پیار کیا۔ تبھی بہو آئی، بچہ چھینا اور مجھے دھکا دیا۔ میں زمین پر گرا، ماتھا کسی آہنی چیز سے ٹکرایا اور میں زخمی ہو گیا۔ سیدھے ہاتھ کی دو انگلیاں بھی ٹوٹ گئیں۔ درد کے مارے میں بے ہوش ہو گیا۔ جب آنکھ کھلی تو اسپتال میں تھا اور پولیس میرے سامنے کھڑی تھی۔ انھوں نے مجھ سے میری بہو کے خلاف بیان لکھوایا۔ آج تین ماہ بعد میں اس کے خلاف عدالت میں گواہی دینے آیا ہوں۔

☆☆

محمد نور ولی اپنی کہانی سنا رہے تھے۔ اسی وقت دروازے پر عدالت کے ملازم نے آ کر آواز لگائی "مسٹر ولی! کیا آپ اپنی گواہی دینے کے لیے تیار ہیں؟"

انھوں نے دونوں ہاتھوں سے آنسو پونچھے، جسم کا زور اپنی چھڑی پہ ڈالا اور ملازم کے پیچھے کمرے سے باہر چلے گئے...... یہ ان کی زندگی کا تیسرا المناک لمحہ تھا۔

◆◆◆

آنکھیں کھول دینے والی دستاویز

ایک خودکش حملہ آور کی ڈائری

وہ دکھ و کرب ہوئے بے نقاب جس سے حساس انسان معاشرے میں رہتے بستے گزرتا ہے

شکور رافع

چند دنوں سے دعائے قنوت ایک جگہ اور دعائے جنازہ دو جگہ سے بھول رہا ہوں۔ (استغفراللہ) اس جمعہ زوال کے بعد کم از کم ۲۰ بار انھیں دہرانا ہے۔

☆ دودھ والے سے معذرت کرنی ہے کہ بلانے پر بھی محفل میلاد اور کھانے میں شرکت نہ کر سکا۔ ساتھ یہ بھی پوچھنا ہے کہ جشن میلاد کا دودھ کی قیمت سے کیا تعلق ہے؟ ہر بار جشن میلاد کرا کے وہ دودھ ۲ روپے کلو مہنگا کر دیتا ہے۔

☆ ''ٹریفک روٹ'' والے دن جس پولیس والے نے موٹر سائیکل معمولی سا بڑھانے پر تھپڑ دے مارا تھا، اس کا نام و پتا معلوم کر کے شیدے کونسلر کے ساتھ تھانے شکایت کرانے جانا ہے۔ اگر قانون میں اس بے عزتی کے لیے کوئی دفعہ وغیرہ ہے تو اسے لگوانے کی پوری کوشش کرنی ہے۔ (نکتے پر بعد میں کراس لگا دیا گیا)

☆ چھوٹی بہن جو کپڑے پہن رہی ہے، میرے خیال میں نامناسب ہیں۔ مجھے یہ بھی پتا چلا ہے کہ بہن نے موبائل فون چھپا کر رکھا ہوا ہے۔ اس کی خبر امی کو بھی ہے۔ ''موت کا منظر مع مرنے کے بعد کیا ہو گا'' والی کتاب اور ''موبائل فون رحمت نہیں زحمت ہے'' والا مضمون فوٹو کاپی کرا کے ابا، اماں اور بہن میں خاموشی سے تقسیم کرنا ہے۔

☆ موبائل فون کے میموری کارڈ میں نعتوں کے ساتھ گانوں اور میوزیکل گھنٹی کا ایک جگہ ہونا میرے حساب سے غلط ہے۔ سارے گانے اور ڈسکو گھنٹیاں رمضان آتے ہی ڈیلیٹ کر دوں گا۔ ان شاءاللہ

☆ والدین کمزور ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کے ایک بار سارے ٹیسٹ کرانے چاہئیں۔ سرکاری اسپتال میں تو ذلالت سے ایک دو ٹیسٹ ہی ہوں گے۔ پرائیویٹ اسپتال کا خرچ کم از کم چار ہزار روپے ہے۔ مولوی صاحب سے مشورہ کرنا ہے کہ قربانی والے جو

روپے جمع کیے، کیا ان سے بیمار ماں باپ کے ٹیسٹ کرائے جا سکتے ہیں؟

☆ بچپن میں حکیم کے غلط انجکشن سے مرنے والے اپنے ان دیکھے بھائی کی قبر ہر عید پر گم ہو جاتی ہے۔ قبر پختہ کرانا گناہ ہے لیکن کوئی کتبہ یا نشانی وغیرہ لگا کر اسے محفوظ بنایا جا سکتا ہے۔ آخر کار وہ میرا بھائی تھا۔

☆ مسجد کے سامنے والے گھر میں بیوٹی پارلر کا ہونا میرے خیال میں بے ادبی ہے۔ سلیم بھائی اگر خود بات کر لیں تو مناسب ہے۔ مسجد کمیٹی کو بھی انھیں آرام سے سمجھانا چاہیے کہ بیوٹی پارلر کے دروازے پر لگے پوسٹر پر انڈین اداکارہ کی تصویر آداب مسجد کے منافی ہے۔ امید ہے، ہٹائیں گے۔

☆ خان سبزی والے نے دو دفعہ چھلکے کہہ کر میٹھے آلو دے دیے، وہ بھی پانچ کلو! قسم کھا کر کہتا تھا کہ انڈین آلو ہیں مگر یہ تو میٹھے نکلے۔ ایک آلو اپال کرا کے دکھانا ہے کہ جھوٹے، کیا یہ انڈین آلو ہے؟

☆ ہر دوسرے دن ریزر سے شیو کرتے ہوئے بال جب نالی میں گریں، تو سنت نبویؐ کے اس طرح بہ جانے پر دل جلتا ہے۔ کسی بڑے عالم دین سے پوچھنا ہے کہ ڈاڑھی منڈانا مکروہ ہے، مکروہ تحریمی یا حرام؟ اگر واقعی اس کے منڈھانے کی سزا سخت ہے تو پھر ڈاڑھی رکھ لینی چاہیے۔ اب اس کی خاطر آخرت کو داؤ پہ نہیں لگا سکتا۔

☆ زاہد انکل کے کہنے پر بینک میں ملازمت کی درخواست دی تھی۔ آج تیسرا مہینا ہونے والا ہے، کوئی جواب نہیں آیا۔ انکل کو دوبارہ فون کر کے پوچھنا ہے کہ درخواست آگے گئی بھی ہے یا ویسے ہی لارا لگایا ہوا ہے۔

☆ مولوی صاحب نے اس جمعہ کو صاف صاف کہا ہے کہ سود کا لین دین عزت پامال کر دینے سے بھی بڑا گناہ ہے۔ موسیقی سننے کی سزا بھی کانوں میں گرم سیسہ ڈالنے کی شکل میں ملے گی (استغفراللہ)۔ احتیاطاً ایک دو اور علما سے مشورہ کر کے ان کاموں سے بچنے کے لیے کوئی پکا فیصلہ کرنا ہے۔

☆ اماں کو سمجھانا ہے کہ خبرنامے کے دوران کوئی غیر اخلاقی اشتہار آئے تو کم از کم چھوٹے بہن بھائیوں کو اٹھا دیا کریں یا بندہ ٹی وی ہی بند کر دیتا ہے۔ براہ راست بات کرنے کے بجائے خالہ نجمہ کو کہنا ہے کہ وہ معاملہ اٹھائیں۔

☆ خالہ نجمہ کو یہ بھی کہنا ہے کہ مجھے کپڑے جوتے ''گفٹ'' کرنے کے بجائے پیسے دے دیا کریں تاکہ میں انھیں اپنے حساب سے خرچ کر سکوں۔ کوشش کرنی ہے کہ آئندہ یہ تحفے نہ ہی لوں۔

☆ دنیا کے رنگ نرالے..... عرفی انکل کی بیوی کرایہ دار کے ساتھ مل کر بے چارے شوہر کو گھر سے بے دخل کر چکی۔ یہ انتہائی ظلم ہے۔ انکل کی ہر صورت مدد کرنی ہے۔ (مالی تو ممکن نہیں، قانونی مدد یا مشورہ دیا جا سکتا ہے)

☆ پنڈی والی بہن نے بتایا ہے کہ ان کی گلی میں کئی لوگوں نے کمپریسر لگا کر گیس کھینچ لی۔ ان کا چولھا ایک مہینے سے ٹھنڈا ہے۔ محکمہ گیس فون کر کے کم بختوں کو سنانی ہیں کہ غیر قانونی کمپریسر لگانے والے کھلی گیس کھینچ رہے ہیں اور کمپریسر نہ لگانے والوں کے چولھے ٹھنڈے پڑے ہیں۔ یہ کیا اندھیر نگری ہے۔

☆ کمپیوٹر کو ہر چوتھے دن موت پڑ جاتی ہے۔ نوید بھائی کہتے ہیں کہ ونڈو کی اوریجنل سی ڈی پانچ ہزار روپے میں لے لو۔ لیکن یہاں سارے ہی تیس روپے

والی دو نمبری ڈی سے کام چلا رہے ہیں۔ اصلی کون لیتا ہے، وہی لیتی ہے۔

☆ پچھلی گلی میں کرایہ داروں کی ابنارمل لڑکی اکثر کریانہ والے سے بسکٹ چاکلیٹ خریدتی ہے۔ اس کے گھر والوں کو سمجھاتا ہے کہ بے شک وہ ابنارمل ہے لیکن لڑکی ذات ہے، اسے باہر نہ بھیجا کریں۔ خدا معاف کرے، حالات اچھے نہیں۔

☆ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے سانس پھول جاتا ہے۔ پہلی فرصت میں ای سی جی کرانی ہے۔ کمزوری وغیرہ کے لیے کوئی ٹیسٹ ہوتا ہو تو لکھوا لینا ہے۔ اپنے معمولات بھی درست کرنے ہیں۔ نماز باقاعدہ پڑھنی ہے۔

☆ مولوی صاحب سے کہنا ہے، اگر موذن بزرگ برا نہ مانیں تو میرا ذکر کیے بغیر ان سے کہیں کہ دوران اذان بلغم زدہ کھانسی سے پرہیز کیا کریں۔ ناگوار غرغراہٹ سے اذان کا سارا لطف غارت ہو جاتا ہے۔

☆ شاہی ہیجڑا جو بچارہ بڑا شریف ہے، اسے بازار میں سب لوگ چھیڑتے ہیں۔ اسے مشورہ دینا ہے کہ بینک سے پانچ لاکھ روپے قرضہ لے اور چوڑیوں یا کپڑوں کی دکان کھول لے۔

☆ میرے کمرے کا دروازہ کھلتے ہی "چراں چراں" کی آواز آتی ہے۔ اس کے قبضوں میں تیل ڈالنا ہے۔ تھوڑا سا تیل چارپائی کے پچھلے پائے میں بھی ڈالنا ہے۔ پنکھے کے پر بھی گندے ہیں۔ کسی دن سیڑھی لگا کر انھیں صاف کرنا ہے۔

☆ پچھلی گلی والے گھر میں ای کو بھیج کر معلومات کرنی ہے کہ ایسا کیوں ہے کہ ان کا لاڈلا کتا رات ۱۲ بجے کے بعد جب لوگ نیند یا عبادت میں مشغول ہوتے ہیں، مسلسل بھونکنے لگتا ہے۔ میں کئی مہینوں سے ذہنی طور پر پریشان ہوں۔

☆ رات بھر اونچی اور مسلسل آواز میں بھونکنے والے اس کتے کے مالکان کا گھر معلوم ہو گیا۔ جھگڑالو اور بدمعاش لوگ ہیں لہٰذا ان سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں، صبر ہی کیا جا سکتا ہے۔

☆ کچہری میں جائز ڈومیسائل بناتے ہوئے نہ نہ کرتے بھی ۸۰۰ روپے رشوت دینی پڑی۔ رشوت دے کر ملنے والے ڈومیسائل سے اگر ملازمت مل گئی تو خدانخواستہ وہ حرام تو نہیں ہو گی؟ یہ بات مولوی صاحب سے پوچھنی ہے۔ یہ بھی پوچھنا ہے کہ وہ انکم ٹیکس والے چاچو سے مدرسے کا خرچ کیوں لیتے ہیں؟ حالانکہ مجھے پکا پتا ہے، وہ وہاں چپڑاسی ہے، لیکن تین منزلہ چوبارہ بنا چکا۔ کیا اس سے چندہ لینا جائز ہے؟

(بشکریہ ماہنامہ نوائے اخلاق، راولپنڈی)

◆◆◆

غزل

ملے گا منزلِ مقصود کا اسی کو سراغ
اندھیری شب میں ہے چیتے کی آنکھ جس کا چراغ
میسر آتی ہے فرصت فقط غلاموں کو
نہیں ہے بندۂ حُر کے لیے جہاں میں فراغ
فروغِ مغربیاں خیرہ کر رہا ہے تجھے
تری نظر کا نگہباں ہو صاحبِ 'مازاغ'
وہ بزمِ عشق ہے مہمانِ یک نفس دو نفس
چمک رہے ہیں مثالِ ستارہ جس کے ایاغ
کیا ہے تجھ کو کتابوں نے کور ذوق اتنا
صبا سے بھی نہ ملا تجھ کو بوئے گل کا سُراغ!

(علامہ محمد اقبال)

گزشتہ اقساط کی تلخیص

اکہتر سالہ سیتھ ہیوبرڈ نے چنار کے ایک درخت سے لٹک کر گلے میں پھانسی کا پھندا ڈال لیا۔ اس نے نہایت عمدہ سیاہی مائل سوٹ پہن رکھا تھا۔ چونکہ بارش ہو رہی تھی اس لیے وہ مکمل طور پر بھیگا ہوا تھا۔ وہ خوش مزاج شخص تھا اور اکثر چرچ بھی جاتا تھا۔ اس کی دو سابق بیویاں تھیں جنھوں نے اس سے طلاق لے لی تھی۔ سیتھ کے دو بچے تھے جو کہیں اور رہتے اور باپ سے بہت کم ملتے تھے۔ سیتھ ہیوبرڈ ایک فارم ہاؤس اور اس کے اردگرد درختوں سے پُر قطعہ زمین کا مالک تھا اور عمارتی لکڑی کا کامیاب کاروبار کرتا تھا۔ خودکشی سے پہلے سیتھ نے اپنے ایک ملازم کیلون کو فون کر کے کہہ دیا کہ وہ اسے فلاں جگہ ملے۔ جب وہ وہاں پہنچا تو مسٹر سیتھ کی گاڑی کھڑی تھی اور ان کی لاش درخت سے لٹک رہی تھی۔ اس نے پولیس کو فون کیا۔ پولیس افسروں نے آ کر سیتھ کی تصویریں لیں اور لاش درخت سے اُتار کر ایمبولینس میں رکھی۔ فورڈ کاؤنٹی کا شیرف اوزی والز بھی وہاں آ پہنچا۔ وہ سیتھ ہیوبرڈ کو جانتا تھا۔ ایک افسر کیلون کے ساتھ اس کے گھر گیا۔ جہاں اسے باورچی خانے کے میز پر سیتھ کے ہاتھ کا لکھا ہوا خط ملا۔ اس نے لکھا تھا کہ اس نے اپنی جان خود لی ہے اور اس کا پوسٹ مارٹم نہ کیا جائے اور اپنی تجہیز و تکفین کے بارے میں کچھ ہدایات بھی لکھ دی تھیں۔

فورڈ کاؤنٹی میں جیک بریگینس ایک مشہور اور نیک نام وکیل تھا۔ کارل ہیلی کا مشہور مقدمہ جیتنے کے باعث وہ شہرت اور عظمت کی بلندیوں پر پہنچ چکا تھا۔ لیکن اس کے بعد مقدمے کے مخالف دہشت گردوں نے اس کے مکان کو جلا دیا۔ اب وہ کرائے کے معمولی سے مکان میں رہتا تھا۔ مکان کی انشورنس کا معاملہ ابھی تصفیہ طلب تھا۔ چار دہشت گرد اب قید کی سزا بھگت رہے تھے۔ کچھ کہیں اور منتقل ہو چکے تھے۔ اس لیے جیک ہمیشہ پستول ہمراہ رکھتا تھا۔ وہ صبح جلدی اٹھتا اور تیار ہو کر دفتر چلا جاتا۔ اس کی بیوی کارلا اسکول ٹیچر تھی۔ وہ بعد میں تیار ہو کر اپنی بیٹی حنا کو ساتھ لے کر اسکول چلی جاتی تھی۔ جب جیک گھر سے باہر نکلا تو اس نے پولیس افسر لوئی تک کو ہیلو کہا جسے اوزی والز نے بریگینس فیملی کی حفاظت کے لیے وہاں متعین کر رکھا تھا۔ وہ جلد اپنی پرانی امریکی گاڑی میں اپنے دفتر کے قریب کلینٹن چوک میں کافی شاپ پر پہنچ گیا۔ کافی پیتے ہوئے اس نے دوستوں سے سیتھ ہیوبرڈ کی خودکشی پر گفتگو کی۔ اس نے سیتھ کی جائداد اور ممکنہ وصیت میں دلچسپی لی کیونکہ اس کا مطلب کسی وکیل کے لیے اچھی خاصی فیس ہوتا ہے۔ جیک حسب معمول کلینٹن چوک میں روزانہ کی چہل قدمی کے بعد اپنے شاندار دفتر میں داخل ہو گیا۔ اس کی سیکرٹری راکسی نچلی منزل پر استقبالیہ کمرے میں بیٹھتی اور وہ خود بالائی منزل پر بیٹھتا تھا۔ اس روز کی ڈاک میں جیک کو اپنے نام ایک لفافہ ملا جس پر لکھنے والے کا نام سیتھ ہیوبرڈ تحریر تھا۔ اس نے لفافہ احتیاط سے کھولا۔ اس میں سیتھ ہیوبرڈ کا ایک خط برآمد ہوا جس میں اس نے اپنی خودکشی کی اطلاع دی تھی اور اپنی وصیت کے معاملے میں اس کو اپنا وکیل نامزد کیا تھا۔ خط کے ساتھ سیتھ کی لکھی وصیت بھی تھی جس میں اس نے اپنے دونوں بچوں اور دونوں سابق بیویوں کو جائداد سے یکسر محروم کر دیا تھا اور جائداد کا نوے فیصد حصہ اپنی ملازمہ اور دوست لیٹی لینگ کے نام کر دیا تھا جس نے بیماری کے زمانے میں اس کی خدمت کی تھی۔ جیک نے خط اور وصیت کی ایک نقل راکسی کو دی، دو نقول اپنے ڈیسک میں رکھیں اور ایک نقل بینک کے لاکر میں رکھ دی۔ اس کے بعد وہ کاؤنٹی شیرف اوزی والز کو ملنے اس کے دفتر گیا۔ دونوں نے تھوڑی دیر سیتھ ہیوبرڈ کی خودکشی، اس کی وصیت اور سیاہ فام لیٹی لینگ کے بارے میں تبادلہ خیال کیا۔

اوزی نے بتایا کہ وہ لیٹی لینگ کو جانتا ہے۔ وہ ایک چھوٹی آبادی لٹل ڈیلٹا میں رہتی ہے۔ اس کی شادی سائمن لینگ سے ہوئی ہے جو نکھٹو اور آوارہ ہے اور شراب نوشی کرتا ہے۔ ان کے چار یا پانچ بچے ہیں۔ ایک لڑکا قید خانے میں ہے۔ ایک لڑکی فوج میں ہے۔ لیٹی پینتالیس سال کی ہے۔ اس کا تعلق بیم فیملی سے ہے۔ جیک نے پوچھا کہ کیا آپ سیتھ ہیوبرڈ کو جانتے ہیں۔ اوزی نے کہا کہ اس نے مجھے انتخابات میں کامیابی کے لیے دو دفعہ پچیس پچیس ہزار ڈالر دیے اور بدلے میں کچھ نہیں مانگا۔ وہ کچھ زمین کا مالک تھا اور عمارتی لکڑی کا کاروبار کرتا تھا۔ لیکن ایک ناخوشگوار طلاق میں وہ بہت کچھ کھو بیٹھا تھا۔ اس نے بتایا کہ سیتھ کی تجہیز و تکفین کل سہ پہر چار بجے چرچ سے ملحق قبرستان میں ہوگی۔ اس نے فون کر دیا تھا اور اس کے دونوں بچے ہرشل اور ریمونا جلد پہنچ جائیں گے۔

ہرشل ہیوبرڈ ایک گھنٹے میں میمفس سے فورڈ کاؤنٹی سیتھ کے گھر پہنچ گیا۔ پھر اس کی بہن ریمونا اور اس کا شوہر آیان ڈیفو بھی پہنچ گئے۔ انھوں نے ایک دوسرے سے رسمی تعزیت کی۔ صرف ریمونا کافی دیر روتی رہی۔ ہرشل نے اپنے باپ کے بارے میں کوئی جذبات محسوس نہ کیے۔ وہاں ان کی ملاقات سیاہ فام گھریلو ملازمہ لیٹی لینگ سے ہوئی۔ وہ اس بات پر حیران تھے کہ سیتھ اس کو پانچ ڈالر فی گھنٹا کے حساب سے معاوضہ ادا کرتا تھا جو کہ بہت زیادہ تھا۔ سیتھ کے ہمسائے اور چرچ کے دوست خورد و نوش کی اشیا کے ساتھ تعزیت کے لیے آ رہے تھے۔ لیٹی ان سے کیک اور تعزیت وصول کر رہی تھی کیونکہ سیتھ کے بچوں نے کسی سے ملاقات کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ جلد ہی انھوں نے سیتھ کی وصیت اور بینک اکاؤنٹس کے بارے میں سوالات شروع کر دیے۔ دو پولیس افسر آئے اور انھوں نے سیتھ کی کار واپس کر دی۔ انھوں نے سیتھ کا وہ خط بھی واپس کیا جو ان کو ڈائننگ ٹیبل سے ملا تھا اور جس میں سیتھ نے اپنی تجہیز و تکفین کی ہدایات دی تھیں۔

ہیری ریکس طلاق کے مقدمات کا ماہر مشہور وکیل تھا۔ وہ طلاق کے مقدمے میں سیتھ کی دوسری بیوی سائبل کا وکیل تھا۔ اس نے جیک کو بتایا کہ اس مقدمے میں اس نے سیتھ کا سارا روپیہ لے لیا تھا۔ کافی رقم خود رکھی اور باقی موکلہ کو دے دی۔ جیک نے اس سے سیتھ کی موجودہ جائداد اور مالی حیثیت کے بارے میں استفسار کیا۔ سیتھ کے وارث گھر کے عقبی حصے میں بیٹھے بات چیت کر رہے تھے۔ لیٹی نے ان کو لنچ پیش کیا۔ لیٹی نے سنا وہ کہہ رہے تھے تجہیز و تکفین کے اگلے دن وہ لیٹی کو ملازمت سے فارغ کر دیں گے اور گھر کو تالا لگا دیں گے۔

جیک نے اپنے دفتر میں لیٹی کو وصیت پڑھنے دی۔ فورڈ کاؤنٹی کے جج ریوبن اٹلی نے سیتھ کی موت کے نو دن بعد اپنی عدالت میں مقدمے کی پہلی سماعت کی۔ کمرا عدالت وکلا، مدعیان اور معترضین سے بھرا ہوا تھا اور سفید فام اور سیاہ فام تماشائیوں کے دو واضح گروہ نظر آئے۔ جج نے کچھ ضروری معاملات نمٹائے اور سماعت تیس دن کے لیے ملتوی کر دی۔

اسی دن شام کو جیک، جج اٹلی سے ملنے اس کے گھر گیا۔ جج نے کہا کہ قصبے میں افواہ پھیلی ہوئی ہے کہ جیک ہوکٹ ہاؤس خریدنے کی تیاری کر رہا ہے۔ اس نے مشورہ دیا کہ اس وقت صبر کیا جائے ورنہ شکوک پیدا ہوں گے کہ وہ اس مقدمے کی بہتی گنگا میں ہاتھ دھو رہا ہے۔ جج نے یہ بھی کہا کہ اینسل ہیوبرڈ کی تلاش جاری رکھی جائے کیونکہ جب تک اس کی موت کی تصدیق نہیں ہوتی، عدالت اُسے زندہ تصور کرے گی۔

۲۰ فروری سوموار کے دن جج اٹلی نے پیش رفت کا جائزہ لینے کے لیے مقدمے کے تمام وکلا کو کمرا عدالت میں بلایا۔ جج نے سب وکلا کو سیتھ کے اثاثوں کی فہرست

دی اور ان سے کہا کہ اسے خفیہ رکھا جائے۔ اس کے بعد جج نے وکلا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ مقدمے سے پہلے فریقین میں سمجھوتے کی تجویز کے بارے میں کیا خیال ہے؟ جج نے تجویز پیش کی کہ اگر ٹیکسوں کی منہائی کے بعد تینوں بڑے دعویداروں ہرشل، ریمونا اور لینی میں رقم مساوی بانٹ دی جائے تو ہر ایک کو تقریباً چھتیس لاکھ ڈالر ملیں گے۔ چرچ کو پانچ فیصد حصہ دے دیا جائے اور ہنسل کا پانچ فیصد ٹرسٹ میں محفوظ کر دیا جائے

ہرشل اور ریمونا کے وکلا نے آمادگی ظاہر کر دی لیکن جیک نے مخالفت کی۔ اس نے کہا کہ وہ ہر قیمت پر سیتھ کی وصیت کا دفاع کرے اور کسی سمجھوتے کا حصہ نہیں بنے گا۔ آخر میں جج نے بھی اتفاق کیا کہ اگر جیوری نے یقین کیا کہ مسٹر ہیوبرڈ آخری وقت تک اپنے ہوش و حواس میں تھا تو پھر اسی وصیت پر عمل ہوگا اور اس کے بالغ بچوں کو کچھ نہیں ملے گا۔ جج نے مقدمے کی باقاعدہ کارروائی کے لیے تین اپریل کی تاریخ مقرر کر دی۔ البتہ بیس مارچ کو ایک جائزہ اجلاس منعقد ہوگا۔

اسی رات فورڈ کاؤنٹی کے جنوب میں لیک ولیج کے قریب ایک حادثہ پیش آیا جس میں سائمن لینگ کا ٹرک تیز رفتاری کی وجہ سے ایک ٹویوٹا کار سے ٹکرا گیا۔ حادثے میں ہائی اسکول کے دو طالب علم بھائی ہلاک ہو گئے اور سائمن زخمی ہو کر اسپتال پہنچ گیا۔ سائمن مقررہ حد سے زیادہ شراب کے نشے میں ٹرک چلا رہا تھا۔ چناں چہ اس کو طبی امداد کے بعد جیل منتقل کر دیا گیا۔ جیک نے پورشیا اور لینی کو بتایا کہ اس جرم میں پانچ سے پچیس سال قید ہو سکتی ہے اور بچ نکلنے کا کوئی امکان نہیں۔ دونوں خواتین نے اطمینان کا سانس لیا کہ وہ اب لمبا عرصہ ان سے دور رہے گا۔

جیک کا خیال تھا کہ اس مہلک حادثے کے بعد لینگ خاندان فورڈ کاؤنٹی کے تمام افراد کی شدید نفرت کا نشانہ بن جائے گا اور وصیت کے مقدمے میں جیوری بھی جانبدار ہوئے بغیر نہیں رہ سکے گی۔ لینی کے لیے انتہائی ضروری ہو گیا ہے کہ وہ سائمن کے خلاف طلاق کی درخواست دے اور اس کے ساتھ ہر قسم کا تعلق ختم کر دے۔ طلاق کے ماہر وکیل ہیری ریکس نے لینی کو طلاق کی درخواست فائل کرنے کا طریقہ سمجھایا اور کہا کہ سائمن پر ہر ممکن الزام لگا دو۔ وہ جیل میں ہونے کی وجہ سے ویسے بھی دفاع نہیں کر سکے گا۔ اس نے زور دیا کہ طلاق کی تشہیر بھی بڑی پیمانے پر ضروری ہے۔

لینی کو فون پر دھمکیاں ملنا شروع ہو گئی تھیں۔ شیرف اوزی والز نے اپنے نائب ولی ہیسٹنگو کو بھیجا کہ وہ لینی کو تسلی دے اور انھیں تحفظ دینے کے لیے گھر کے قریب رہے۔ لینی نے ولی کو تعزیت اور ہمدردی کا ایک خط دیا جو اس نے ٹرک حادثے میں مرنے والے بھائیوں کے والدین مسٹر اور مسز راسٹن کے نام لکھا تھا۔ اس نے درخواست کی کہ وہ خط ان تک پہنچا دیا جائے۔ جمعرات کے دن صبح سویرے سائمن لینگ کو جیل میں بیدار کر کے اسے کاؤنٹی جج کے سامنے پیش کیا گیا۔ جج نے اس پر فرد جرم عائد کر دی جس کا اس نے انکار کیا۔ اس کے وکیل آرتھر ویلچ نے درخواست ضمانت پیش کی۔ جج نے درخواست منظور کرتے ہوئے بیس لاکھ ڈالر کے عوض ضمانت پر رہا کرنے کا حکم دیا اور زر ضمانت کی ادائی تک اس کو جیل بھیج دیا۔

جمعہ کی صبح مسٹر راسٹن جیک کے دفتر پہنچ گئے۔ انھوں نے کہا کہ لینی لینگ ایک شائستہ خاتون ہے۔ اس نے ہمیں تعزیت اور ہمدردی کا خط بھیجا ہے۔ ہم اس کے

شکرگزار ہیں۔ نیز یہ کہ انھوں نے مسیح علیہ السلام کی تعلیم کے مطابق سائمن لینگ کو معاف کر دیا ہے کیونکہ یہ نفرت سے بہتر ہے۔ اس نے یہی الفاظ پورشیا سے بھی کہے۔ پورشیا نے نمناک آنکھوں سے ان کا شکریہ ادا کیا۔

ویڈلیفٹر کے تحقیق کنندہ رینڈل کلیپ نے ایک اور معرکہ سر کر لیا جب اس نے فلوریڈا کے قریب جارجیا میں ایک اکتالیس سالہ مطلقہ پرکشش سیاہ فام عورت جولینا کنڈ کو ڈھونڈ نکالا۔ وہ جارجیا میں ایک بڑی فرنیچر فیکٹری میں کام کرتی تھی جسے پانچ سال قبل سیتھ ہیوبرڈ نے خرید لیا۔ ایک ماہ بعد اسے ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔ ایک ہفتہ بعد اس نے سیتھ کے خلاف جنسی استحصال کی درخواست دائر کر دی۔ اس کا وکیل کلیپ کو تفصیل بتانے پر آمادہ نہ تھا۔

کلیپ نے جولینا کو دو سو ڈالر نقد اور لنچ کی پیشکش کر دی تاکہ وہ اس کے سوالات کا جواب دے۔ اس نے بتایا کہ سیتھ نے آتے ہی اس کی تنخواہ میں اضافہ کر دیا اور اپنے دفتر میں ایگزیکٹو سیکرٹری بنا دیا۔ سیتھ کی دو فیکٹریاں میکسیکو میں بھی تھی۔ اس نے جولنیا کو اپنے ساتھ میکسیکو جانے کی دعوت دی جسے اس نے قبول کر لیا کیونکہ وہ باہر کی دنیا دیکھنا چاہتی تھی۔ وہاں اس نے سیتھ کے ساتھ ایک رات گزاری اور اگلے دن جب وہ اپنے کام کے لیے باہر نکلا تو وہ پہلی پرواز سے واپس آ گئی۔ ایک ہفتے بعد سیتھ نے واپس آتے ہی اس کو برطرف کر دیا۔ جواب میں اس نے سیتھ کے خلاف جنسی استحصال کا مقدمہ دائر کر دیا۔ لیکن مقدمہ چلنے سے پیشتر ہی وکلا کی کوششوں سے سمجھوتہ ہو گیا اور سیتھ نے اس کو ۱۲۵۰۰۰ ڈالر ادا کیے۔

یہ ویڈلیفٹر کے لیے ایک اور تحفہ تھا جسے وہ مقدمے کی کارروائی کے دوران جیوری کو متاثر کرنے کے لیے استعمال کر سکتا تھا۔ سائمن لینگ کے حادثے کے ایک ہفتے بعد فورڈ کاؤنٹی ٹائمز نے پہلے صفحے پر تصادم سے مزین تفصیلی کہانی شائع کی جس کی سرخی تھی "کاؤنٹی راسٹن بھائیوں کی موت کا سوگ منا رہی ہے۔" اس کے ساتھ دونوں بھائیوں کی بڑی تصاویر، ان کے جنازوں کی تصویریں تھیں۔ نیز کلینٹن ہائی اسکول کے بچے اپنے ساتھیوں کی یاد میں شمعیں روشن کیے ہوئے دکھائے گئے تھے۔ کہانی میں جیک اور سیتھ ہیوبرڈ مقدمے کا کوئی ذکر نہ تھا۔

یہ جیک کی اس دھمکی کا اثر تھا جو اس نے رپورٹر ڈومازلی کو دی تھی کہ اس کا نام سائمن کے ساتھ منسلک نہ کیا جائے کیونکہ وہ اس کا وکیل نہیں۔ جیک نے یہ اخباری کہانی صبح سات بجے پڑھ لی۔ آٹھ بجے اسے سٹل مین رش کا فون آیا کہ ہرشل نے اس کو وکالت سے برطرف کر دیا ہے۔ جیک کو کچھ سکون تو محسوس ہوا لیکن اس کو زیادہ تجربہ کار اور خطرناک ویڈلیفٹر سے حقیقی خطرہ تھا کیونکہ وہ مقدمے کو کوئی بھی رخ دینے کی اہلیت رکھتا تھا۔ لیٹی تین ماہ سے بیروزگار اور کام کی تلاش میں تھی۔

جیک کا خیال تھا کہ مقدمے کی کارروائی سے پہلے اس کا کام پر ہونا بہت ضروری ہے تاکہ جیوری کے ارکان یہ نہ سمجھیں کہ وہ سیتھ کی دولت پر عیش کر رہی ہے۔ اسی لیے جب پورشیا نے جیک کو بتایا کہ اس کی والدہ کو میتھوڈسٹ چرچ کے اسکول میں صفائی کا کام مل گیا ہے تو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

جیک بریگینس مارچ کی ایک خوشگوار سہ پہر جج اٹلی سے اس کے پورچ میں ملا۔ موقع مناسب جان کر جیک نے جج سے کہا کہ فورڈ کاؤنٹی سے منتخب کیے جانے والے جیوری کے ارکان سب متعصب ہو چکے کیونکہ یہاں "لینگ" ناپسندیدہ نام بن چکا ہے۔ اس لیے یہاں

لیٹی کو انصاف نہیں مل سکتا۔ جج نے اپنے تحفظات کا اظہار کیا۔ لیکن بالآخر جیک سے کہا کہ وہ مقدمے کی جگہ کی تبدیلی کے لیے درخواست دے اور وہ اس پر سنجیدگی سے غور کرے گا۔

لیٹی کو اپنے حقیقی والدین کا علم نہ تھا۔ اس کو تیس سال کی عمر میں پتا چلا کہ سائپرس اور اس کے شوہر نے اس کو لے پالک کے طور پر پالا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کا تعلق رنڈز خاندان سے ہے جو فورڈ کاؤنٹی میں زمینوں کے مالک تھے۔ اس خاندان کے لوگ پچاس سال قبل فورڈ کاؤنٹی سے فلوریڈا منتقل ہوئے تھے اور سرکاری طور پر ان کا کوئی ریکارڈ دستیاب نہیں تھا۔ پورشیا اور لیوسین لیٹی کے شجرہ نسب کو دریافت کرنے پر سنجیدگی سے کام کر رہے تھے اور وہ اس سلسلے میں رنڈز خاندان کے کئی افراد سے رابطہ قائم کر چکے تھے لیکن ابھی تک انھیں یقینی طور پر کوئی ثبوت نہ مل سکا تھا۔

جیک اور کارلا کے جلائے گئے گھر کے معاوضے کا معاملہ ابھی تک انشورنس کمپنی کے ساتھ الجھا ہوا تھا اور جیک کے لیے سخت پریشانی کا باعث تھا۔ انشورنس کمپنی ایک لاکھ ڈالر ادا کرنے کو تیار تھی جب کہ جیک ڈیڑھ لاکھ پر مصر تھا۔ ہیری ریکس نے بغیر کسی فیس کے ان کا معاملہ ایک لاکھ پینتیس ہزار ڈالر پر طے کرا دیا جس پر جیک اس کا بے حد ممنون ہوا۔ ہیری کا مشورہ تھا کہ اب اسے ہوکٹ ہاؤس خرید لینا چاہیے۔ جیک بھی یہی چاہتا تھا لیکن کافی رقم نہ ہونے کے باعث خاموش تھا۔

۲۰ مارچ کی تاریخ مقدمے سے قبل کانفرنس کے لیے مخصوص کی گئی تھی۔ اس دن جج ہیٹلی نے کمرا عدالت میں وکلا سے پوچھا کہ کیا وہ تین اپریل کو مقدمے کے باقاعدہ آغاز کے لیے تیار ہیں؟ سب نے اتفاق کیا۔ جج نے ستانوے ناموں پر مشتمل جیوری کی فہرست وکلا میں تقسیم کی اور انھیں ہدایت کی کہ وہ اس کو خفیہ رکھتے ہوئے ناموں کا جائزہ لیں لیکن کسی بھی فرد کو متاثر کرنے، قائل کرنے یا دھمکانے کے لیے کوئی براہِ راست رابطہ نہ کیا جائے۔ بڑے مقدمات میں جیوری کو منتخب کرنے کے لیے ماہر مشیر اہمیت اختیار کر چکے تھے۔ چناں چہ کانفرنس سے فارغ ہوتے ہی وکلا نے اپنے اپنے مشیروں کو جیوری کی فہرست تھما دی اور جیوری کے ممکنہ ارکان کے بارے میں تحقیق اور معلومات جمع کرنے کا کام زور شور سے شروع ہو گیا۔

الاسکا کے شہر جونیو کے ایک مے خانے میں ایک بحری جہاز کے روسی عملے نے نشے میں ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ مالک کی عدم موجودگی میں لونی کلارک کاروبار اور نظم و نسق کا ذمہ دار تھا۔ جب ان شرابیوں نے بدتمیزی اور ہلڑ بازی کی انتہا کر دی تو لونی نے مداخلت کی لیکن ان میں سے کسی ایک نے اس کے سر پر کسی بھاری چیز سے وار کر دیا۔ لونی گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ وہ دو دن اسپتال میں بے ہوش پڑا رہا۔ اس کا سر پھٹ چکا تھا۔ جب پولیس نے تحقیق شروع کی تو مے خانے کا مالک لونی کی شناخت کے سلسلے میں کوئی دستاویزی ثبوت پیش کرنے سے قاصر رہا۔ جب اس کی رہائش گاہ کی تلاشی لی گئی تو وہاں سے مختلف ناموں پر ایک جعلی ڈرائیونگ لائسنس، دو جعلی پاسپورٹ، ایک چوری شدہ ڈرائیونگ لائسنس اور ایک اینسل ایف ہیوبرڈ کا ۱۹۵۵ء کا جاری کردہ بحریہ سے سبکدوشی کا خط ملا۔ علاوہ ازیں پلاسٹک کے ایک بیگ میں دو ہزار ڈالر نقد اور تین کلو کوکین کا ایک ڈبا ملا جس کی مارکیٹ میں قیمت پندرہ لاکھ ڈالر تھی۔ جب لونی ہوش میں آیا تو پولیس نے اس سے اس کی شناخت کے بارے میں سوالات کرنا شروع کیے لیکن اس نے کسی سوال کا بھی تسلی بخش جواب نہ دیا۔

جج ہیٹلی کی منظوری سے البرٹ مرے کئی ماہ سے اینسل ہیوبرڈ کو تلاش کرنے پر مامور تھا۔ اب اچانک اس نے جیک کو خبر دی کہ الاسکا میں اینسل ہیوبرڈ کا پتا چلا ہے لیکن وہاں وہ لونی کلارک کے نام سے کام کر رہا ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ چھیاسٹھ برس کا ہے اور منشیات کے کاروبار میں بھی ملوث ہے۔ جب لیوسین کو یہ معلومات ملیں تو وہ فوراً ایک پرواز سے شکاگو، دوسری سے سیاٹل اور تیسری سے الاسکا پہنچ گیا۔ اسپتال پہنچ کر لیوسین نے اینسل ہیوبرڈ کو اس کا ماضی یاد دلایا لیکن اس نے کوئی جواب دینے سے احتراز کیا۔

جیک اپنے دفتر میں فون پر بے حد مصروف تھا۔ وہ ویڈلیمتر کے پیش کردہ گواہان کے ساتھ رابطہ کرنے کی کوششیں کر رہا تھا۔ اس دوران ہیری ریکس اندر داخل ہوا۔ اس نے ایک لفافہ جیک کی طرف بڑھایا "یہ تمھاری انشورنس کمپنی کی طرف سے ایک لاکھ پینتیس ہزار ڈالر کا چیک ہے۔ اس کے لیے وکیل کی کوئی فیس نہیں لہٰذا تم مجھے کسی وقت کھانے کی دعوت دو گے۔"

"شکریہ" جیک نے کہا۔ جیک کو اپنے پرانے مکان کے جانے کا غم تھا اور تصفیہ ہو جانے کی خوشی بھی۔ گروی کی رقم ادا کرنے کے بعد ان کو تقریباً چالیس ہزار ڈالر نقد بچ جائیں گے۔ اسی رات جیک اور کارلا نے وِلی کے ساتھ دو لاکھ پچاس ہزار ڈالر میں ہوکٹ ہاؤس خریدنے کا سودا طے کر لیا۔ اگلے تین ماہ میں دستاویزات مکمل ہونے کے بعد وہ مکان کے مالک بن جائیں گے۔

تین اپریل کی صبح تمام وکلا، موکلین اور جیوری ارکان کمرا عدالت میں جمع تھے۔ جج ہیٹلی نے ستانوے میں سے پہلے پچاس کو ترتیب سے بٹھایا۔ باقیوں کو فی الحال فارغ کر دیا۔ کچھ ارکان کو جائز وجوہ کی بنا پر جیوری ڈیوٹی سے مستثنیٰ کر دیا۔ باقی ارکان سے انفرادی طور پر کچھ سوالات کیے گئے جن کا مقصد یہ معلوم کرنا تھا کہ کیا وہ اس مقدمے کے بارے میں پہلے سے کچھ جانتے ہیں، کوئی اپنی رائے رکھتے ہیں اور مقدمے کے فریقین سے ذاتی تعلق رکھتے ہیں؟ جن کے بارے میں یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ وہ غیر جانبدار نہیں رہ سکیں گے۔ ان کو جیوری ڈیوٹی سے فارغ کر دیا گیا۔

آخر میں جج ہیٹلی نے جیک اور ویڈلیمتر سے دریافت کیا کہ وہ موجودہ افراد میں سے کس کس کو جیوری میں رکھنا پسند کریں گے؟ دونوں وکلا کی کانٹ چھانٹ کے بعد بالآخر بارہ افراد کو حتمی طور پر منتخب کر لیا گیا۔ ان میں دس سفید فام اور دو سیاہ فام، یہ کل آٹھ خواتین اور چار مرد تھے۔ ان کے علاوہ دو متبادل ارکان بھی منتخب کیے گئے۔ عدالت کا یہ پہلا اجلاس صبح نو بجے سے شام سات بجے تک جاری رہا۔

الاسکا سے لیوسین نے اطلاع دی کہ اسپتال میں پڑا زخمی لونی کلارک ہی اصل میں اینسل ہیوبرڈ ہے۔ لیکن اس کی حالت سفر کرنے کی کے قابل نہیں۔ نیز اس پر کوکین رکھنے کا الزام ہے اس لیے وہ پولیس کو مطلوب ہے۔ وہ اُسے جیل لے جانے کے لیے تیار ہیں۔ جیک اور اس کے ساتھیوں کا خیال تھا کہ اس مرحلے پر اینسل ہیوبرڈ کی موجودگی کی خبر مقدمے کی کارروائی پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتی۔ اس لیے بھی کہ عدالت کے سامنے اصل مسئلہ سیتھ کی وصیت کا ہے، اینسل کا نہیں۔

مقدمے کی کارروائی کے دوسرے دن یعنی بروز منگل جیک بریگینس نے بحث کا آغاز کیا۔ اس نے جیوری ارکان کو مخاطب کرتے ہوئے مختصراً سیتھ ہیوبرڈ کی محنت

سے کمائی ہوئی دولت، اس کی اذیت ناک بیماری، خودکشی اور ہاتھ سے لکھی آخری وصیت پر روشنی ڈالی۔ اس نے کہا کہ سیتھ آخری وقت تک صحیح دماغی حالت میں تھا اور اس نے اپنی خودکشی سمیت ہر کام طے کردہ منصوبے کے مطابق انجام دیے۔ اس نے واضح کیا کہ جیوری کا کام سیتھ ہیوبرڈ کے چوبیس ملین ڈالر کو اس کے نامزد کردہ وارثان میں تقسیم کرنا نہیں بلکہ انھوں نے صرف یہ فیصلہ کرنا ہے کہ کیا وصیت لکھتے وقت سیتھ ہیوبرڈ اپنے مکمل ہوش وحواس میں تھا اور وہ جانتا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے؟ اس لیے جیوری کے فاضل ارکان اس بات پر توجہ مرکوز رکھیں کہ متوفی اپنے آخری ایام میں مکمل دماغی صحت کا مالک تھا یا نہیں اور یہ کہ کیا اس نے اپنی مرضی سے اپنی وصیت سے اپنے بچوں کو خارج اور بڑا حصہ اپنی خدمتگار لیٹی لینگ کے نام کیا یا اس نے یہ فیصلہ کسی شخص یا دباؤ کے زیراثر کیا۔

جیک کے بعد ویڈلیمٹر نے جیوری ارکان سے خطاب کیا۔ اس نے کہا کہ سیتھ نے اپنی خودکشی سے ایک سال پہلے ایک وصیت ایک قانونی فرم سٹین رش لا کمپنی سے تیار کروائی تھی جس میں اس نے اپنی جائداد اپنے دونوں بچوں اور ان کے بچوں میں تقسیم کی تھی۔ یہی وصیت کا مقبول طریقہ ہے اور جائداد مرحوم کے خاندان میں تقسیم ہونی چاہیے۔ لیکن سیتھ ہیوبرڈ نے اپنی خودکشی سے ایک دن پہلے اپنے ہاتھ سے ایک نئی وصیت لکھی جس میں اس نے اپنے حقیقی بچوں کو وصیت سے خارج کر دیا اور جائداد کا نوے فیصد حصہ گھر کی دیکھ بھال اور اس کی خدمت کرنے والی لیٹی لینگ کے نام کر دیا۔

اس نے دعویٰ کیا کہ سیتھ نے یہ اقدام اپنی آزادانہ سوچ کے ساتھ نہیں بلکہ لیٹی لینگ کے زیراثر کیا کیونکہ وصیت کی تحریر کے وقت بھی وہ اس کے پاس موجود تھی اور دونوں گھنٹوں تک تخلیے میں تھے۔ اس لیے جیوری کے ارکان کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ سیتھ نے اپنے بچوں کو جائداد سے محروم کیوں کیا؟ اور کیا وہ ایسا کسی نامناسب اثر کے بغیر کر سکتا تھا؟

اس کے بعد جیک نے شیرف اوزی والز کو گواہ کے طور پر بلایا اور اس سے سیتھ کی موت کے بارے میں سوالات کیے۔ اوزی والز نے جوابات دیے اور ثبوت کے طور پر سیتھ کی خودکشی کی تصاویر پیش کیں اور کیلون کے نام سیتھ کا لکھا ہوا نوٹ بھی پیش کیا۔ یہ چیزیں جیوری ارکان کو دکھائی گئیں۔ بعدازاں جیک نے اپنے نام لکھا ہوا سیتھ کا اصل خط، تجہیز و تکفین کی ہدایات اور وصیت کے کاغذات پیش کیے۔ یہ دستاویزات تمام حاضرین کو اسکرین پر بڑی کر کے دکھائی گئیں اور تمام جیوری ارکان کو ان کی نقول فراہم کی گئیں۔ جج نے تمام ارکان کو ان دستاویزات کا مطالعہ کرنے کے لیے وقت دیا۔ عدالت نے بارہ بج کر تیس منٹ پر کارروائی میں ڈیڑھ گھنٹے کا وقفہ دیا۔

کارروائی دوبارہ شروع ہوئی تو جیک نے آئرش روڈ کرسچین چرچ جانے والے سیتھ کے شناسا مرد و خواتین کو باری باری گواہ کے طور پر بلایا۔ ان سب نے تصدیق کی کہ سیتھ نے اپنی خودکشی سے چند گھنٹے پہلے اتوار کے دن چرچ سروس میں شرکت کی۔ اس نے معمول کے مطابق سب سے بات چیت کی۔ اس نے چرچ کو پانچ سو ڈالر کا چندہ بھی دیا۔ اس کا رویہ دوستانہ اور معقول تھا۔ ان کے بعد میڈیکل سنٹر ٹوپیلو کے ڈاکٹر ٹالبرٹ نے سیتھ کو کینسر اور اس کے علاج کے بارے میں بتایا۔ اس نے کہا کہ وہ آخر وقت تک چاق چوبند اور پرعزم تھا۔

ویڈلیمٹر نے ڈاکٹر سے سوالات کیے اور ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اگر درد دور کرنے والی دوا ڈیمیرال (Demerol) کی دن میں سو ملی گرام کی چھے سے آٹھ خوراکیں لی جائیں تو مریض کو اہم فیصلے کرنے میں دقت ہو سکتی ہے۔ ڈاکٹر کے بعد جیک نے سیتھ کی دفتری سیکرٹری آرلین کو بلایا۔ اس نے تصدیق کی کہ سیتھ اپنی زندگی کے آخری ہفتے میں باقاعدگی سے دفتر آتا رہا۔ وہ اپنی معمول کی سرگرمیوں میں مصروف رہتا اور اکثر فون کرتا تھا۔ البتہ دوپہر کو صوفے پر آرام کرتا وہ زیادہ کھاتا پیتا نہیں تھا لیکن تمباکونوشی کرتا۔ سیتھ نے دفتر میں اپنے آخری دن بھی اپنی کچھ زمینیں فروخت کیں اور معاہدے پر دستخط بھی کیے۔

اینسل ہیوبرڈ منگل کی صبح تک اسپتال میں پولیس کی نگرانی میں تھا۔ لیوسین نے اس دن الاسکا کے پہاڑی مناظر سے لطف اندوز ہونے کا فیصلہ کیا۔ وہ اینسل کی مسلسل بیماری سے تنگ آ چکا تھا۔ اس نے اگلے دن واپسی کا ارادہ کر لیا تاکہ مقدمے کی کارروائی دیکھ سکے۔ شام کو وہ اپنے ہوٹل کی لابی میں مے نوشی کر رہا تھا جب اچانک اینسل نمودار ہوا اور اس کے سامنے میز پر آ بیٹھا۔ لیوسین اس کو سامنے دیکھ کر ہڑبڑا گیا۔ صبح تک تو وہ اسپتال میں بیہوش پڑا تھا۔ اینسل نے اُسے بتایا کہ وہ اسپتال سے تنگ آ گیا تھا۔ اس لیے جب کوئی اردگرد نہیں تھا تو وہاں سے کھسک گیا۔ بیت الخلا میں اس نے کپڑے تبدیل کیے اور باہر نکل آیا۔

"یہ چھوٹا سا قصبہ ہے تم یہاں زیادہ دیر تک چھپ نہیں سکتے۔" لیوسین نے کہا۔

"میرے یہاں کچھ دوست ہیں میں ان کے ہاں چھپ سکتا ہوں۔"

بدھ کی صبح مقدمے کی کارروائی کے آغاز پر جیک نے لیٹی لینگ کو اہم گواہ کے طور پر بلایا۔ لیٹی نے اپنے خاندان، اپنے شوہر، اپنے کام اور سیتھ ہیوبرڈ کے بارے میں جیک کے سوالات کے جوابات بڑے اطمینان اور تحمل سے دیے اور حاضرین نے توجہ سے سنا۔ اس نے تصدیق کی کہ مسٹر ہیوبرڈ خودکشی سے ایک دن پہلے ٹھیک ٹھاک دماغی حالت میں تھے اور ہر چیز ان کی مکمل گرفت میں تھی۔

ویڈلیمٹر نے اپنی جرح شروع کی اور لیٹی سے اس کے سابق آجروں کے بارے میں پوچھا۔ اس نے گزشتہ بیس سال کے دوران مختلف خاندانوں کا نام لیا جہاں وہ کام کر چکی تھی لیکن اس نے مسز پکرنگ کا ذکر نہ کیا۔ اس پر ویڈلیمٹر نے جج کی اجازت سے فریزر پکرنگ کو گواہ کے طور پر بلایا جس نے تصدیق کی کہ لیٹی لینگ نے کچھ عرصہ اس کی والدہ مسز پکرنگ کے ہاں کام کیا تھا لیکن جب مسز پکرنگ بیمار ہو گئیں تو فریزر اور اس کی بہن کو گھر سے مسز پکرنگ کی ہاتھ سے لکھی ہوئی ایک وصیت ملی جس میں لیٹی لینگ کے نام پچاس ہزار ڈالر چھوڑے گئے تھے۔

فریزر اور اس کی بہن نے وہ وصیت لیٹی کو دکھائی تو اس نے مکمل لاعلمی کا اظہار کیا۔ تاہم انھوں نے لیٹی کو کام سے فوری طور پر فارغ کر دیا۔ لیٹی اس گواہی کے دوران خاموش رہی اور اس کا سر جھکا رہا۔ جیک نے فریزر پر جرح کے دوران ثابت کیا کہ اس نے یہ گواہی سات ہزار پانچ سو ڈالر کے عوض دی ہے۔ اور ان کے درمیان یہ معاملہ ایک ماہ پہلے طے ہوا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کی والدہ کی وصیت کی نقل اس کے پاس محفوظ تھی جبکہ حقیقت میں وہ اسے گمنام

خط کے طور پر ملی تھی۔

لیوسین نے ایک وکیل کے دفتر میں اینسل ہیوبرڈ کے بیان حلفی کو ریکارڈ کرنے کا انتظام کیا۔ ایک عدالتی رپورٹر اور فوٹوگرافر نے اس کے طویل بیان کو مکمل طور پر ریکارڈ کر لیا۔ اس کے بعد لیوسین نے واپسی کے لیے ہوائی اڈے کا رخ کیا اور اینسل نے لیوسین کے ہوٹل کی راہ لی جہاں ایک پولیس والا اس کا منتظر تھا۔

وقفے کے بعد عدالتی کارروائی شروع ہوئی تو ویڈلیفٹر نے ہرشل ہیوبرڈ اور ریمونا ہیوبرڈ ڈیفو کو گواہی کے لیے باری باری پیش کیا۔ دونوں نے سوالات کے رٹے رٹائے جوابات دیے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ وہ اور ان کے بچے سیتھ ہیوبرڈ کے بہت قریب تھے اور ان سے بہت محبت کرتے تھے۔ تاہم جیک کی جرح کے دوران یہ واضح ہو گیا کہ وہ جھوٹ بول رہے تھے۔ جیوری ارکان بھی ان سے زیادہ متاثر نہیں ہوئے۔

وقفے میں لیٹی لینگ نے جیک سے کہا کہ اس کا مسز پکرنگ کی وصیت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ کارروائی کے آخر میں ویڈلیفٹر نے جولینا کنڈ کو گواہی کے لیے بلایا۔ جولینا ایک سیاہ فام عورت تھی جو سیتھ ہیوبرڈ کی ایک فیکٹری میں کام کرتی تھی۔ اس نے بیان دیا کہ اس نے پیسوں کے عوض سیتھ کے ساتھ قربت کی تھی۔ جب اس نے یہ عمل جاری رکھنے سے انکار کیا تو سیتھ نے اسے ملازمت سے برطرف کر دیا۔ جواب میں اس نے سیتھ پر کا مقدمہ دائر کیا اور سیتھ نے کچھ رقم ادا کر کے اس کے ساتھ تصفیہ کر لیا۔ لیفٹر اس گواہ کے ذریعے یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ سیتھ ہیوبرڈ رنگ کے امتیاز کے بغیر اپنی ملازم عورتوں سے تعلق قائم کرنے کا

شائق تھا۔ بدھ کے دن کی کارروائی میں ویڈلیفٹر نے دو زوردار حملے کیے جن سے لیٹی لینگ کی پوزیشن کو نقصان پہنچا اور جیک سخت مایوسی کا شکار ہوا۔

جمعرات کے دن ویڈلیفٹر نے دو ڈاکٹر' ایک ٹیکس وکیل' ایک لینڈ بروکر اور سیتھ کی ہیرنگ لمبر کمپنی کے نائب صدر کو بطور گواہ پیش کیا۔ ان سب نے تصدیق کی کہ سیتھ اپنی شدید بیماری اور دواؤں کے زیر اثر زندگی کے آخری ایام میں اچھی طرح سوچنے سمجھنے کی اہلیت سے محروم ہو چکا تھا اور اس کی یادداشت بھی متاثر تھی۔

جمعہ کی صبح عدالت کے وقت سے پہلے لیوسین الاسکا سے واپس کلینٹن پہنچ گیا اور اپنے ساتھ اینسل ہیوبرڈ کے نوٹری پبلک کے سامنے ریکارڈ شدہ بیان کی کیسٹ لایا۔ جیک اور ہیری ریکس نے دفتر میں وہ کیسٹ سنی اور فیصلہ کیا کہ اس سلسلے میں جج اٹلی سے بات کرنی چاہیے۔ خوش قسمتی سے جج نے کیسٹ سننے کے بعد کہا کہ اس کا تعلق ہیوبرڈ اور لیٹی کے خاندانوں کی تاریخ سے ہے اور اس سے سیتھ ہیوبرڈ کے ارادے کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔ چناں چہ کمرا عدالت میں بڑی اسکرین پر وہ کیسٹ جیوری کو سنوائی گئی۔ اینسل ہیوبرڈ نے اپنے بیان میں کہا:

''تیرہ سال کی عمر میں' میں نے گھر چھوڑ دیا اور بحری فوج میں شمولیت اختیار کر لی۔ میں نے ہر جگہ ڈیوٹی انجام دی۔ جنگ میں بھی حصہ لیا۔ فوج سے فراغت کے بعد میں جاپان' سری لنکا' ٹرینیڈاڈ اور بہت سی دوسری جگہوں پر رہا۔ میں نے دنیا دیکھی۔ میں نے جہاز راں کمپنیوں میں بھی کام کیا۔ جہاں دل چاہا ڈیرا لگا لیا۔ سیتھ' میرا بھائی مجھ سے پانچ سال بڑا تھا۔ ہمارا باپ کلی اون ہیوبرڈ بڑا ظالم اور جابر شخص تھا۔ وہ

ہم سے کھیتوں پر سخت مشقت لیتا اور اکثر مارتا تھا۔ وہ ہماری والدہ کو بھی مارتا۔ ہماری زندگی مشکل اور مصائب سے بھرپور تھی۔

''ہمارے پاس اسی ایکڑ کا خاندانی فارم تھا۔ وہیں ہم ایک پرانے گھر میں رہتے جو میرے دادا نے تعمیر کروایا تھا۔ ہمارے فارم کے ساتھ رنڈز خاندان کا اسی ایکڑ کا فارم تھا۔ رنڈز فارم کا مالک سلوسٹر رنڈز تھا۔ اس کا خاندان وہاں کئی برس سے آباد تھا۔ میں اور سیتھ اپنے باپ سے چھپ کر رنڈز لڑکوں کے ساتھ کھیلنے جاتے تھے۔ ہیوبرڈ خاندان کے لوگ سمجھتے تھے کہ اس زمین پر ان کا حق ہے۔ میرے باپ اور سلوسٹر کے درمیان مقدمہ بازی بھی ہوئی لیکن سلوسٹر کا قبضہ برقرار رہا۔ اس سے کلی اون ہیوبرڈ طیش میں آ گیا۔ وہ یہ برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ ان آزاد سیاہ فام غلاموں کی جائداد اس کے برابر ہو۔ وہ منتقم مزاج' کمینہ اور نفرت کرنے والا شخص تھا۔ ہم اس سے ہمیشہ دہشت زدہ رہتے تھے۔

''ایک دن کلی اون ہیوبرڈ نے تین چار ٹرکوں میں آدمی بلائے۔ یہ غالباً اگست ۱۹۳۰ء کی بات ہے۔ پہلے انھوں نے سلوسٹر رنڈز کو زمین پر گرایا اور اس کو خوب زد و کوب کیا۔ پھر اس کو اٹھا کر ایک کھلے ٹرک کے اوپر پھینکا اور ایک رسہ اس کے گلے میں کس کر باندھ دیا۔ کچھ آدمیوں نے دوسرا سرا چنار کے ایک درخت کی بلند اور موٹی شاخ کے اوپر سے گزار کر کھینچا۔ اس کے پاؤں ٹرک کو چھو رہے تھے۔ پھر انھوں نے ٹرک کو حرکت دی اور سلوسٹر رنڈز اس سے لٹک گیا۔ اس نے تڑپنا شروع کر دیا۔ جلد ہی اس کا جسم ساکت ہو گیا۔

''اس کی بیوی' ایستھر اپنے گھر کے سامنے چیخ پکار کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ چھوٹی بچی تھی جس کے جسم پر کپڑا تھا نہ پاؤں میں جوتی۔ اگلے دن کلی اون ہیوبرڈ دوبارہ وہاں گیا۔ اس نے ایستھر کو چند ڈالر دیے اور اسی ایکڑ اراضی کے بیع نامے پر دستخط کروا لیے۔ پھر اس کے آدمیوں نے رنڈز خاندان کے مکانات نذر آتش کر دیے اور مکینوں کو وہاں سے بے دخل کر دیا۔ تمام رنڈز وہاں سے منتشر ہو گئے۔ ہمیں بعد میں پتا چلا کہ سلوسٹر رنڈز کی ایک ہی اولاد تھی اور اس کا نام لوئی رنڈز تھا۔ ہم نے یہ خوفناک منظر درختوں میں چھپ کر دیکھا۔ ہم گھر آ کر روتے رہے۔ ہم نے اپنے باپ کے خوف سے کسی کو نہیں بتایا۔ میں جب سے گھر سے بھاگا' تو پھر کبھی واپس نہیں گیا۔ نہ میرا کسی سے رابطہ رہا۔ میں اب تک بھاگ رہا ہوں۔ یہ میری کہانی ہے۔''

اینسل ہیوبرڈ کی کہانی سننے کے بعد یکدم عدالت کا ماحول تبدیل ہو گیا۔ جیوری ارکان بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ سیتھ نے ایسا کیوں کیا؟ یہ معما حل ہو گیا۔ سب جان گئے کہ سیتھ نے اس ظلم و زیادتی کی تلافی کرنے کی کوشش کی جو اس کے باپ نے لیٹی کے آباؤ اجداد کے ساتھ کی تھی۔ جیوری ارکان نے متفقہ طور پر سیتھ کی ہاتھ سے لکھی وصیت کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ جمعے کی صبح تک لیٹی لینگ مقدمہ ہار رہی تھی لیکن اینسل کی گواہی نے نقشہ مکمل طور پر تبدیل کر دیا۔ لیٹی بہت جلد فورڈ کاؤنٹی میں امیر ترین سیاہ فام عورت بننے والی تھی۔ وہ اپنے آبائی فارم کی مالک بنے گی جہاں اس کا اپنا گھر ہو گا۔ ساری زندگی کرائے کے گھروں میں رہنے اور دوسروں کے گھروں کی دیکھ بھال کرنے والی لیٹی اب اپنے فارم میں اطمینان اور آسودگی سے بقیہ زندگی گزارے گی۔ (ختم شد)

◆◆◆

تہذیب و تمدن کے اعلیٰ مرکز

علی گڑھ یونیورسٹی کی سنہری یادیں

اس درس گاہ میں بیتے سہانے وقت کے اوراقِ زریں جس نے
مسلمانانِ ہند کو تعلیمی، سیاسی و معاشی پستی سے نکالنے میں اہم کردار ادا کیا

احسن مرزا بیگ

یہ نصف صدی سے قبل کا قصہ ہے کہ مشہور شاعر جان نثار اختر علیگڑھ یونیورسٹی کے طالب علم بنے۔ وہاں کی رومانوی فضا نے ایسا متاثر کیا کہ انھوں نے ایک نظم لکھ ڈالی جس کا عنوان تھا "گرلز کالج کی لاری"۔ دراصل تب یونیورسٹی میں لڑکے لڑکیاں اکٹھے زیرِ تعلیم نہیں تھے یونیورسٹی سے دور میرس۔ روڈ نامی سڑک پر لڑکیوں کا کالج تھا اور ہوسٹل بھی۔ لیکن جو لڑکیاں "ڈے اسکالر" یعنی اپنے گھروں میں مقیم تھیں، انھیں کالج لے جانے کے لیے لاری (بس) استعمال ہوتی تھی۔ اس نظم میں اسی منظر کو رومانی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

یہ رومانوی انداز کس طرح کا تھا، آج کی نئی نسل کو سمجھ میں نہیں آسکتا۔ اس لیے کہ اب دنیا "پریکٹیکل" ہو چکی۔ وہ رومان جیسی بے مقصد اور بے نتیجہ باتوں پر یقین نہیں کرتی یعنی اس "کمشٹری" کی قائل نہیں۔ کچھ عرصہ قبل ایک اسکول میں پوزیشن لینے والے میٹرک کے طلبہ میں کلاسیکل اردو ناول تقسیم کیے گئے۔ ان ناولوں اور کہانیوں میں کچھ رومانوی عنصر بھی تھا۔ چند بچوں کے والدین نے اسکول والوں سے شکایت کر دی۔ ان کا خیال تھا کہ اس قسم کی فضول باتیں دل و دماغ میں رکھنے سے بچوں کا کیریئر تباہ ہو جائے گا۔ بس تفریح کی خاطر ٹیڈی پتلون پہن بڑھتی کمر کر کے کسی گرلز اسکول یا کالج کے سامنے کھڑے رہنا کافی ہے۔

جب کہ علیگڑھ کے لڑکوں کی حد یہی تھی کہ میرس روڈ چلے گئے۔ اگر وہاں بنات النعش نظر پڑی تو قدم خود بخود تیز ہو گئے۔ محسوس ہونے لگا کہ ہم بھی آسمان کے تارے بن چکے۔ اگر چلتے چلتے کسی کی نظر غلط انداز ہم پر پڑی تو معراج پالی اور بس۔ اسی رومان کو بعض لوگوں نے بڑھا چڑھا کر ایسا رنگ دے دیا جو علیگڑھ کی روح کے بالکل خلاف تھا۔ یہ ان لوگوں کا کارنامہ ہے جو اس عظیم درسگاہ سے بیر رکھتے یا علیگڑھ کی روح (اسپرٹ) سے ناواقف تھے۔

علیگڑھ کا ماحول صاف ستھرا رکھنے کے لیے وہاں "کوایجوکیشن" یعنی لڑکے لڑکیوں کا ساتھ پڑھنا ممنوع تھا۔ البتہ ایم اے کی کلاس لینے کے لیے لڑکیوں کو یونیورسٹی آنا پڑتا۔ اُسے بھی ہم "کو" نہیں کہہ سکتے کیونکہ جماعت کے پچھلے حصے میں ایک دروازہ خواتین کے لیے مخصوص تھا۔ اس رخ پر پردہ تان دیا جاتا۔ لڑکیاں پردہ پوش تانگے میں اُدھر ہی سے آتی تھیں۔ پردے کے اندر بیٹھ کر لیکچر سنتیں اور اُدھر ہی سے واپس چلی جاتیں۔

یہ اور بات ہے کہ کوئی لڑکا جملہ یا فقرہ کس دے لیکن اس میں بھی شائستگی قائم رکھنا لازم تھا۔ علیگڑھ یونیورسٹی میں غیر شائستگی اور فحش کوئی غیر علیگیرین کبھی جاتی۔ یونیورسٹی میں ہر سال ایک نمائش ہوا کرتی تھی۔ اس میں میرٹھ کے کباب پراٹھوں کا ایک اسٹال ہوا کرتا۔ اس سے کباب پراٹھے کھانا بھی لڑکوں کی روایت تھا۔ اس نمائش سے متعلق بھی لوگوں نے افسانے گھڑ لیے لیکن وہ بھی سراسر من گھڑت تھے۔ اوّل تو اس میں لڑکے اور لڑکیوں کے جانے کے اوقات مختلف تھے۔ پراکٹوریل مانیٹر خیال رکھتے کہ اوقات کی خلاف ورزی نہ ہونے پائے تاکہ "تصادم" نہ ہو۔

اس میں تھوڑی سی چوری ہو جایا کرتی کہ جانے والیوں کے قدم سست ہوتے اور آنے والوں کے قدم کچھ تیز پڑنے لگتے۔ بس اسی عرصہ میں کچھ "کی وقی" ہوتی وہ بھی شرافت کے دائرے میں! مثال یہ ہے کہ چوڑیوں کی ایک دکان پر کچھ لڑکیاں کھڑی تھیں کہ پیچھے کچھ "اسمارٹ" لڑکے آکر کھڑے ہو گئے۔ دکاندار سے کہنے لگے "بھئی فلاں چوڑیوں کا ایک جوڑا بتا دو۔" اس نے بتا دیا۔

اب بڑھ کر ایک لڑکی نے وہی جوڑا پسند کیا اور اسے دوسری کو پہنا دیا۔ تین چار بار ایسے ہی ہوتا۔ جب دکاندار نے لڑکیوں سے پیسے مانگے تو بولیں "جس نے آرڈر دیا پیسے اسی سے لو۔" یہ کہہ کر وہ تو کھسک گئیں اور لڑکوں کو پیسے بھرنے پڑے۔ یہ تھا مذاق اور صاف ستھرا اور شریفانہ ماحول..... جسے دوبارہ پیدا کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

اسی رومانیت کا شاعرانہ انداز آپ کو سناؤں۔ جب "فردوسِ زمیں" چھوڑنے کا وقت قریب آتا، تو مادرِ علمی چھوڑنے کے غم سے دل پر عالمِ حسرت و یاس چھا جاتا۔ شاعر البیہ اشعار کہہ کر اظہارِ جذبات کرتے۔ ایک بار اسٹوڈنٹس یونین ہال میں جلسہ تھا۔ جاں نثار اختر بھی مع بیاض کے پہنچے۔ ان کی باری آئی تو ہال تمام کے کھڑے ہوئے۔ سامعین بھی ان کے انداز سے بھانپ گئے کہ بڑی جذباتی کیفیت میں ہیں۔ یکا یک ارشاد ارشاد کا شور

بلند ہوا۔ یہ نعرہ لگانے میں لڑکے لڑکیاں، دونوں شامل تھے۔ لڑکیاں دوسری منزل پہ چلمن کے پیچھے بیٹھی تھیں۔

جاں نثار صاحب نے اپنی نظم کا آغاز کیا۔ افسوس مجھے عنوان یاد ہے نہ پوری نظم، صرف چند اشعار ذہن میں ہیں جو دلوں پر نوکِ نشتر کا کام دیتے۔ معذرت کے ساتھ اشعار عرض ہیں...... اگر اجازت دیں تو عنوان اس طرح ہو سکتا ہے۔

"بے گائے ہوئے گیت"

نغمہ سرائی یوں شروع ہوئی:

کبھی ہنگامِ زینت کچھ کہے گا تم سے آئینہ
نظر آنے لگے گا یک بیک اک عکس دھندلا سا
تمھیں اس وقت اک بھولا فسانہ یاد آئے گا
کبھی تک کر کسی ناول کا کونا موڑتی ہو گی
کبھی شغلاً کسی کے خط کے پرزے جوڑتی ہو گی
تمھیں اس وقت اک بھولا فسانہ یاد آئے گا
کبھی جب ریل میں گزرو گی فردوسِ علیگڑھ سے
تمھیں محسوس ہو گا، رہ چکی ہو تم یہاں جیسے
تمھیں اس وقت اک بھولا فسانہ یاد آئے گا

ہمارے اساتذہ

علیگڑھ یونیورسٹی کو بامِ عروج تک پہنچانے میں پروفیسر صاحبان کا بڑا ہاتھ ہے۔ وہ پیسا کمانے سے دلچسپی نہیں رکھتے تھے بلکہ انھیں پڑھنے اور پڑھانے سے عشق تھا۔ پروفیسر حبیب شعبہ تاریخ کے سربراہ تھے۔ جب وہ لیکچر دینے آتے، جماعت میں سناٹا چھا جاتا۔ لڑکے چاہتے تھے کہ وہ بولے جائیں اور ان کے لیکچر کا ایک ایک لفظ اپنے ذہن میں اتار لیں۔ لیکچر ختم کرتے ہی وہ بغلی کمرے میں چلے جاتے۔ خاکسار اتنے تھے کہ خود کوئی کتاب نہیں لکھی۔ لوگ وجہ پوچھتے تو کہہ دیتے کہ میں اس قابل نہیں۔

ان کی شادی بھی علم دوستی کی بدولت ہوئی۔ بمبئی میں ایک خاتون رہتی تھیں۔ انھوں نے اخبار میں چھپوایا کہ جو فلاں موضوع پر سب سے اچھا مضمون لکھے گا، میں اسی سے شادی کروں گی۔ پروفیسر حبیب کو ان کی علم دوستی ایسی پسند آئی کہ اس موضوع پر مضمون لکھ ڈالا۔ فیصلے کے لیے جو بورڈ مقرر ہوا تھا، اسے پروفیسر صاحب کا مضمون ایسا بھایا کہ انھیں "فاتح" قرار دیا...... یوں سہرے کے پھول کھل گئے۔

ایک اور پروفیسر صاحب تھے، ڈاکٹر ہادی حسن! یوں تو وہ شعبہ فارسی کے سربراہ تھے لیکن انھوں نے معلوم نہیں کتنے مضامین میں پی ایچ ڈی کر رکھی تھی۔ علیگڑھ کا ایک "ٹریڈیشن" یہ تھا کہ سال میں کم از کم ایک دفعہ کسی عظیم شخصیت کو مدعو کیا جاتا۔ ہال میں ان کی تقریر ہوتی۔ ایک بار ماہرِ سنسکرت اور بنارس یونیورسٹی میں شعبہ سنسکرت کے سربراہ تشریف لائے۔ ان کے لیکچر کا موضوع کا مشہور ڈراما "شکنتلا" تھا۔

پنڈت جی اپنی تقریر جاری رکھے ہوئے تھے کہ ڈاکٹر ہادی حسن اُٹھ کھڑے ہوئے۔ انھیں کوئی نکتہ نہ بھایا اور اس پر کچھ ناگواری کا اظہار کیا۔ پنڈت جی کو برا محسوس ہوا تو ڈاکٹر صاحب نے وضاحت کی اجازت چاہی۔ پنڈت جی نے اجازت دے دی۔ ڈاکٹر صاحب کھڑے ہوئے اور دو گھنٹے "شکنتلا" پر بولتے چلے گئے۔ پنڈت جی ان کی اس قابلیت پر حیرت کا پتلا بنے بیٹھے رہے اور اپنی کوتاہی کا اعتراف کر لیا۔

ڈاکٹر ہادی حسن کی شادی بھی عجیب انداز میں ہوئی۔ بیمار پڑے تو علاج کے لیے بمبئی گئے۔ ایک پرائیویٹ وارڈ میں مقیم تھے۔ جب صحت یاب ہوئے تو

نرس سے کہا "تم نے بڑے خلوص اور محنت سے میری تیمارداری کی، اس لیے چاہتا ہوں کہ تمھیں تحفہ دوں۔ مگر یہ تحفہ تمھاری مرضی اور پسند کا ہو گا۔ تم مانگو تو میں دوں۔"

نرس نے کہا "کیا جو مانگو سو پاؤں؟"

انھوں نے کہا "ہاں بھئی، جو مانگو گی وہی دوں گا۔"

"تو پھر میں آپ سے آپ ہی کو مانگتی ہوں۔"

ڈاکٹر صاحب اس غیر متوقع "مانگ" پر حیران رہ گئے۔ مگر وعدہ کر چکے تھے، بولے "ٹھیک ہے۔" یوں وہ نرس ان کی شریکِ حیات بن گئیں۔

ڈاکٹر صاحب کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ کوئی بھی مضمون ہو، وہ طلبہ کے سوالات کا جواب دینے کے لیے تیار رہتے۔ ایک دفعہ دیکھا کہ فرسٹ ایئر کے لڑکے کو نہایت ہمدردی کے ساتھ ٹہلاتے ہوئے نصاب سمجھاتے جاتے ہیں۔ لڑکا آسام سے آیا تھا۔ علیگڑھ کے عالمانہ ماحول سے کتابیں پڑھنے کا دلدادہ ہو گیا۔ ابھی "کچے" دماغ کا تھا لہٰذا ایک سوال نے اس کا دماغ ماؤف کر دیا۔ وہ ہر ایک سے بحث کرنے لگا کہ وقت لافانی ہے اور اللہ بھی لافانی۔ لہٰذا وقت ہی خدا ہے اور خدا ہی وقت۔ لیکن جوں جوں اسے سمجھاتے، اس کے وہم میں اضافہ ہونے لگتا۔ یہاں تک کہ اس کی دماغی حالت خطرناک حد تک پہنچ گئی۔ اس نے کہنا شروع کر دیا "اگر یہ معمہ حل نہ ہوا تو میں خودکشی کر لوں گا۔"

علیگڑھ کی ایک روایت یہ بھی تھی کہ لڑکوں کو کچھ دریافت کرنا ہوتا تو استاد کے گھر چلے جاتے اور بے تکلف سوال کرتے۔ اساتذہ بھی انکار نہ کرتے۔

اب لڑکے اس کی نگرانی کرنے لگے۔ وہ وی۔ ایم ہال ہوسٹل میں رہتا تھا۔ ایک رات نظر نہ آیا تو لڑکوں کو تشویش ہوئی۔ ہوسٹل کا ایک ایک کمرا ڈھونڈ مارا۔ سوئی بھی ہوتی تو مل جاتی مگر اس کا کوئی نشان نہ پایا۔ ہوسٹل کے پیچھے سے ریل کی پٹڑی گزرتی تھی۔ وقت ریل کے گزرنے کا تھا۔ لڑکوں کے دل میں کھٹکا پیدا ہوا، ہو نہ ہو وہ خودکشی کرنے گیا ہے۔ یہ خیال آتے ہی لڑکے پٹڑی کی طرف بھاگے۔

ان کا خیال صحیح ثابت ہوا...... وہ صاحبزادے آنکھیں بند کیے پٹڑی کو تکیہ بنائے ریل کا انتظار کر رہے تھے کہ کہ شاید جو معمہ یونیورسٹی کے پروفیسر حل نہ کر سکے، وہ ریلوے انجن کا ڈرائیور حل کر دے۔ عین موقع پر لڑکوں کی نظر پڑ گئی اور اس تلاشِ حق کے متوالے کو ریل کی زد میں آنے سے بچا لیا۔ اس کے والد کو ساری صورت حال سے آگاہ کیا تو وہ اسے گھر لے گئے۔

ایک اور ڈاکٹر صاحب (نام یاد نہیں) شعبہ عربی کے سربراہ تھے۔ ان کا معمول تھا کہ نمازِ مغرب کے بعد گھر سے نکلتے اور ہوسٹل کے درمیان سے گزرتے۔ لڑکوں کو اگر کچھ دریافت کرنا ہوتا، تو کھڑے ہو جاتے۔ جب تک لڑکے مطمئن نہ ہوتے، وہ آگے نہ بڑھتے۔ یہ روزانہ کا معمول تھا۔ اس قدر اچھے انسان تھے کہ اللہ نے انھیں وقت سے پہلے بلا لیا۔ ان کی بیگم کو جو یورپی خاتون تھیں، جدائی برداشت نہ ہو سکی۔ انھوں نے زہر کھا لیا۔ لیکن اللہ نے اس وقت انھیں بلانا مناسب نہ سمجھا اور دنیا میں رہنے کی تھوڑی اور مہلت دے دی۔

اساتذہ کے دلوں میں شاگردوں کے لیے اتنا خلوص تھا کہ وہ کبھی کبھی طنز و مزاح سے بھی کام لیتے۔ علیگڑھ کی ایک روایت یہ بھی تھی کہ لڑکوں کو کچھ دریافت کرنا ہوتا تو استاد کے گھر چلے جاتے اور بے تکلف سوال کرتے۔ اساتذہ بھی انکار نہ کرتے۔

آہ کیا دنیا تھی جو چھوٹ گئی...... علیگڑھ یونیورسٹی میں

بیتے وقت کی یادیں اکثر دل کو تڑپاتی ہیں۔ سب سے زیادہ افسوس یہ ہے کہ اس مرکزِ علم وفن کو میں نے اتنی جلد کیوں چھوڑ دیا؟ میں نے "فن" کا لفظ یوں استعمال کیا کہ اس مادر درسگاہ میں علم کے ساتھ شعبہ زندگی کو پروان چڑھانے کی صلاحیتیں اور مواقع بدرجہ اتم موجود تھے۔ انسان وہاں رہ جاتا تو کندن بن کے نکلتا۔ مگر یہ منزل پانے کے لیے چار سال کا عرصہ ناکافی تھا۔

یونیورسٹی طالب علم کی شخصیت کو تناور درخت بنا دیتی لیکن اس میں پھول آنا اور پھل لگنا چار سال بعد شروع ہوتا۔ کئی لوگ تو اس سے بھی سیر نہیں ہوتے۔ پھل کھانے کے بعد ان کی بھوک بڑھ جاتی۔ وہ بہانے بنا بنا کر اس سنہرے دور کو بڑھاتے رہتے۔ جن لوگوں کو اللہ نے معاش کے معاملے میں تنگی رکھا تھا، امتحان سے دو مہینا پہلے ان پر پڑھائی کا بھوت سوار ہوتا۔ وہ گھروں کا رخ کرتے اور سال شروع ہونے پر پھر آجاتے...... یہ لوگ "لارڈ" کہلاتے تھے۔

میں نے پڑھائی کا بھوت سوار ہونا اس لیے لکھا کہ جب امتحان ہونے میں مہینا ڈیڑھ مہینا رہ جاتا تو اسے پاس کرنے کا فیصلہ کرنے والے لڑکے اپنے کمرے کا فرنیچر ایک طرف رکھتے، بستر زمین پہ بچھاتے اور ان پر کتابیں و نوٹس پھیلا دیتے۔ اب تین چار کا گروہ اعتکاف میں بیٹھ جاتا۔ پڑھتے پڑھتے تھک جاتے تو باری باری ایک ایک لڑکا کمرے ہی میں چائے بناتا اور سب کو پلاتا۔ یوں کہہ لیں کہ کتابوں کی شامت آجاتی۔ یہاں تک کہ شیو بھی اسی دن کرتے جب پرچہ دینے امتحان ہال جاتے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ پڑھائی میں بھی کسی سے پیچھے نہ رہتے۔

یہ حال تو "اریگولر" رہنے والوں کا تھا۔ لیکن بڑی تعداد ریگولر پڑھنے والوں کی بھی تھی۔ ایسے "پڑھاکو" طلبہ کے لیے یونیورسٹی میں ایک اور انتظام تھا۔ آفتاب نامی ہوسٹل کی خصوصیت یہ تھی کہ اس کے کمرے "سنگل" تھے۔ یعنی ایک کمرے میں ایک ہی لڑکا رہتا۔ مگر یہ صرف "فرسٹ ڈویژن" والوں کو ملتا تھا تاکہ وہ سکون سے اپنی پڑھائی میں منہمک رہ سکیں۔

ایک لیکچرار قاری محمود کہلاتے تھے۔ وہ شیکسپیر (شیخ پیر) کے ڈرامے پڑھاتے۔ جب میں یونیورسٹی پہنچا اور ان کی بابت معلوم ہوا، تو اپنے ایک دوست سے کہا "ارے یہ حافظ ہیں مگر شیکسپیر کے ڈرامے پڑھاتے ہیں۔ تعجب ہے!"

وہ ہنسا اور کہا "وہ حافظ قرآن تھوڑی ہیں۔"

میں نے تعجب سے پوچھا "پھر"

بولا "وہ شیکسپیر کے ڈراموں کے قاری ہیں۔"

میرے منہ سے بے ساختہ نکلا "اوہ"۔

جب میں نے ان کی جماعت لی تو معلوم ہوا کہ انھیں یہ لقب کیوں ملا۔ جب وہ پڑھاتے تو ڈراما میں کھو جاتے۔ کبھی کرسی سے اٹھ کر میز پہ بیٹھتے، پھر آدھے لیٹ جاتے۔ اتنے محو ہوتے کہ عموماً سگریٹ جوتے کے بجائے پتلون سے بجھاتے۔

علیگڑھ میں اخلاقی اور دینی اقدار کا خاص خیال رکھا جاتا۔ جو اہم شخصیات مدعو کی جاتی تھیں، ان میں علما بھی شامل ہوتے۔ ایک مرتبہ نواب بہادر یار جنگ تشریف لائے اور زبردست تقریر کی۔ لڑکے بہت متاثر ہوئے۔ خاص بات یہ تھی کہ انھوں نے طلبہ کو دیکھ کر کہا "آپ لوگ سیرۃ النبیؐ ضرور پڑھیں اور اپنی زندگی کو اس سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کریں۔"

یونیورسٹی کی طرف سے اس سلسلے میں ایک اور عمدہ انتظام اور تھا۔ وہ یہ کہ مرکزی جامع مسجد کے علاوہ ہر ہوسٹل میں ایک کمرا نماز کے لیے مخصوص ہوتا۔ نیز ایک لڑکا نماز مانیٹر مقرر کیا جاتا۔ اس طرح لڑکوں کو علم کے

ساتھ ساتھ دین واخلاق بھی سیکھنے کا موقع ملتا۔ ان تینوں خصوصیات کے بغیر انسان کی شخصیت مکمل نہیں ہوتی۔

۱۸۵۷ء میں جب اسلامی حکومت ختم ہوئی تو سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں کا ہوا۔ دیگر اقوام نے بدلے حالات کے مطابق جدید تعلیم کو اختیار کر لیا اور انگریزوں کی نوازشوں سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ مسلمان سب سے پیچھے رہنے لگے۔ تب ایک دیدۂ بینا حالات بھانپ گئے۔ انھوں نے مسلمانوں کو آگے لانے کا علاج یہ تجویز کیا کہ ان کو بھی جدید تعلیم سے بہرہ ور کیا جائے۔ لیکن بعض جذباتی مسلمان خم ٹھونک کر باہر نکل آئے اور عام مسلمانوں سے کہا کہ سرسید تمھارے بچوں کو "عیسائی" بنانا چاہتے ہیں۔ سرسید بھی دھن کے پکے نکلے۔ بقول حالی کے ۔

وہ بھلا کب کسی کی مانیں ہیں
بھائی سید تو بس دوانے ہیں

کم ہی لوگ جانتے ہیں کہ سرسید دلی میں مدرسہ قائم کرنا چاہتے تھے۔ لیکن سخت مخالفت ہوئی تو کہیں اور جگہ تلاش کرنے لگے۔ علیگڑھ کے کچھ مخیر اور قوم کا درد رکھنے والوں نے ان کی مدد کی۔ چناں چہ وہ اسی شہر میں ایک مدرسہ بنانے میں کامیاب ہوگئے۔

اب سوال اخراجات کا آیا تو سرسید نے قوم سے چندے کی اپیل کی۔ اس راستے میں بھی لوگوں نے روڑے اٹکائے۔ سرسید یوپی کے ایک شہر چندہ مانگنے گئے۔ وہاں مسلمانوں نے کہا کہ آپ کو یہاں سے پھوٹی کوڑی نہیں ملے گی۔ ہاں اگر آپ فلاں صاحب سے چندہ لینے میں کامیاب ہوجائیں تو تمام مسلمان آپ کو چندہ دیں گے کیونکہ وہ انہی کے کہنے پر چلتے ہیں۔

سرسید فوراً ان صاحب کے پاس حاضر ہوئے اور چندے کا سوال کیا۔ انھوں نے ٹکا سا جواب دیا۔ مگر سرسید ماننے والے کہاں تھے، دھرنا دے کر دروازے کے سامنے بیٹھ گئے کہ چندہ لے کر ہی جاؤں گا۔ ہر چند انھوں نے ڈرایا دھمکایا کہ چلے جاؤ، مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ یہاں تک کہ ان صاحب کو غصہ آگیا۔ کہنے لگے "لاؤ ہاتھ، میں چندہ دیتا ہوں۔" سرسید نے ہاتھ پھیلایا۔ انھوں نے منہ بھر کے تھوک دیا۔

سرسید ہتھیلی پر وہ تھوک لیے شہر کے مرکزی چوک پر جا کھڑے ہوئے اور مسلمانوں سے پکار کر کہا "لو میں ان صاحب سے چندہ لے آیا ہوں۔ اب اپنی شرط پوری کرو۔" لوگ اس قدر متاثر ہوئے کہ سرسید کی جھولی نوٹوں سے بھر دی۔

سرسید کا یہی خلوص اور استقلال رنگ لایا۔ علیگڑھ اسکول پہلے کالج بنا اور پھر یونیورسٹی کا روپ دھار کر ہندوستان کے مسلمانوں کی پہچان بن گیا۔

اس کے بعد دوسرا دیدۂ بینا پیدا ہوا جس نے علیگڑھ یونیورسٹی کو اسلامی مملکت کے حصول کا ہراول دستہ بنا لیا۔ مسلم لیگ شباب پر آگئی۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے علیحدہ مملکت کا مطالبہ اپنے عروج پر پہنچا، تو قائداعظم کی مصروفیت اس قدر بڑھ گئی کہ کسی کو ملاقات کا وقت دینا بڑا مسئلہ بن گیا۔ لیکن تب بھی ان کا حکم تھا، علی گڑھ یونیورسٹی کا کوئی لڑکا مجھ سے ملنے آئے تو بغیر روک ٹوک ملاقات کرائی جائے۔

ایک دن قائداعظم کی آمد کی خبر سن کر سیکڑوں لڑکے ریلوے اسٹیشن پر جمع ہوگئے۔ قائد کو یونیورسٹی لے جانے کے لیے دو گھوڑوں کی بگھی سجائی گئی۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ راستہ بھر کہیں تل دھرنے کی جگہ نہیں، بگھی چلے گی کیسے؟ لڑکوں نے نعرہ لگایا "کھول دو گھوڑے، ہم کندھوں پر رکھ کر بگھی لے جائیں گے۔" محبت اور احترام کا یہی لافانی جذبہ تھا جس نے مسٹر محمد علی جناحؒ کو قائداعظم بنا دیا۔

◆◆◆

جنوب مغربی افریقا کے ساحل پر پھیلا

ہیروں کا نرالا دیس

بیش قیمت پتھروں والے انتہائی قیمتی علاقے کی داستانِ عجب
جہاں اتنی سخت سیکیورٹی ہے کہ پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا

فرزانہ نکہت

آپ نے جوہریوں کی دکانوں پر ہیرے دیکھے ہوں گے۔ حسین تراشیدہ رنگا رنگ اور حیرت انگیز آب و تاب والے ہیرے..... ہر سائز و صورت کے۔ گول، تکونے، چکور، مستطیل، ہشت پہلو تراشیدہ ہیرے۔ جنھیں دیکھ کر بے ساختہ منہ سے سبحان اللہ نکلتا اور اللہ تعالیٰ کے عظیم صانع ہونے کا رعب دار تاثر دل میں جاگزیں ہو جاتا ہے۔

ہیرا واقعی اس ذاتِ یکتا کی کاریگری، صناعی اور اُس کی قدرت کا ایک شاندار، حسین ترین نمونہ اور شاہکار ہے۔ آج تک جتنے بھی نقلی ہیرے بنائے گئے ہیں وہ کسی بھی لحاظ سے اصلی ہیروں کے پاسنگ نہیں، نہ ہی وہ ایسی قدر و قیمت پاتے ہیں۔

گزشتہ صدیوں میں بے شمار ملکوں سے ہیرے نکالے گئے۔ ان میں چین اور لاطینی امریکا کے ممالک قابل ذکر ہیں۔ پھر دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی ہیروں کی کانیں دریافت ہوئیں۔ بھارت میں بھی گولکنڈہ کی کانوں سے عرصہ دراز تک ہیرے نکلتے رہے۔ اب سب سے زیادہ ہیرے جنوبی افریقا اور نمیبیا میں نکل رہے ہیں یعنی اس علاقے میں جو جنوب مغربی افریقا کہلاتا ہے۔

علاقے میں ہیروں کا دریافت ہونا بھی یادگار لمحہ تھا۔ یہ ۱۹۰۸ء کا سال تھا اور اس زمانے میں سارا جنوب مغربی افریقا جرمن نو آبادی تھا۔ ایک ٹرک ڈرائیور کو سڑک کنارے کچھ چمکتے ہوئے پتھر دکھائی دیے۔ اس نے جب انھیں ہاتھ میں لیتے ہوئے بغور دیکھا تو سمجھ گیا کہ وہ ہیرے ہیں اصلی ہیرے! اس انتہائی قیمتی اور حیرت ناک دریافت کی اطلاع برلن بھجوا دی گئی جہاں سے فوراً اس علاقے کو ''علاقہ ممنوعہ'' قرار دیے جانے کا حکم آ گیا۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد اس علاقے میں کان کنی کے حقوق ڈی بیرز گروپ نے خرید لیے۔ اب سیکیورٹی والے اس تمام علاقے میں دور دور تک اونٹوں پر گشت کرتے پھرتے اور علاقے سے باہر نکلنے والے ہر شخص کی خوب اچھی طرح تلاشی لیتے ہیں۔ آج ڈی بیرز اور حکومت نمیبیا کی پارٹنرشپ ''نمذب'' کے زیرِاہتمام ''ڈائمنڈ کوسٹ'' نامی علاقے سے ہیرے نکالے جا رہے ہیں اور حفاظتی انتظامات پہلے سے بھی زیادہ سخت ہو چکے۔

ہیرے کی تاریخ

اس علاقے میں واقع قصبے اورنجمنڈ میں چار ہزار کارکن اور ان کے خاندان سفید بنگلوں میں رہائش پذیر ہیں۔ اس کے چاروں طرف خاردار تاروں کی باڑ لگی ہے اور جا بجا چار زبانوں میں بورڈ لگے ہیں: ''بغیر اجازت داخلہ منع ہے.....''

قصبے کی سڑکوں پر پک اپ ٹرک اور شتر مرغ بالعموم دوڑتے نظر آتے ہیں۔ تیز و تند گرم ہواؤں کے جھکڑ ہر دم چلتے رہتے ہیں۔ اکثر اوقات سڑکوں اور دور دور تک پھیلے میدانوں میں گیدڑوں کے غول شکار کی تلاش میں بھٹکتے دکھائی دیتے ہیں۔ گرد و پیش کی پہاڑیوں میں لگڑبھگڑ بھی ہیں۔ وہاں سے رخصت ہونے والے جرمنوں کے گھر ریتلے طوفانوں کے باعث آہستہ آہستہ ریت میں دفن ہو رہے ہیں۔

ڈائمنڈ کوسٹ سے نکالے جانے والے ہیروں کی تراش خراش کا عمل اربوں سالوں پر محیط ہے۔ خیال ہے کہ اس علاقے میں سو میل کی گہرائی میں ایک نرم چٹان تلے کاربن کا وسیع ذخیرہ انتہائی دباؤ کے ساتھ گرم ہوا اور مسلسل دباؤ اور حرارت کے زیرِاثر ہیروں میں تبدیل ہو گیا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ فی صدی کاربن ایک انچ کے حساب سے آگے سرکتا رہا یہاں تک کہ کروڑوں سال بعد ایک زبردست آتش فشانی انفجار نے اسے دریائے اورنج میں دھکیل دیا۔ اگلے حتر کروڑ سال تک یہ سمندر میں لڑھکتا رہا۔ پھر پے در پے برپا ہونے والے زبردست سمندری طوفانوں نے اسے ساحل پر لا پٹخا جہاں وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور یہ ٹکڑے ریت کی تہوں میں دبتے چلے گئے۔ انھی ٹکڑوں نے ہیروں کی شکل اختیار کر لی۔

علاقہ غیر میں

رہائشی علاقے سے خاصی دوری پر ایک عظیم ریتلے ٹیلے کے گرد چکر لگائیں، تو ایک اور باڑ آتی ہے۔ یہ پہلی روک پر بنی قدرے نیچی باڑ سے خاصی مختلف ہے۔ اور اس کا مطلب ہے کہ یہاں کام ہو رہا ہے۔ وہاں بلند تیز دھار دو متوازی تاریں معتدد کی پہیلی مختلف سمتوں میں جا کر نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔ ان کے درمیان ''علاقہ

غیر" جو سو گز چوڑا ہے اُسے مسلسل ہموار کیا جاتا رہا ہے تاکہ اس پر قدموں کے نشانات ثبت ہو سکیں۔ اس علاقے میں دن رات انفراریڈ کیمرے نقل و حرکت نوٹ کرنے کے آلات، ریڈار اور مسلح گشتی دستے مصروف کار رہتے ہیں۔

اسی باڑ کے اندر پاسٹھ میل لمبی اور تین میل چوڑی ساحلی پٹی واقع ہے۔ یہ مائننگ ایریا (کان کنی) نمبر ایک ہے۔ یہاں ہیروں کی تلاش کا کام ہوتا ہے۔ یہیں کنکریٹ کی بنی ہوئی عمارت میں پڑتالی چوکی واقع ہے۔ اندر داخل ہونے والوں کی سختی سے تلاشی لی جاتی ہے اور کسی کو کیمرا ساتھ لے جانے کی بھی اجازت نہیں کہ وہ ان میں کہیں ہیرے ڈال لیں۔ اس ممنوعہ علاقے میں اگر کوئی گاڑی داخل ہو جائے تو وہ وہیں ریت میں دھنستی رہے گی کیونکہ اس میں چوری شدہ ہیرے تلاش کرنے کا کام انتہائی مہنگا پڑتا ہے۔

جب کوئی اجنبی ڈائمنڈ ایریا نمبر ون میں داخل ہو تو وہ وہاں کھدائی کرنے والی دیوپیکر مشینوں، چیختے چنگھاڑتے انجنوں، آنکھوں کو چندھیا دینے والی روشنیوں، مصری اہراموں جیسے ریت کے دیوہیکل ٹیلوں اور ان کے نیچے پتھروں کی توڑ پھوڑ اور گرد و غبار کے مہیب بادلوں کا نظارہ کرتا ہے۔

اس ویرانے میں ہیروں کی تلاش معجزہ ہی ہے۔ ایک ایک ہیرا انتہائی محنت، جانکاری اور مدتوں کی تلاش کے بعد ہی دستیاب ہوتا ہے۔ ایک کارکن کے بقول "ان بارہ سالوں میں میں نے کبھی ایسا ہیرا نہیں دیکھا جو پہلے ہی کسی کے ہاتھ لگ چکا ہو۔"

اعلیٰ معیار کے ہیرے

جب ڈائمنڈ کوسٹ پہلی مرتبہ دریافت ہوا، تو مزدوروں کی قطاریں ہاتھوں میں فولادی چمٹیاں لیے پیٹ کے بل رینگتی ہیرے اکٹھے کرتی نظر آنے لگیں۔ سب مزدوروں کے منہ میں کپڑے ٹھنسے ہوتے تاکہ وہ ہیرے اپنی پشت پر بندھے تھیلے میں ڈالنے کے بجائے اپنے منہ میں نہ ڈال لیں۔

وہ دن اب عرصہ ہوا گزر چکے۔ اب ہیرے کھردری چٹانی سطح کو ڈھانپنے والی بجری سے چھے سات فٹ نیچے تلاش کیے جاتے ہیں۔ لیکن یہ بجری بھی ساٹھ فٹ گہری نرم ریتلی تہہ سے ڈھکی ہوئی ہے۔ اس ریت کو ہٹا کر بجری تک پہنچنا مشکل ترین اور جان جوکھوں کا کام ہے۔ یہی ریت سمندر کو اس تحتی چٹان (Bed rock) کی طرف چڑھ آنے سے بچانے کے لیے بطور پشتہ استعمال ہوتی ہے۔

روزانہ قریباً ساڑھے تین صد بوجھ بردار ٹرک، کھدائی کرنے والی مشین، بلڈوزر، گریڈرز اور چٹانیں توڑنے والی مشینیں ڈیڑھ لاکھ ٹن ریت اس تحتی چٹان پر سے ہٹاتی ہیں۔ یہ ریت ایک میدان میں ڈھیر کی جاتی ہے۔ ایک ہی سال میں یہ ڈھیر ڈھائی میل کی بلندی تک جا پہنچتا ہے۔ اس عرصہ میں تیس ملین ٹن بجری کھودی اور ٹرکوں پر لاد کر کرشنگ کے لیے بھجوا دی جاتی ہے۔

ڈائمنڈ کوسٹ دنیا کی کسی بھی کان کے مقابلے میں پست درجہ رکھتی ہے۔ وہاں ہر ایک سو ٹن بجری ہٹانے پر فقط ۰.۷ قیراط ہیرے نکلتے ہیں۔ لیکن یہ اعلیٰ معیار کے ہیرے ہوتے ہیں جن کی قیمت فی قیراط ساڑھے تین سو ڈالر ہے۔ یعنی ان کا تقابل آسٹریلیا میں ارگائل کے مقام سے نکلنے والے ہیروں سے کیا جا سکتا ہے۔ ارگائل دنیا میں سب سے بڑی ہیرے کی کان ہے۔

ہیرے شروع ہی سے لوگوں کو چوری کرنے پر اُکساتے چلے آ رہے ہیں۔ ایک ماچس کی ڈبیا بھر ہیرے کسی کو کروڑ پتی بنانے کے لیے کافی ہیں۔ ڈائمنڈ کوسٹ میں لوگوں نے انھیں حاصل کرنے کے لیے جھوٹ بولے، دھوکا بازی کی۔ حتیٰ کہ قتل بھی کیے۔ آج قریباً ڈھائی سو مسلح مرد اور عورتیں ہیروں کی ممکنہ چوری کو روکنے کے لیے وہاں تعینات ہیں۔

ہیروں کی چوری سالہا سال سے جاری ہے۔ اس پر قابو پانے کے لیے حکومت نمیبیا جدید ترین طریقوں پر سالانہ تین کروڑ ڈالر خرچ کر رہی ہے جس کا مثبت نتیجہ سامنے آیا ہے۔

اس علاقہ ممنوعہ میں چار صد کے لگ بھگ جاسوس کیمرے نصب ہیں۔ ان کیمروں سے ہر مزدور کی نقل و حرکت اسکرین پر دیکھی جا سکتی ہے۔ آپریٹروں کو مشکوک حرکات و سکنات پرکھنے کی تربیت دی جاتی ہے۔ مثلاً اگر کسی شخص نے کیمرے کی طرف پشت کر رکھی ہو یا وہ کن انکھیوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا ہو تو وہ مشکوک قرار پاتا ہے۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ ایک ٹرک یونہی کیمروں کے سامنے آ کھڑا ہوا جس سے وہ منظر چھپ گیا جہاں چند مزدور ہاتھوں میں ہیرے لیے ہوئے تھے۔ انھیں معلوم نہیں تھا کہ دوسرے زاویے پر نصب کیمرا ان کی تمام نقل و حرکت دیکھ رہا تھا۔

حد تو یہ ہے کہ نگرانوں کی بھی "جاسوس کیمروں" کے ذریعے نگرانی کی جاتی ہے، یہ دیکھنے کے لیے کہ مبادا انھیں چشم پوشی کے لیے رشوت تو نہیں دی گئی۔ خفیہ مقامات پر متعین نگران، نگرانوں پر نظر رکھتے ہیں اور خود ان پر بھی نظر رکھی جاتی ہے۔

دو دلچسپ واقعات

ہیرے چوری کرنے کے لیے ہر قسم کے ممکنہ قابل تصور طریقے آزمائے جا چکے۔ ایک بار نامین نیل نامی چالیس سالہ سکیورٹی افسر اپنے دفتر کے باہر کھڑا تھا جب اس نے ایک کبوتر کو تھکی ہاری حالت میں چھت پر پھڑپھڑاتے دیکھا۔ اس نے جب اُسے پکڑنے کی کوشش کی تو وہ انتہائی سست انداز میں اُڑ کر دوسری چھت پر جا بیٹھا۔ نگرانوں نے اس کا تعاقب کیا اور اسے اورنجمنڈ کے ایک گھر کی چھت پر بنے کمرے کے کھلے دروازے میں داخل ہوتے دیکھ لیا۔ جب وہ اس کمرے میں داخل ہوئے تو کبوتر ایک الماری پر بیٹھا تھا۔ اس کی پشت پر چھوٹی سی تھیلی بندھی تھی جس میں سے ہیرے نکل آئے!

سب سے زیادہ اعصاب شکن کہانی ان دو چوروں کی تھی جنھوں نے باڑ میں سے اپنا راستہ بنایا اور ریت کے طوفان میں غائب ہو گئے۔ نگرانوں کو کوشش کے باوجود اُن کا سراغ نہ مل سکا۔ اگلے دن دوسرے جاسوسوں نے اپنی گاڑیوں میں اُن کی تلاش میں تیس میل تک کا علاقہ کھوج ڈالا لیکن انھیں بھی کوئی سراغ نہ ملا۔ وہ ابھی مایوسی کے عالم میں تھے کہ قریب ہی ایک جگہ سے یکدم دونوں چور ریت سے برآمد ہوئے۔ اُنھوں نے چہروں پر کپڑا لپیٹ کر خود کو ریت میں دفن کر رکھا تھا۔ جب لینڈ روور کی آواز اُن کے کانوں میں گونجی تو اس خوف سے "مردے" باہر نکل آئے کہ کہیں وہ پہیوں تلے کچلے نہ جائیں۔

کان سے باہر نکلنے والے ہر شخص کا سر تا پا ایکس رے لیا جاتا ہے۔ ایکس رے میں ہیرے سیاہ دھبوں کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ یہ شیونگ برش، جینز، جز چابیوں کے گچھوں وغیرہ میں چھپائے جا سکتے ہیں۔ انھیں رنگ کر رنگین موتیوں کی شکل دے تسبیح یا اسی قسم کی کوئی چیز بھی بنائی جاتی ہے۔ انھیں نگلا اور جسم کے مختلف حصوں میں

چھپا بھی لیا جاتا ہے۔ ایسے ہی ایک اسمگلر کی نشاندہی یوں ہوئی کہ اس کے لڑکے کے اُستاد نے اسے یہ دکھانے کی خاطر کہ ریت سے ہیرے کیسے نکالے جاتے ہیں' رنگارنگ پتھروں کو ریت میں دبا دیا۔ اس پر وہ لڑکا کہنے لگا "یہ ہیرے نہیں...... میں انھیں پہچانتا ہوں۔ میرے پاپا اصلی ہیرے لاتے ہیں۔"

تختی چٹان پر سے بجری ہٹانا شعبہ کان کنی کا حساس ترین مرحلہ ہے۔ ریتلے بند کے عقب میں تختی چٹان کا پھیلاؤ ہتھوڑوں کی طرح ضرب میں مارتی موجوں کی سطح سے ساٹھ فٹ نیچے ہوتا ہے۔ اس جگہ سیر کرنے والوں کو وہاں ایک ٹرک جتنے ویکیوم کلینر پانچ ٹن وزنی ڈسٹ بیگ جن میں بڑے بڑے تالے لگے ہوتے ہیں اور درکشی کے بڑے بڑے پائپ بکھرے دکھائی دیتے ہیں۔

ہر پائپ کے سرے پر دو آدمی ہوتے ہیں جنھیں بیڈراک کلینر کہتے ہیں یعنی تختی چٹان کا عملہ صفائی۔ وہ اونی کنٹوپوں اور نیلے کوٹوں میں ملبوس ہوتے اور بیلچوں' آنکڑوں اور عام گھریلو جھاڑوؤں کی مدد سے بجری صاف کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں اگر کسی کا کنٹیکٹ لینز بھی گم ہو جائے تو وہ ضرور مل جائے گا۔

اس جگہ سے دو سو گز کی دوری پر ایک بڑا ٹرائی پوڈ کیمرا نصب ہے جس کی مدد سے جاسوس ہر آدمی کی نقل و حرکت کا جائزہ لیتے رہتے ہیں۔ مشکوک فوراً ہی دھر لیا جاتا ہے۔

تختی چٹان سے نکلنے والی بجری کو دیوہیکل پیمائش مشینوں میں ڈالا جاتا ہے۔ ان میں چھلنیاں اور تیزی سے گھومنے والے پلڑے نصب ہوتے ہیں۔ بجری کا ننانوے فی صد حصہ جو قدرے موٹا ہوتا ہے' فوراً الگ ہو جاتا ہے۔ بقیہ میں سے ہیرے تلاش کیے جاتے ہیں۔

ان ہیروں کو پھر بھاری بھرکم ٹینکروں میں مہر بند حالت میں سنٹرل ریکوری پلانٹ بھیج دیا جاتا ہے۔

تیز چمکتی تاروں کی قطاروں سے پرے کیمروں کی آنکھوں کے سامنے لگے طاقتور ترین مقناطیسی بلاک ہر کھنچی جانے والی چیز کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ جو کچھ بچ رہے' اس پر ایکس رے شعاعیں ڈالی جاتی ہیں جن سے ہیرے اور کچھ دوسرے اجزا ڈسکو روشنیوں کی طرح چمکنے لگتے ہیں۔ تب ایک آلہ ہوا مار کر ان ہیروں کو دوسرے خانے میں منتقل کر دیتا ہے۔

اٹھارہ انچ موٹی دیواروں سے بنے ہوئے تہرے مقفل دروازوں سے گزرنے کے بعد ایک کمرا آتا ہے جس میں تین سیکیورٹی گارڈ چوکنا استادہ ہوتے ہیں۔ ان میں سیاہ اور سرخ وردیوں میں ملبوس نوعورتیں بھی ہوتی ہیں۔ اس کمرے میں آنکھوں کو چندھیا دینے والی تیز طرار روشنیاں اور لمبی لمبی مرمریں میزیں بچھی نظر آتی ہیں جن پر شیشے کے بنے سیکڑوں ڈبے رکھے ہوتے ہیں۔

انہی ڈبوں کی تہ میں چمکدار رو پہلی نفیس تراشیدہ ہیرے رکھے ہوتے ہیں۔ ان ہیروں کو ننگی انگلیوں سے نہیں چھوا جاتا بلکہ دستانے پہن کر چمٹی کی مدد سے اٹھایا جاتا ہے۔ دو ہزار چار سو قیراط ہیروں کی قیمت ساڑھے سات لاکھ ڈالر لگتی ہے۔ یہ ہیرے ایمسٹرڈیم' اینٹورپ' نیویارک اور پیرو کے دارالحکومت لیما میں فروخت ہوتے ہیں۔

اس علاقے کی سیاحت کرنے والوں کی نہ صرف جامہ تلاشی لی جاتی ہے بلکہ منہ کھول کر بھی دیکھے جاتے ہیں کہ کہیں وہ زبان کے نیچے یا دانتوں کے خلا میں ہیرے تو نہیں چھپا کر لے جا رہے۔ ایسے کڑے حفاظتی انتظامات نے وہاں ہیروں کی چوری کو قریب قریب ناممکن بنا دیا ہے۔

◆◆◆

[illegible]

جوابات بھیجنے کا پتا: مدیر ماھنامہ اُردو ڈائجسٹ 325 G-III، جوہر ٹاؤن لاہور

ماہ اکتوبر میں دیے گئے قصہ کوئز کے صحیح جوابات

قصہ کوئز1۔ (الف) اگست ۱۹۳۱ء اعظم گڑھ یوپی (ب) نشانِ امتیاز (ملٹری)، ستارہ بسالت (ملٹری)

قصہ کوئز2۔ (الف) ۱۹۳۹ء سیالکوٹ (ب) خطِ کمال

قصہ کوئز3۔ (الف) اگست ۱۹۲۳ء

درست جوابات دینے والوں کے نام

عبدالسلیم انصاری (حیدرآباد)، عبدالنعیم انصاری (حیدرآباد)، ولی حسین (حیدرآباد)، آصف کریم (حیدرآباد)، منیر احمد (حیدرآباد)، محمد احمد (کراچی)، مرزا ہادی بیگ (حیدرآباد)، طٰہٰ یٰسین (حیدرآباد)، نائلہ کوکب (لاہور)، میاں محمد اویس مظہر (لاہور)، محمود منور خان (سرگودھا)، حمزہ شمشاد خان (سرگودھا)، محمد تنزیل عباس جنجوعہ (سرگودھا)، محمد شکیل عباس جنجوعہ (سرگودھا)، علی زیب (قصور)، ندیمہ امتیاز (جہلم)، منظور احمد ہمگیر (نواب شاہ)، حمزہ غلام حسین (حیدرآباد)، اوبین حبیب (فیصل آباد)، محمد یوسف قریشی (حیدرآباد)، شمیم اختر (فیصل آباد)، کمانڈر (ر) محمد سلیمان (اٹک)، ڈاکٹر خالد سیف اللہ خان (لاہور)، محمد یاسین راندوری (حیدرآباد)، مرزا مسرت بیگ (حیدرآباد)، مرزا اسفار بیگ (حیدرآباد)، ثاقب محمود بٹ (راولپنڈی)

قرعہ اندازی میں جیتنے والوں کے نام

- ندیمہ امتیاز (جہلم)
- محمد یاسین راندوری (حیدرآباد)

آپ کو 6 ماہ تک اُردو ڈائجسٹ کے شمارے بطور تحفہ ملیں گے

نوٹ: تمام قارئین اپنا مکمل نام و پتا اور موبائل یا پی ٹی سی ایل نمبر لکھنا ہرگز نہ بھولیں۔ اس کے بغیر کوریئر سروس کا نمائندہ آپ تک نہیں پہنچ پاتا۔ (ایڈیٹر)

قصہ کوئز/۱

دنیائے اسلام کا نامور طبیب، شہرۂ آفاق سائنسدان، جامع العلوم فلسفی، ریاضی دان اور ماہرِ فلکیات، ملقب بہ الشیخ الرئیس، بخارا کے ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ ۶رسال کی عمر میں اُس نے تعلیم حاصل کرنا شروع کی۔ اُس کا باپ اسمٰعیلی فرقے سے تعلق رکھتا تھا۔ اُس نے اپنے بیٹے کو بھی اسی مسلک کی تعلیم کی طرف راغب کرنا چاہا، لیکن ہونہار بروا نے ۱۰ برس میں قرآن، فقہ اور ادب کا مطالعہ کرلیا اور پھر دیگر علوم کی طرف مائل ہوا۔ ابوعبداللہ الناتلی سے اس نے منطق، فلسفہ اور ریاضی کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد خود ہی طب اور طبعیات کا مطالعہ شروع کر دیا۔ اُس نے فلسفہ، منطق، ریاضی اور سائنس کے موضوعات پر بہت سی کتابیں لکھیں۔ علمِ طب میں اُس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جب یہ علم نہیں تھا تو بقراط نے اسے جنم دیا، جب یہ مرگیا تو جالینوس نے حیات نو بخشی، جب یہ بکھر گیا تو الرازی نے سمیٹا لیکن یہ ناقص تھا تو اس عظیم شخص نے اس کی تکمیل کی۔

(الف) اس عظیم شخصیت کا نام بتائیں؟

(ب) علمِ طب کے حوالے سے لکھی گئی اُس کی کسی کتاب کا نام بتائیں؟

قصہ کوئز/۲

وہ ایک امریکن خلاباز پائلٹ اور امریکن یونیورسٹی میں پروفیسر تھا۔ ۵رسال کی عمر میں اُس نے اپنا پہلا ہوائی سفر ۲۰رجولائی ۱۹۳۶ء کو کیا۔ خلاباز بننے سے پہلے وہ امریکن نیوی میں آفیسر تھا اور اس نے کوریا کی جنگ میں ۵رجنوری ۱۹۵۱ء میں حصہ لیا۔ جنگ کے بعد اُس نے پرڈوے یونیورسٹی (Purdue University) سے ۱۹۵۵ء میں ایروناٹیکل انجینئرنگ میں گریجوایشن کی۔ وہ اپنے خاندان کا دوسرا آدمی تھا جو تعلیم حاصل کرنے کے لیے کالج تک پہنچا۔ اُس نے اپنا پہلا خلائی سفر بطور کمانڈ پائلٹ کیا۔ وہ ناسا کا پہلا سول خلاباز تھا۔ ۱۹۷۸ء میں اُسے امریکی صدر رچرڈ نکسن نے صدارتی تمغہ برائے آزادی سے نوازا۔ اُس نے ۸۲رسال کی عمر پائی اور ۲۵راگست ۲۰۱۲ء میں وفات پائی۔

(الف) اس خلاباز کا نام بتائیں؟

(ب) اس نے اپنا پہلا خلائی سفر جس جہاز کے ذریعے کیا اُس کا نام بتائیں؟

قصہ کوئز/۳

۱۸رجولائی ۱۹۱۸ء کو پیدا ہونے والا یہ شخص جنوبی افریقہ کا پہلا جمہوری صدر بنا۔ ۱۹۶۲ء میں اُسے سفید فام اقلیت کے خلاف کام کرنے پر مختلف الزامات کی وجہ سے گرفتار کیا گیا اور عمرقید کی سزا سنائی گئی۔ ان کو نسلی امتیاز کے خلاف جدوجہد کی وجہ سے پوری دنیا میں شہرت حاصل ہوئی۔ ۵راگست ۱۹۶۲ء میں اسے ۱۷رماہ تک مفرور رہنے کے بعد گرفتار کرلیا گیا اور جوہانس برگ قلعہ میں قید کر دیا گیا۔ ۱۱رفروری ۱۹۹۰ء میں ۲۷رسال بعد اُسے رہا کر دیا گیا۔ ۲۵۰ر سے زائد انعامات وصول کیے اور ۱۹۹۳ء میں نوبل انعام بھی حاصل کیا۔ اپنے خاندان کا پہلا شخص تھا جس نے باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے سکول کا رخ کیا۔ اس نے ۳ر شادیاں کیں۔ اس کی اولاد میں ۴رلڑکیاں اور ۲رلڑکے شامل ہیں۔ اسے اپنی اہلیہ کی بے وفائی کا دکھ سہنا پڑا۔ اس نے اپنی مقبولیت کے دنوں میں ملک کی صدارت سے دست بردار ہو کر ایک انوکھی مثال قائم کرکے دنیا بھر میں عزت پائی۔

(الف) ہم کس شخصیت کا ذکر کر رہے ہیں؟

(ب) اس شخصیت کی سیاسی پارٹی کا نام بتائیں؟

◆◆◆

قارئین کے تبصروں، مشوروں اور باتوں سے سجا کالم

جاوید ہاشمی کا انٹرویو

شمارہ اکتوبر میں جاوید ہاشمی صاحب کا انٹرویو پڑھا۔ اس میں انھیں ڈرامائی طور پر جمہوریت کا نجات دہندہ بنا کر پیش کیا گیا۔ مگر انھوں نے جنرل ضیا کے دور میں جمہوریت کا جھنڈا کیوں بلند نہ کیا؟ شاید اس لیے کہ تب وہ وزیر تھے۔ گزارش ہے کہ شاہ محمود قریشی یا اسد عمر سے انٹرویو لیا جائے تاکہ پی ٹی آئی کا نقطۂ نظر بھی سامنے آ سکے۔
(فیصل سعید، لاہور)

☆☆

جناب جاوید ہاشمی کا انٹرویو بہت معلومات افروز تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ انھوں نے وطن عزیز میں جمہوریت کو مستحکم کرنے کی خاطر بہت قربانیاں دی ہیں۔
(انعام الحسن، کراچی)

☆☆

میں جاوید ہاشمی کو اصول پسند شخصیت سمجھتی ہوں۔ میرا خیال ہے، افواہوں اور جھوٹے الزامات کی بنیاد پر پی ٹی آئی چھوڑنا ایک غلطی ہے۔ بیشتر سیاست دانوں کے برعکس ان کے دامن پر کوئی دھبہ نہیں۔ اس لیے انھیں سیاست میں ضرور رہنا چاہیے۔
(عالیہ شیخ، ملتان)

☆☆

انٹرویو میں دوسرے رہنماؤں پر الزامات کی بھرمار ہے۔ جب کہ خود کو پاک صاف رکھنے کی سعی ہوئی۔ ہاشمی صاحب نے جن لوگوں پر الزام دھرے ہیں، انھیں بھی صفائی دینے کا موقع ملنا چاہیے۔
(عمار نذیر، لاہور)

☆☆

شمارہ اکتوبر نظر نواز ہوا۔ چند غلطیوں کی نشان دہی کرنا چاہتا ہوں۔ ''اصل خطرہ'' (کچھ اپنی زبان میں) صفحہ ۱۵ سطر ۱۱ میں درج ہے کہ مفتی نعیم کے فرزند، مسعود بیگ نامعلوم افراد کی گولیوں کا نشانہ بن گئے۔ مگر مرحوم مفتی نعیم کے فرزند نہیں داماد تھے۔
جاوید ہاشمی کے انٹرویو میں صفحہ ۴۸ کی آخری سطر میں

شمارہ اکتوبر میں جناب جاوید ہاشمی کا انٹرویو شائع کرنے کے بعد ہمیں تنقیدی اور ستائشی، دونوں قسم کے خطوط وپیغامات موصول ہوئے۔ پہلی بات یہ ہے کہ ہمارا کسی سیاسی جماعت سے تعلق نہیں اور ہمیشہ ہماری سعی ہوتی ہے کہ ہر معاملے میں غیر جانب دارانہ اور بے لاگ رائے اپنائی جائے۔

جناب جاوید ہاشمی سے اس لیے انٹرویو لیا گیا کہ ان کا واضح نقطۂ نظر قوم کے سامنے آ سکے اور ابہام دور ہوں۔ موجودہ شمارے میں جناب تسنیم نورانی نے اپنے خیالات ونظریات پیش کیے ہیں جو پاکستان تحریک انصاف کی مرکزی کمیٹی کے رکن ہیں۔

اردو ڈائجسٹ نے ہمیشہ کوشش کی ہے کہ ہر مسئلے پر فریقین کا استدلال نمایاں ہو، وطن عزیز میں تنقید برداشت کرنے کا کلچر پروان چڑھے اور لوگ اس قابل ہو جائیں کہ خندہ پیشانی سے اختلاف رائے کو قبول کریں۔ ایک زندہ قوم یہی خصوصیات رکھتی ہے۔

پاکستان میں اعلیٰ سیاسی اقدار یونہی جنم لیں گی اور جمہوریت کا پودا مستحکم ہوگا کہ ایک دوسرے کی بات صبر وتحمل سے سنی اور ملک وقوم کی بہتری نظر میں رکھی جائے۔ اس منزل کا حصول ہی اردو ڈائجسٹ کا مشن ہے۔ (ادارہ)

جسٹس وحید الدین کا ذکر ہے۔ محترم جسٹس وحید الدین کو وفات پائے کافی عرصہ بیت چکا۔ جب وہ بھٹو مرحوم کا کیس سن رہے تھے تب ہی بے ہوش ہو گئے۔ اسی حالت میں اللہ کو پیارے ہوئے۔ ان کے بیٹے جسٹس وجیہہ الدین تحریک انصاف میں ہیں۔ یہ بھی اپنے والد کی طرح چیف جسٹس ہائی کورٹ اور پھر بعد میں سپریم کورٹ کے جج رہے ہیں۔ غلطی سے ان کی جگہ والد کا نام آ گیا۔

میں ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۳ء تک اسلامی جمعیت طلبہ گوجرانوالہ کا ناظم رہا ہوں۔ انہی دنوں ہاشمی صاحب جمعیت میں وارد ہوئے۔ حافظ ادریس لاہور جمعیت کے ناظم تھے۔ صحافت کے محاذ میں ہمارے سرخیل الطاف حسن قریشی صاحب تھے۔ جسارت، زندگی اور اردو ڈائجسٹ کے ذریعے ان کی جدوجہد نمایاں تھی۔ مجیب الرحمان شامی، سجاد میر، مولانا صلاح الدین احمد اور عبدالکریم عابد ان کے ساتھ تھے۔

جب پنجاب یونیورسٹی میں پہلا ساتھیوں ہوا تو گوجرانوالہ سے کچھ جمعیت کے کارکن کرنے کی مدد کرنے لاہور آئے جن میں، میں بھی شامل تھا۔ حافظ ادریس صاحب صدر، حفیظ خان سیکرٹری جنرل، تنویر عباس تابش نائب صدر کے عہدوں کے لیے امیدوار تھے۔ حفیظ خان کا الیکشن نتیجہ کسی مسئلے کی وجہ سے رک گیا۔ حافظ ادریس اور کچھ طالب علم وائس چانسلر علامہ علاؤالدین صدیقی کے گھر گئے۔ وہاں نعرے بازی کے بعد کچھ توڑ پھوڑ ہو گئی اور کارکن حافظ ادریس کے قابو میں نہ آئے۔ تب مارشل لا کے تحت گرفتاریاں ہوئیں۔

اسلامی جمعیت طلبہ نے اپنے طور انکوائری کرائی۔ پھر ڈاکٹر کمال سابق ناظم اعلیٰ، حافظ ادریس اور کچھ دوسرے لوگوں کو جمعیت سے نکال دیا گیا۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ آپ جن طلبہ کو جلوس کی شکل لے کر گئے، انھیں کنٹرول نہیں کر سکے۔ یہ ڈسپلن کی اعلیٰ روایت عمران خان اور طاہر القادری کے لیے مثال ہے۔ حالانکہ حافظ

ادریس صاحب اس وقت پنجاب اسٹوڈنٹس یونین پنجاب یونیورسٹی کے منتخب صدر تھے۔ حافظ صاحب کے مدمقابل جہانگیر بدر تھے جو شکست سے دوچار ہوئے۔ شاہد محمود ندیم نیشنل اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن کے امیدوار تھے، وہ بھی جیت نہ سکے۔

بعدازاں نئے الیکشن ہوئے۔ اس بار حفیظ خان صدر اور جاوید ہاشمی سیکرٹری جنرل کے عہدوں کے لیے امیدوار تھے۔ اس دفعہ بھی مدمقابل جہانگیر بدر تھے، جنھیں پھر شکست ہوئی۔ یہ تفصیل بیان کرنے کا مدعا یہ ہے کہ وہ دوسرے الیکشن تھے پہلے نہیں!

(خواجہ امتیاز احمد، گوجرانوالہ)

☆☆

ملالہ کا نوبل انعام

۱۰ اکتوبر کو سترہ سالہ ملالہ یوسف زئی نے امن کا نوبل انعام پایا۔ تب بہ حیثیت پاکستانی پوری دنیا میں اپنے وطن کا نام روشن ہوتے دیکھ کر قدرتاً خوشی ہوئی۔ ملالہ کو یہ انعام اس لیے ملا کہ وہ خصوصاً لڑکیوں میں تعلیم کا فروغ چاہتی ہے۔ مگر کئی پاکستانیوں نے نوبل انعام ملنے کو مغرب کی سازش قرار دیا۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ملالہ مغربی حکومتوں کی ایجنٹ ہے اور وہ اس کے ذریعے پاکستان میں اپنی تہذیب وتمدن پھیلانا چاہتے ہیں۔

ہمارے دین نے علم وتعلیم، دونوں کو نہایت اہمیت دی ہے۔ ایک واضح ثبوت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ پر جو پہلی آیات نازل فرمائیں وہ علم سے متعلق تھیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ بہت سے پاکستانی ملالہ کے مخالف ہو گئے جو لڑکیوں کو تعلیم یافتہ بنانا چاہتی ہے؟

دراصل یہ پاکستانی ملالہ نہیں اس مغربی تعلیم کے مخالف ہیں جو مغرب عالم اسلام پر ٹھونسنا چاہتا ہے۔ یہ مغربی تعلیم اسلامی نظام تعلیم وعلم سے بالکل مختلف ہے اور یہی اختلاف بنیادی وجہ نزاع بن چکا۔

اسلامی نظام تعلیم کا بنیادی وصف طالب علم کو نیک، باشعور اور تمام اخلاقی خوبیوں سے متصف با اخلاق انسان بنانا ہے۔ جب کہ مغربی نظام تعلیم میں اخلاقیات کا شعبہ تقریباً عنقا ہے۔ بعض اسلامی ممالک مثلاً پاکستان میں دینیات یا اسلامیات کی درسی کتب شامل کر کے یہ کمی دور کی گئی۔ اس مغربی نظام تعلیم کا بنیادی وصف طالب علم کو روزگار حاصل کرنے کے قابل بنانا ہے...... یعنی پڑھ لکھ کر وہ پیسا کمانے کے قابل ہو سکے۔

انگریز کی آمد سے قبل ہندوستان میں اسلامی نظام تعلیم مروج تھا۔ اسی کے زیراثر عام ہندوستانی مسلمانوں میں سادگی، بھائی چارہ، رواداری، رحم دلی وغیرہ جیسی خوبیاں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ لیکن جب انگریز ہندوستان پر قابض ہوئے، تو انھوں نے ملک پر کامل قبضے کی خاطر اپنا نظام تعلیم لاگو کر دیا۔ اس ضمن میں پہلا قدم ۱۸۳۵ء میں "انگلش ایجوکیشن ایکٹ" نافذ کر کے اٹھایا گیا۔ اس قانون کے ذریعے حکومت اور انتظامیہ کی زبان انگریزی بن گئی۔ گویا اب سرکاری ملازمت پانے کے لیے فارسی، عربی یا سنسکرت نہیں انگریزی جاننا ضروری ہو گیا۔

انگریز دراصل اس حقیقت سے واقف تھے کہ اپنا نظام تعلیم ہندوستانیوں پر ٹھونس کر وہ ان کی زبان، تہذیب اور ثقافت تک بدل سکتے ہیں۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا۔ چونکہ سائنس وٹیکنالوجی کی ساری ترقی انگریزی میں ہوئی، لہٰذا وہ آنے والی صدیوں میں اہم ترین زبان بن گئی۔ اسے اپنا کر ہندوستانی مسلمانوں نے بھی ترقی کی مگر اس عمل میں مغربی تہذیب وتمدن کی بہت سی منفی خصوصیات ان کی بودوباش کا حصہ بن گئیں۔

آج پاکستان کے سرکاری زبان انگریزی ہی ہے۔ ۱۹۷۳ء سے اردو کو سرکاری محکموں میں رائج کرنے کی تحریک جاری ہے مگر اسے کامیابی نہیں مل سکی۔ اسی طرح خصوصاً شہروں میں آباد پاکستانی مغربی نظام تعلیم ہی کو مادی ترقی کا زینہ سمجھتے ہیں اور یقیناً ڈاکٹر و انجینئر بن کر زندگی کی تمام آسائشیں پانا آسان ہو جاتا ہے۔

لیکن مغربی نظام تعلیم کا خمیر مادہ پرستی سے اٹھا ہے۔ اسی لیے اسے حاصل کرنے والے عموماً روپے پیسے کی چاہ میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ چناں چہ مادہ پرستی سے وابستہ تمام برائیاں مثلاً لالچ، ہوس، کرپشن، جھوٹ، چھل کپٹ وغیرہ ان کی ذات کا حصہ بن جاتی ہیں۔

علامہ اقبال نے بھی یورپی تعلیم پائی، مگر انھوں نے بعدازاں اپنی شاعری میں مغربی نظام تعلیم فکر کے مادہ پرستانہ رخ کو خاص نشانہ بنایا کیونکہ وہ انسان کو مشین بنا ڈالتا ہے۔ اور اس میں اخلاقیات کی رمق باقی نہیں رہنے دیتا۔ چناں چہ شاعر مشرق کا ارشاد ہے:

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسولؐ ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت رخصت ہوئی تو ملت بھی گئی

گویا پاکستان اور دیگر ممالک میں ۱۰۰ فیصد خالص مغربی نظام تعلیم نہیں چل سکتا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ جدید تعلیم اور اسلامی تعلیمات پر مشتمل ایسا تعلیمی نظام تیار کیا جائے جو روزگار تو فراہم کرے، مگر مادہ پرستی کے اسیر شہری جنم نہ دے۔ یہ شہری تمام اخلاقی خوبیوں سے بھی متصف ہوں تاکہ ایک بہترین انسانی معاشرے کے خالق بن سکیں۔

(ذیشان حسن، ماڈل ٹاؤن لاہور)

بند کی مٹی چرالی گئی

دریائے جہلم ہمارے قریب سے گزرتا ہے۔ حال ہی میں اس سے پانچ لاکھ کیوسک کا سیلابی ریلا گزرتے دیکھا۔ سیلاب کی صورت قدرتی آفت جہاں تباہ کاریاں دکھاتی ہے، وہیں انسان بھی اپنے ہاتھوں اپنی قبر کھودتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہمارے علاقے میں واقع موضع گھوگھیاٹ میں بنے بند کی مٹی لوگوں نے اٹھا لی۔ چناں چہ باقی ماندہ بند سیلابی پانی کا دباؤ برداشت نہ کر سکا اور ٹوٹ گیا۔ سیلاب نے پھر پورے علاقے میں زبردست تباہی مچائی جس کے ذمے دار انسان بھی تھے۔

مزید برآں ہر سال حکومت شجرکاری کا ڈھنڈورا پیٹتی ہے، لیکن سمجھ نہیں آتا کہ درخت کہاں لگائے جاتے ہیں۔ آج تک میانی کے آس پاس کوئی شجرکاری نہیں ہوئی۔

(محمود منور خان ایڈووکیٹ، میانی ضلع سرگودھا)

پاکستانی پانی کی چوری

بھارتی صوبہ پنجاب میں پاک بھارت سرحد کے ساتھ ساتھ ہزارہا ٹیوب ویل نصب ہیں۔ ان کی تنصیب بدمعاشی اور بدنیتی پر مبنی ہے کیونکہ یوں پاک سرزمین کا پانی اندرون خانہ چرایا جا رہا ہے۔

آج بھارتی پنجاب میں دور دور تک لہلاتے کھیت نظر آتے ہیں اور وہ اناج کی پیداوار میں خودکفیل ہے۔ جب کہ پاکستانی صوبہ پنجاب میں ہزارہا ایکڑ زمین بنجر پڑی ہے۔ یہ خرابی دشمن کی مکاری اور اپنوں کی نااہلی کے باعث ہی پیدا ہوئی۔ (فرید و افتخار، اسلام آباد)

وزیراعظم "ماموں" بن گئے

گزشتہ دنوں میں اپنے سسرال میانوالی گیا۔ واپسی پہ پتا چلا کہ شیر شاہ پل بچانے کی خاطر مختلف بند توڑنے کے باعث ملتان، مظفرگڑھ روڈ بند ہو چکا۔ اس لیے سرگودھا، فیصل آباد کی طرف سے آنا پڑا۔ اس دوران سیلاب زدگان مشکل حالات سے گزرتے اور کھانے کے لیے ایک دوسرے پر جھپٹتے دیکھے۔ یہ مناظر انتہائی تکلیف دہ تھے۔ مگر میں یہاں جس واقعہ کا ذکر کرنا چاہ رہا ہوں، بڑا افسوسناک اور دردناک ہے۔

وزیراعظم نواز شریف ایک سیلاب زدہ علاقے کے دورے پر تھے۔ انتظامیہ نے سیلاب زدہ غریب لوگوں کو کھانا کھلانے کے لیے دیگوں وغیرہ کا انتظام کیا۔ انتظار صرف وزیراعظم کی تقریر ختم ہونے اور ان کے جانے کا تھا۔ میاں نواز شریف جیسے ہی مختصر تقریر کے بعد گئے تو بھوک کی شدت میں بیٹھے لوگ اس انتظار میں تھے کہ اب انھیں کھانا ملے گا۔ جب کہ حقیقتاً وہ سبھی دیگیں خالی تھیں۔ انھیں مختلف کپڑوں سے ڈھانپ کر انتظامیہ نے وزیراعظم کو "ماموں" بنا دیا۔

ہمارے سابقہ وزیراعظم بھی اسی بیوروکریسی کے ہاتھوں "ماموں" بنتے رہے۔ دکھ اور تکلیف دہ بات یہ ہے کہ ان بھوکے لوگوں کی امید ٹوٹ گئی جو اس آس پر بیٹھے تھے کہ ابھی انھیں کھانا ملے گا۔ کیا ہماری بیوروکریسی یا بابوکریسی یہ بھول چکی کہ ایک دن قبر میں جانا ہے؟ اس سے زیادہ سخت لفظ اور کیا لکھوں؟

جناب الطاف حسن قریشی نے آسمان صحافت، مجید نظامی کے بارے میں زبردست مضمون لکھا۔ یہ حقیقت ہے کہ جو قومیں اپنے خاموش محسنوں کی قدر نہیں کرتیں اور ان کے افکار و نظریات سے مدد نہیں لیتیں، وہ بالآخر مٹ جاتی ہیں۔ "دورِ جدید کا رمضان" دعوتِ فکر دیتی اچھوتی تحریر تھی۔ (رانا محمد شاہد، بورے والا)

قارئین کے تبصرے

میں اردو ڈائجسٹ کا باقاعدہ قاری ہوں۔ یہ رسالہ ترتیب دینے میں ادارتی ٹیم کی کاوشیں قابل قدر ہیں۔ شمارہ ستمبر میں مجھے کئی تحریریں پسند آئیں جن میں جنرل (ر) احسان الحق کا انٹرویو، پلٹن پانچ کی بغاوت، فرد جرم، موت سے دوبدو مقابلہ قابل ذکر ہیں۔ درخواست ہے کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا انٹرویو بھی شائع کیجیے۔

(انجینئر محمد سعید اقبال بھٹی، راک ویلی گروپ، لاہور)

☆☆

میں اردو ڈائجسٹ کی پرستار ہوں۔ تاہم اس میں خواتین کے موضوعات سے متعلق مزید تحریریں دیجیے۔ بچوں کے صفحات بھی ہو سکے تو دوبارہ دینا شروع کریں۔ کہانیوں کی وجہ سے بچے بھی اردو ڈائجسٹ پڑھ لیتے تھے۔

(ف ہاشمی، میانوالی)

☆☆

اردو ڈائجسٹ کی تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ شمارہ اگست میں سائرہ صلاح الدین کی تحریر "دیرینہ دوست کے نام خط" ایک چشم کشا تحریر تھی۔ بشرطیکہ ہمارے چشم سب کچھ گنوانے سے پہلے کھل جائیں، اردو ڈائجسٹ میں اردو سندھی اور غیر ملکی ادب سے انتخاب شائع کیا جائے۔

(بختاور بلوچ، لسبیلہ، بلوچستان)

◆◆◆

ایک مقابلہ صرف نوجوانوں کے لیے

بوجھیں تو جانیں

مرتب: غلام سجاد

(جواب لکھنے سے پہلے دیکھ لیجیے کہ آپ کی عمر نوجوانوں والی ہی ہے نا!)

ماہ اکتوبر میں دیے گئے اسلامی کوئز کے درست جوابات

اسلامی کوئز 1۔ (الف) قصد کرنا، ارادہ کر کے کہیں جانا — (ب) 9 ذوالحج کو

اسلامی کوئز 2۔ (الف) منیٰ کے مقام پر 10 ذوالحج کو — (ب) تین دن

قرعہ اندازی میں جیتنے والوں کے نام

1۔ طٰہٰ یسین (حیدرآباد) 2۔ فاطمہ تحریم (کراچی) 3۔ احسن کمال (واہ کینٹ) 4۔ حمزہ شہباز خان (سرگودھا)

درست جوابات دینے والوں کے نام

ولی حسین (حیدرآباد)، منیر احمد (حیدرآباد)، طٰہٰ یسین (حیدرآباد)، مرزا ہادی بیگ (حیدرآباد)، آصف کریم (حیدرآباد)، فاطمہ تحریم (کراچی)، ماہ رخ (حیدرآباد)، اقبال سلیم (حیدرآباد)، محسن حبیب (فیصل آباد)، حمزہ شہباز خان (سرگودھا)، محمد تنزیل عباس جنجوعہ (سرگودھا)، محمد تقبل عباس جنجوعہ (سرگودھا)، ہشام صابر (ہری پور)، ثاقب محمود بٹ (راولپنڈی)، اشتیاق احمد (لاکنڈ)، احتشام الرحمٰن (ہری پور)، مرزا اسفار بیگ (حیدرآباد)، اظفر اقدس (واہ کینٹ)، احسن کمال (واہ کینٹ)

اسلامی کوئز 1

حضرت بلالؓ ابن رباح کے مالک کو جب پتا چلا کہ حضرت بلالؓ مسلمان ہو گیا ہے تو اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اسے سزا دے کر اپنی بزدلی کا مظاہرہ کرے گا۔ اس نے کھجور کے ریشوں سے ایک پھندا بنوایا اور اس میں حضرت بلالؓ کی گردن پھنسا کر اسے ان لڑکوں کے ہاتھ میں تھما دیا جو رحم و ہمدردی کے نام تک سے ناآشنا تھے۔

(الف) حضرت بلالؓ کو رہا کس نے کرایا؟ (ب) حضرت بلالؓ کے مالک کا نام بتائیں؟

اسلامی کوئز 2

حضرت سمیہؓ اسلام کی پہلی خاتون تھیں جنھوں نے جام شہادت نوش فرمایا تھا۔ گو یہ ثابت قدمی اور ایسا صبر و استقلال تمام اسلام لانے والوں میں نہیں دیکھا گیا تھا۔ چند مومنین ایسے بھی تھے جنھیں ظلم و تشدد کا نشانہ اس حد تک بنایا گیا تھا کہ وہ کمزور پڑ گئے ثابت قدم نہ رہ سکے اور آزار کر دینے کی یقین دہانی پر ان کے منہ سے کفر والحاد کے الفاظ رواں ہو گئے تھے۔

(الف) حضرت سمیہؓ کو شہید کس نے کیا؟ (ب) عورتوں میں سب سے پہلے ایمان کون لائیں؟